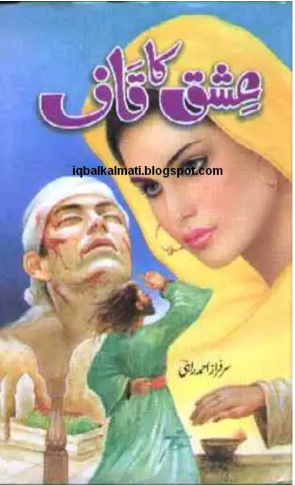

عشق کا قاف

سرفراز احمد راہی

مصورِ ازل نے جس تصورِ اوّل کو

آدم کے خمیر میں اپنی سنت کے طور پر ودیعت کیا

اسی جذبہ وصل کا قصہ فرقت ہے:

عشق کا قاف

سرفراز احمد راہی

انتساب

ان کے نام
جن پر
”ع ش ق“ اترا
اور وہ اس کی تلاوت کا قرینہ جان گئے

عشق کا ع، ش اور ق

عشق ۔۔۔

جو سب سے پہلے رب واحد سے سرزد ہوا۔

اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور اپنے آپ پر عاشق ہو گیا۔ اپنے نور سے زیادہ اسے کوئی شے حسین کیسے لگ سکتی تھی۔ تب اس نے کہا:

اللہ جمیل و یحب الجمال

"اللہ حسین ہے اور (اپنے) حسن سے محبت کرتا ہے۔"

اس کا نور جب سراپا میں ظاہر ہوا تو اس نے اسے تمام کائناتوں کے سب سے حسین اور کامل ترین بشر کا لبادہ پہنایا۔ پھر اپنے بندوں کو حکم دیا کہ "جو مجھ تک آنا چاہے، میرے حبیبؐ سے عشق کے وسیلے سے آئے۔"

یہ عشق مجازی کے حکم کی ابتدا تھی، جس کے بغیر عشق حقیقی کا دامن ہاتھ آتا ہی نہیں۔

عشق ۔۔۔

عین۔ شین اور قاف کا مرقع۔

ازل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ جذبہ جب جب اپنے رخ سے حجاب سرکاتا ہے، انہونیاں جنم لیتی ہیں۔ مثالیں تخلیق ہوتی ہیں۔ داستانیں بنتی ہیں۔ "عشق" کی اس زیر نظر کہانی میں بھی اس کے یہ تینوں حروف دمک رہے ہیں۔

یاد رکھئے۔ اگر محبوب کی خوشنودی اور رضا لازم نہ ہوتی تو عاشق اول کبھی نہ فرماتا کہ:

"اے حبیب ﷺ۔ اگر ہم آپ کی رونمائی نہ چاہتے تو کچھ بھی تخلیق نہ کرتے۔"

اس لئے اس بات کو اپنے جذبوں کے پلو سے باندھ رکھئے کہ محبوبِ اول ﷺ کو راضی کئے بغیر محبتِ اول و آخر تک پہنچ پانا دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنے محبوب کے حسن میں اس نور کی رمق کی

تلاش جاری رکھئے جو آپ کو نورِ حق کی دمک سے ملوا دے۔ جس دن یہ رمق آپ کی نگاہوں کو خیرہ کر دے گی' اسی دن آپ کا عشق مجازی آپ کا ہاتھ عشق حقیقی کے ہاتھ میں دے دے گا۔ اور تب۔۔۔ آپ پر عشق کے پرت کھلنا شروع ہوں گے۔ حجاب سرکائے جائیں گے۔ تجلیاں رخ سے پردے ہٹائیں گی۔ آنکھیں بینا ہو جائیں گی۔ دل بصیرت آشنا ہو جائے گا۔۔۔ لیکن کیا کائنات کا سب سے بڑا راز آپ پر یونہی آشکارا ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ اس کے لئے آپ کو عشق کے عین' شین اور قاف کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ لوگ آپ کو دیوانہ کہیں۔ آپ کو پتھر ماریں۔ آپ کو کانٹوں پر گھسیٹیں۔ آپ کی کھال کھینچ لیں۔۔۔ مگر آپ کے لبوں پر شکایت کا حرف نہ آئے۔ دل میں ملال کا گزر نہ ہو۔ خیال میں پچھتاوے کی پرچھائیں نہ ابھرے۔ بس ہو تو صرف یہ ہو کہ ہونٹوں پر محبوب کا نام سجا رہے۔ پھر عین شین اور قاف کی راہیں آسان ہو جائیں گی۔ تب ان ازلی و ابدی راہوں کے اختتام پر عشق' اپنے تینوں حرفوں کی مالا آپ کے گلے میں پہنانے کے لئے آپ کو منتظر ملے گا۔

میں یہ باتیں یونہی نہیں کر رہا۔ "عشق کا قاف" میں آپ کو عشق کے عین' شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے میں نے اپنی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگویا ہے۔ اپنے احساس کے جس الاؤ میں پل پل جلا ہوں' ان انگارہ لمحوں اور شبنم گھڑیوں کی داستان لکھنے کے لئے خون جگر میں موئے بیان کیسے ڈبویا جاتا ہے' اس کا ادراک مجھے ہو چکا ہے' آپ بھی اس سے واقف ہو جایئے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ پر بھی عشق کا کوئی ایک حرف ضرور نازل ہو جائے۔ آپ بھی مبتلاؤں میں سے ہو جائیں۔ بس پگلا بننے کی کوشش کیجئے گا۔ سیانا نہ بنئے گا۔ محبوب نہ بنئے' محبّ ہو جایئے۔ اسی میں سب نہاں ہے۔ اسی میں سب عیاں ہے۔ (آمین)

کشتۂ عشق:

سرفراز احمد راہی

0333-4304938

لاہور

موسم طوفان باد و باراں کے اشاروں پر رقص کر رہا تھا۔

سپیڈ کم ہوئی اور کار رک گئی۔ اس نے ہارن دبایا۔ تیسری آواز پر گیٹ کھل گیا۔

بادل ایک بار پھر بڑے زور سے گرجے۔ بارش میں اور شدت آ گئی۔ کار آگے کو سرکی مگر اس سے پہلے کہ کار گیٹ سے اندر داخل ہوتی‘ بجلی زور سے چمکی۔ فانوس سے روشن ہو گئے۔

وہ چونک اٹھا۔

اس کی تیز نظریں گیٹ کے باہر بائیں ہاتھ بنے چھوٹے سے سائبان تلے چھائے اندھیرے میں جم گئیں۔

”کیا بات اے صاب!“ پٹھان چوکیدار نے بارش میں بھیگتے ہوئے پوچھا۔

”خان۔۔۔“ لیکن اس سے پہلے کہ وہ فقرہ پورا کرتا برق پھر کوندی۔ وہ تیزی سے کار کا دروازہ کھول کر باہر کو لپکا۔ اس دوران خان بھی گیٹ سے باہر نکل آیا۔

بارش اور تیز ہوا کی پرواہ کئے بغیر دو تین لمبے لمبے ڈگ بھر کر وہ اس اندھیرے کونے میں پہنچ گیا جہاں دو بار برق نے اجالا کیا تھا۔

ایک سایہ تھا جو بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے جلدی سے پوچھا اور ایک بار پھر اس کی نظریں چندھیا گئیں۔

”میں۔۔۔“ ایک کمزور سی نسوانی آواز ابھری۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اجنبی وجود زمین پر آ رہتا‘ اس کے مضبوط اور گرم بازوؤں نے اسے سنبھال لیا۔

”خان۔“ اس نے پلٹ کر پکارا۔

”جی صاب۔“ قریب ہی سے آواز ابھری۔

”میں کمرے میں جا رہا ہوں۔ گاڑی گیراج میں بند کر کے وہیں چلے آؤ۔ جلدی۔“

”جی صاب۔“ وہ تعمیل حکم کے لئے جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے اس نازک، برف سے زیادہ سرد اور لہروں سے زیادہ نرم وجود کو باہوں میں بھر لیا‘ جو اب لکڑی کی

مانند کھردرا اور پتھر کی مانند سخت ہوا جا رہا تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا وہ پورچ پار کر کے برآمدے میں پہنچا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور مختصر سی راہداری کو طے کر کے ہال میں چلا آیا۔ ایک لمحے کو کچھ سوچا، پھر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

ایک کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے پھر دائیں پاؤں سے کام لیا۔ اندر داخل ہوا اور بستر کی طرف بڑھ گیا۔

دھیرے سے اس نے اپنے بازوؤں میں بھرے اس ریشمیں خزانے کو احتیاط سے سمیٹ کر بیڈ پر رکھ دیا، پھر اسے گرم لحاف میں چھپا دیا۔ شاید اس لئے کہ کوئی اور دیکھ نہ لے۔ ایک لمحے کو اس کی نظریں اس سمٹے پڑے خزانے کے تربتر چہرے پر جم گئیں، جہاں سیاہ لانبی زلفیں کسی بادلوں میں چھپے چاند یا گھٹاؤں میں قید برق کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ اسی وقت خان اندر داخل ہوا۔

’’اوہ خان۔‘‘ اس نے جلدی سے کہا۔ کچھ سوچا پھر تیزی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

ڈاکٹر کو فون کر کے وہ حکم کے منتظر اور چور نظروں سے اس خوابیدہ حسن کو تکتے خان کی طرف متوجہ ہوا اور ہولے سے مسکرایا۔

’’خان۔‘‘

’’جی صاب۔‘‘ وہ گھبرا سا گیا۔

’’تمام نوکر تو سو چکے ہوں گے۔‘‘

’’جی صاب۔‘‘ اس نے اپنا مخصوص جواب دہرایا۔

’’ہوں۔‘‘ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر کہا۔ ’’تم نیچے چلے جاؤ۔ اپنے ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ ان کو لے کر اوپر چلے آنا۔‘‘

’’جی صاب!‘‘ اور خان ایک نظر بستر پر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ پر ایک بٹن دبا دیا۔ ایر کنڈیشنڈ سسٹم گہری نیند سے جاگ گیا۔ پھر اس کی نادیدہ تپش نے دھیرے دھیرے کمرے کو گرم کرنا شروع کیا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا کر بند کھڑکیوں کی جانب دیکھا اور کرسی گھسیٹ کر بستر کے قریب لے آیا۔ بیٹھتے ہوئے وہ قدرے جھک گیا اور نظریں اس خاموش گلاب پر جما دیں جس کی دو پنکھڑیاں اپنی سرخی کھونے لگی تھیں۔ نیلاہٹ ابھری چلی آ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے لرزی تو بے چینی سے وہ کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر رہ گیا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

اس کی بے تاب نظریں اس غنچہ دہن پر جم گئیں، جس میں اب پھر کوئی حرکت نہیں تھی۔ آہستہ سے اٹھا۔ جھکا

اور لحاف کو اچھی طرح اس پر لپیٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اب وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اسی وقت ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا آ رہا ہو۔

’’آیئے آیئے انکل۔‘‘ وہ کمرے میں داخل ہوتے ادھیڑ عمر مگر مضبوط جسم کے مالک ڈاکٹر ہاشمی کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے رین کوٹ اتار کر اس سے مصافحہ کیا۔

’’کیا بات تھی بیٹے۔ میں تو تمہارا فون سنتے ہی۔۔۔‘‘ اور ان کی آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ حیرت زدہ نظریں بستر پر پڑی جوان اور نیلی پڑتی لڑکی کے وجود پر ٹھہر گئیں۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ چند لمحوں بعد ان کا تجربہ کار ہاتھ لڑکی کے ماتھے سے ہٹا تو وہ کچھ مضطرب سے نظر آ رہے تھے۔

’’خان۔۔۔ میرا بیگ۔‘‘ وہ بولے اور خان کے ساتھ ہی وہ بھی ان کے قریب چلا آیا۔

بیگ کھلا اور ڈاکٹر اپنے فرض میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ خاموشی سے ڈاکٹر ہاشمی کی کوششوں کا جائزہ لیتا رہا۔ کتنی ہی دیر گذر گئی اور تب ڈاکٹر ہاشمی ایک طویل سانس لے کر بستر کی پٹی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’انکل!‘‘ وہ مضطربانہ انداز میں اتنا ہی کہہ سکا۔

’’الحمدللہ۔ خطرہ ٹل چکا ہے۔‘‘ وہ آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ’’خان۔ کچن سے دودھ لے آؤ۔‘‘ انہوں نے کہا اور خان کمرے سے نکل گیا۔ ’’ہاں۔ اب کہو۔ یہ سب کیا چکر ہے؟‘‘ ڈاکٹر ہاشمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’چکر۔۔۔؟‘‘ وہ جھینپ گیا۔ ’’چکر تو کوئی نہیں ہے انکل! میں پکچر دیکھ کر لوٹا تو یہ باہر گیٹ کے پاس کھڑی نظر آئی۔ میں کار سے نکل کر اس کے قریب پہنچا مگر کچھ پوچھنے اور بتانے کی نوبت ہی نہ آئی اور یہ بے ہوش ہو گئی۔ میں اسے اٹھا کر اندر لے آیا اور آپ کو فون کر دیا۔ بس یہ ہے ساری بات۔‘‘

’’ہوں۔ ڈاکٹر ہاشمی کے ہونٹ شرارت سے پھڑکے۔ ’’بیٹے۔ لڑکی تھی ناں۔ اگر صنف کرخت ہوتی تو۔۔۔‘‘

’’آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں انکل۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا اور ڈاکٹر ہاشمی ہنس دیے۔

’’میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ہاں۔۔۔ بیگم صاحبہ زمینوں سے نہیں لوٹیں ابھی؟‘‘

’’جی نہیں۔ ابھی کافی دن رکیں گی وہاں۔‘‘

اسی وقت خان دودھ کا بھرا جگ اور گلاس لئے اندر داخل ہوا۔ ’’صاب۔ دودھ بہوت تا۔ ہم گرم کر لائی۔‘‘ وہ جگ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

’’یہ تو بہت اچھا کیا خان۔‘‘ وہ دودھ گلاس میں انڈیلتا ہوا بولا۔

دودھ پی کر فارغ ہو گئے تو ڈاکٹر ہاشمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ’’اچھا بیٹے۔ میں چلتا ہوں۔ بارش کا زور کم ہو رہا

ہے۔ کہیں پھر زور نہ پکڑ لے۔‘‘

’’بہتر انکل۔‘‘ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ خان نے ڈاکٹر کا بیگ تھام لیا۔

’’صبح دس بجے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ پریشان نہ ہونا۔‘‘ وہ پھر مسکرا دیے اور وہ جھینپ کر ان کی ہدایات کو ذہن نشین کرنے لگا۔ ’’نیند کے انجکشن کا اثر کم از کم نو گھنٹے رہے گا۔ کیپسول تپائی پر پڑے ہیں۔ ہوش آنے پر ہر چار گھنٹے بعد گرم دودھ سے دو کیپسول دیتے رہنا۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی رخصت ہو گئے۔

کمرہ خاصا گرم ہو چکا تھا۔ نیلے ہونٹ اب کچھ کچھ گلابی نظر آ رہے تھے۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بستر کے قریب چلا آیا۔ سانس اب مناسب رفتار سے چل رہا تھا۔ چہرہ پُرسکون تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اس محو استراحت حسنِ بے پرواہ کو تکتا رہا۔

’’صاب۔‘‘ خان کی آواز اسے بچھو کے ڈنک ہی کی طرح لگی۔

وہ تیزی سے پلٹا۔ ’’تم ابھی تک یہیں ہو۔‘‘ اس کے لہجے میں کچھ اکتاہٹ تھی مگر خان بھی مجبور تھا۔ اسے نیند نے تنگ کر رکھا تھا۔ وہ بلاوجہ اس کی محویت کو ختم کرنے کا قصوروار نہ ہوا تھا۔

’’کوئی حکم صاب؟‘‘ وہ ڈر سا گیا۔

’’کچھ نہیں۔ بس جاؤ۔ اور دیکھو۔ اس کمرے میں کوئی مت آئے۔ میں ساتھ والے کمرے میں آرام کروں گا۔‘‘

’’جی صاب۔‘‘ وہ سلام کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحے وہ بستر پر پڑے مصور کے اس حسین خیال کو گل پاش نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر پلٹ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆

بے پناہ دولت۔ لمبی چوڑی جائیداد۔ بے اندازہ زمینیں۔ دو کوٹھیاں۔ ایک حویلی۔ کئی کاریں اور بے تحاشا عزت ان دو ماں بیٹے میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

دونوں ہی کی تمنا تھی کہ کوئی تیسرا بھی ان کی ملکیت کا حصہ دار بنے۔ جو ان تین میں چند اور نفوس کا اضافہ کر سکے! مگر۔۔۔ امارت کی نظروں میں کوئی وجود جچ نہ رہا تھا۔ بوڑھی تجربہ کار نگاہیں صورت کے ساتھ سیرت اور خاندان کے ساتھ دولت و ثروت بھی چاہتی تھیں۔

ایک تصویر میں ضروری نہیں کہ مصور ہر ایک کے جذبات کی عکاسی کر سکے اور ہر کسی کے پسندیدہ رنگ

بھر دے۔ اسے اپنی تصویر کو بہر صورت خوبصورتی اور حسن سے مرصع کرنا ہوتا ہے۔ اب اس کے لئے چاہے اسے کسی بھی قسم کے رنگ منتخب کرنا پڑیں۔

اور جوانی تھی کہ کسی اور ہی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ اسے دولت نہیں چاہیے تھی کہ اس کے پاس بہت تھی۔

اسے خاندان نہیں چاہیے تھا۔ کہ ذات پات اس کی نظر میں بے اہمیت شے تھی۔

اسے صرف اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمان تصویر کی تلاش تھی۔ وہ خواہ اسے آرٹ گیلری کے وسیع و عریض سجے سجائے قیمتی اور حسین ہال میں نظر آ جاتی' یا کسی فاقہ زدہ مصور کے ادھورے رنگوں سے بوسیدہ کاغذ پر ابھرتی نظر آ جاتی۔

اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ چاہئے تھا تو صرف یہ کہ جو بھی آئے وہ صرف اسے چاہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک سے بیگانہ ہو۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ کسی کا خیال اپنے خانہ دل میں نہ سجا پایا ہو۔

بڑھاپا تجربہ کار تھا۔ اپنے اصولوں کا محافظ تھا۔

جوانی امنگوں بھری تھی۔ حسن اور محبت کی طلبگار تھی۔

اور آج۔۔۔ شاید اسے منزل مل گئی تھی۔ دل تو یہی کہہ رہا تھا۔ اور دل جھوٹ بھی تو بولا کرتا ہے۔

’’صاب! آپ کا پون۔۔۔‘‘

وہ چونک پڑا۔ خیالات بکھر گئے۔ بستر سے نکلا اور گاؤن پہنتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔

’’خان۔‘‘ وہ رک گیا۔

’’جی صاب۔‘‘

’’دیکھو۔ بابا سیف آ چکا ہوگا۔ اسے اوپر بھیجو۔‘‘

’’جی صاب۔‘‘ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا ٹیلی فون کے پاس چلا آیا۔

’’یس۔ طاہر اسپیکنگ۔‘‘ وہ ریسیور کان سے لگا کر بولا۔

’’ہیلو طاہر۔‘‘ دوسری طرف سے ڈاکٹر ہاشمی نے ہنس کر کہا۔

’’اوہ آپ۔۔۔ آپ کا مریض ابھی تک ’’ہوش ندارد‘‘ ہے انکل۔‘‘ وہ مسکرایا۔

’’مسیحا پاس رہے تو بیمار کا اچھا ہونے کو جی کب چاہتا ہے طاہر میاں!‘‘ وہ ڈاکٹر ہاشمی کی چوٹ پر خجل سا ہو گیا۔ رات بھی ان کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی نظروں کا بھید جان چکے ہیں۔ ’’بہر حال' اس وقت تو

بجے ہیں۔ دس بجے تک ہوش نہ آیا تو مجھے فون کر دینا۔ ویسے میں گیارہ بجے کے قریب خود ہی چلا آؤں گا۔‘‘

’’بس تو ٹھیک ہے۔ آپ آ ہی جایئے گا۔‘‘

’’خدا حافظ۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔ فون بند کر کے وہ پلٹا اور بستر کے قریب پڑی کرسی پر جم گیا۔

’’سلام صاحب۔‘‘ سیف کمرے میں داخل ہوا اور اس کی نظروں میں بھی حیرت سی امنڈ آئی۔

’’سیف بابا۔ یہ ہماری مہمان ہیں اور بیمار بھی۔‘‘ اس نے سیف کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ’’ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہلکے ناشتے کے تمام ضروری لوازمات یہاں ہونے چاہئیں!‘‘

’’بہتر صاحب!‘‘ وہ سوالیہ نظروں کے ساتھ بستر پر سوئی لڑکی کو دیکھتا ہوا پلٹا اور برتن اٹھائے باہر نکل گیا۔

وہ ایک طویل انگڑائی لے کر کرسی سے اٹھا اور کھڑکیوں پر سے صرف پردے ہٹا دیئے پٹ نہ کھولے۔ ہوا سرد تھی۔ رات کی بارش کے بعد موسم کھل گیا تھا۔

سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ اس کی زرد کرنیں دھند اور ٹھنڈک کا سینہ چیر کر ہر مقابل شے کو روشن اور گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے دور نیلے آسمان کی لامحدود وسعتوں میں نجانے کیا تلاش کرتا رہا۔

’’امی۔۔۔ امی۔۔۔ آپ کہاں ہیں امی۔۔۔ امی۔۔۔‘‘ دھیمی سی بڑبڑاہٹ نے اسے چونکا دیا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر بستر کے قریب چلا آیا۔ نرم و نازک وجود متحرک تھا۔ لانبی سیاہ پلکیں دھیرے دھیرے کانپ رہی تھیں۔ چہرے پر سرخی دوڑنے لگی تھی۔ ہونٹوں کے گوشے لرز رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہولے سے اپنی پلکوں کی چلمن اٹھا دی۔

وہ بے چینی سے اس کی ایک ایک حرکت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ بے حس و حرکت چت پڑی چھت کو گھورتی رہی۔ پھر جیسے چونک اٹھی۔ گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔۔۔ اور اسے سامنے دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔

’’آپ۔۔۔ آپ کون ہیں؟ میں کہاں ہوں؟‘‘ روانی سے الفاظ اس کے لبوں سے ابل پڑے۔

’’گھبرایئے نہیں۔ لیٹی رہیے۔‘‘ وہ مسکرا کر اس پر جھک آیا۔ شانوں سے تھام کر اس نے پھر اسے لٹا دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر اٹھ بیٹھی۔

’’میں۔۔۔‘‘

’’دیکھئے۔ آپ کو میں بدمعاش نظر آتا ہوں یا آپ کو خود پر اعتماد نہیں ہے؟‘‘ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر

بولا تو وہ گڑبڑا گئی۔ بیباک مگر شریفانہ تاثر کی حامل نگاہوں نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔

’’میں جانا چاہتی۔۔۔‘‘

’’آں ہاں۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟‘‘ وہ اسے بستر سے اترتا دیکھ کر تیزی سے بولا۔

’’جی میرا۔۔۔‘‘

’’ارے بابا‘ کیوں اپنا دماغ تھکا رہی ہیں آپ۔ اطمینان سے لیٹ جائیے۔ کچھ مجھ سے پوچھیے۔ کچھ مجھے بتائیے۔‘‘ وہ ریشمی لحاف اس پر اوڑھاتا ہوا بولا۔ اور نہ جانے کیا سوچ کر اور کیوں وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ پھر اس کی سوالیہ نظریں کمرے کے درو دیوار کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس کے مسکراتے چہرے پر آ کر جم گئیں۔

’’ویسے ایک بات تو بتائیے؟‘‘ وہ بے تکلفی سے کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہو بیٹھا۔

’’جی۔‘‘ وہ ہولے سے بولی اور نظریں چرا لیں۔

’’کیا آپ کو بارش میں بھیگنے کا بہت شوق ہے؟‘‘

’’جی۔۔۔ کیا مطلب؟‘‘ وہ بے ساختہ حیرانی سے بولی۔

’’مطلب یہ کہ کل رات آپ بڑی بے تکلفی سے طوفان باد و باراں کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ سردی بھی بلا کی تھی اور۔۔۔‘‘

ایک دم نہ جانے کیوں وہ بے چین سی ہو کر پھر اٹھ بیٹھی۔

’’ارے ارے۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ دیکھئے‘ میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ اور آپ۔۔۔‘‘ وہ اس کی پلکوں کو نم ہوتا دیکھ کر بری طرح سے گڑبڑا گیا۔

’’مجھے جانے دیجئے۔ خدا کے لئے۔‘‘ وہ بستر سے نکل پڑی۔

’’ارے۔ یہ آپ کو بار بار جانے کا دورہ کیوں پڑ جاتا ہے؟‘‘ وہ اٹھ کر اس کو بازو سے تھامتا ہوا بولا۔

’’چھوڑیے۔ میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔‘‘ وہ بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

’’مگر آپ کہاں جانا چاہتی ہیں؟ یہ تو طے ہے کہ آپ کا گھر کوئی نہیں ہے۔ ویسے اگر آپ دارالامان جانا چاہتی ہیں تو بندہ حاضر ہے لیکن پہلے ناشتہ تو کر لیجئے۔‘‘

’’آپ کو کیسے معلوم کہ۔۔۔‘‘

’’جن کا کوئی گھر ہو وہ ایسی طوفانی راتوں میں اس حالت میں تو باہر آنے سے رہے‘ جس حالت میں آپ پائی گئیں۔‘‘

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

طاہر سنجیدہ ہو گیا۔ مذاق اور ایک اجنبی لڑکی سے جو اس کے نام تک سے ناواقف تھی، کافی ہو چکا تھا! وہ کتنی ہی دیر تک روتی رہی۔ سیف ناشتہ میز پر رکھ کر جا چکا تھا۔ وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

’’دیکھئے۔ خدارا اب یہ رونا دھونا بند کیجئے اور ناشتہ کر لیجئے۔‘‘ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کیں اور اس کی جانب دیکھا۔ ’’آیئے۔ باتھ روم اس طرف ہے۔‘‘ اس نے کمرے کے غربی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے باتھ روم کی جانب چل دی۔ کچھ دیر بعد جب وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ اتنی ہی نکھر آئی تھی وہ سوگواری میں نتھر کر۔

’’چلئے۔ ناشتہ کیجئے۔‘‘ اس نے طاہر کی جانب دیکھا اور سر جھکا کر بستر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

’’ویسے ڈاکٹر صاحب نے بستر سے نکلنے سے منع کیا ہے۔ آپ نمونئے کے اٹیک سے بال بال بچی ہیں۔‘‘ وہ ہولے سے بولا۔

وہ اس کی جانب دیکھ کر کوئی بحث کئے بغیر خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ بستر میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھا چائے کی پیالی سے دل بہلا رہا تھا۔ اس نے بہت کم ناشتہ کیا۔ طاہر نے زیادہ پر اصرار نہیں کیا۔ سیف بابا برتن لے گیا۔ وہ پھر کسی سوچ میں کھو گئی۔ کتنی ہی دیر تک وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر ہولے سے کھنکارا تو وہ چونکی۔ نگاہیں ملیں۔ وہ مسکرا دیا۔

’’ہاں تو صاحب! مگر یہ صاحب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟‘‘ وہ بے تکلفی سے پوچھ بیٹھا۔

’’زاہدہ۔‘‘ وہ بے ساختہ دھیرے سے کہہ گئی۔

’’مس زاہدہ؟‘‘ اس نے الٹا سا سوال کر دیا مگر تیزی سے!

’’جی۔۔۔ جی ہاں۔‘‘ وہ کہتے کہتے رکی اور شرما گئی۔

’’تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مالک۔‘‘ وہ سمجھ میں نہ آنے والے لہجے میں آہستہ سے بڑبڑایا۔ ’’اچھا۔ اب یہ بتایئے کہ آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ رات آپ اس حال میں کیوں تھیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا۔ جی۔ ویسے میرا نام طاہر ہے۔‘‘

اور وہ اس باتونی، لاابالی اور بے تکلف سے انسان کو بڑی گہری اور عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

’’کیا دیکھ رہی ہیں؟‘‘ اس نے کچھ دیر بعد یکایک کہا۔

’’جی۔ کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔‘‘ وہ گھبرا گئی۔

''تو پھر کہیے ناں۔''

''کیا کہوں؟'' وہ اداس سی ہو گئی۔

''پہلے تو یہ بتایئے۔۔۔'' وہ معاملے کی نزاکت کے پیش نظر بات بدل گیا۔ ''آپ کا کوئی۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے میرا۔'' اس نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہہ کر آنکھیں بھینچ لیں۔

''اوہ۔۔۔ مگر۔ صبح آپ نیم بیہوشی میں اپنی امی کو۔۔۔''

''مرنے والے پکارنے سے لوٹ تو نہیں آیا کرتے۔'' وہ سسک پڑی۔

''معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو دکھ دیا۔'' وہ افسردہ سا ہو گیا۔

وہ کتنی ہی دیر دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔ طاہر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا اس کے دل کا غبار پوری طرح نکل جائے۔

''تو اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟'' وہ کچھ دیر بعد سنبھلی تو اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''ارادہ؟'' وہ طنز سے مسکرائی۔

''میرا مطلب ہے آپ جہاں رہتی تھیں۔ وہیں واپس جانا چاہیں تو۔۔۔''

''جی نہیں۔ وہاں تو اب میرے لئے صرف اور صرف نفرت باقی ہے۔ انہی کے احسان نے تو مجھے اس طوفانی رات کے حوالے کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''آپ ضرور سننا چاہتے ہیں۔'' اس نے درد بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ مناسب سمجھیں تو۔۔۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات بھی نہیں ہے دنیا میں کہ میں اسے دل پر بوجھ بنائے لئے پھروں۔۔۔ مگر مجھے کریدیئے گا نہیں۔''

پھر ایک لرزتی کانپتی درد بھری آواز کے زیر و بم نے اسے جکڑ سا لیا۔ وہ کہتی رہی۔ طاہر سنتا رہا۔ بت بنا۔ ہمہ تن گوش۔

''ابو بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ غربت کا دائرہ کچھ اور تنگ ہو گیا۔ میں اور امی چچا کے در پر فقیروں کی طرح پڑے رہے۔ ان کے گھر کے کام کاج' خدمت' دن رات کی گالیوں' مار پیٹ اور جھڑکیوں کے عوض بچا کھچا کھانا پیٹ کی

آگ بجھانے کو مل جاتا۔ امی پر سجدہ شکر ادا کرتے۔ امی نے ہر مصیبت اور تنگدستی کا مقابلہ کر کے کسی نہ کسی طرح مجھے ایف اے پاس کرا دیا۔ چچا کا لڑکا اختر ہمیشہ پڑھائی میں میری مدد کرتا۔ ماں باپ کی سخت مخالفت کے باوجود میری اور امی کی ہر طرح مدد کرتا۔ امی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے چچا اور چچی نے مجھے کمپیوٹر کورس کی اجازت دے دی۔ امی کے دکھوں کو سکھ میں بدلنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ میں کہیں نوکری کر لیتی۔ یہی سوچ کر میں نے یہ کورس کرنے کا عزم کر لیا۔ چچا کی اولاد میں اختر سے اوپر ایک لڑکی نرگس تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن چلی گئی اور ابھی تک وہیں ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ جوانی بڑھاپے میں ڈھل گئی۔ امی کی جگہ بھی اب مجھی کو تمام گھر کا بوجھ سنبھالنا پڑا۔ میں نے کوئی گلہ شکوہ کیے بغیر یہ کڑوے گھونٹ بھی حلق سے اتار لئے۔ اس لئے کہ اختر' میرا اختر' میرا ساتھ نبھانے' مجھے اپنانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ صرف اس کے امتحان سے فارغ ہو کر کاروبار سنبھالنے کی دیر تھی۔ اختر کی بے پناہ محبت نے مجھے ہر ڈر اور خوف سے لاپرواہ سا کر دیا۔ مجھے نئی زندگی بخش دی۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کو بالکل تیار بلکہ بے صبرا ہو رہا تھا مگر جب تک وہ تعلیم مکمل نہ کر لیتا' یہ ممکن نہ تھا۔ پھر ایک روز اس نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ بی اے کا آخری پیپر دے آیا ہے۔ اب رزلٹ نکلنے کی دیر ہے اور پھر۔۔۔ اور اس ''پھر'' سے آگے میں سن نہ سکی۔ سہانے سپنوں میں کھو گئی۔ آنے والے کل کے سورج کی دمکتی کرنیں میرے تاریک ماضی کو تابناک مستقبل میں بدل جانے کا پیغام دے رہی تھیں۔ امی نے مجھے بہت سمجھایا۔ اونچ نیچ' قسمت اور تقدیر سے خوفزدہ کرنا چاہا مگر میں اختر پر اندھا اعتماد کیے بیٹھی تھی۔ کچھ نہ سمجھ سکی۔ کچھ نہ سوچ سکی۔ تب۔۔۔ ایک روز۔ جب اختر نے مجھے بتایا کہ چچا اور چچی نے اس کے لئے ایک امیر زادی کا رشتہ منظور کر لیا ہے تو میرے سپنوں کا تاج محل زمین بوس ہو گیا۔ زندگی نے بڑے پیار سے فریب دیا تھا۔۔۔

میں تمام رات روتی رہی۔ پلک نہ جھپکی۔ سسکیاں گونجتی رہیں۔ ہچکیاں آنسوؤں کا ساتھ دیتی رہیں۔ صبح کے قریب جب میں چند لمحوں کی نیند کی تلاش میں تھک کر اونگھتے اونگھتے ہڑبڑا کر جاگی تو امی ہمیشہ کی نیند سو چکی تھیں۔ وہ مجھ سے زیادہ دکھی' تھکی ہوئی اور ستم رسیدہ تھیں۔ نجات پا گئیں۔

چند روز تک گھر میں خاموشی رہی۔ مجھے کسی نے گالی نہ دی۔ جھڑکیوں سے نہ نوازا۔ تھپڑوں کے انعام سے محروم رہی۔ تب۔۔۔ اختر نے ایک بار پھر مجھے سہارا دیا۔ اس نے مجھ سے جلد ہی خفیہ طور پر شادی کر لینے کی خبر سنا کر ایک بار پھر مجھے امید کی رہگذر پر لا کھڑا کیا۔ چند لمحے پھر بہار کی تصوراتی آغوش میں گزر گئے۔ مگر بہار کے بعد خزاں بھی تو آیا کرتی ہے۔ دن کے بعد رات بھی تو آتی ہے۔

کل کی رات بڑی طوفانی تھی۔ بڑی خوفناک تھی۔ شدت سے بارش ہو رہی تھی۔ بادل پوری قوت سے دھاڑ

رہے تھے۔ برق پوری تابناکی سے کوندرہی تھی۔ اختر ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ اس کے والدین اور گھر کے ملازم گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ اکثر دیر سے لوٹتا تھا۔ میرا دل نہ جانے کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔ گیارہ بج گئے۔ دل جیسے تڑپ کر سینے سے باہر آنے کی سعی کرنے لگا۔ میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ تبھی باہر دروازے پر اسی مخصوص مگر شاید بارش کی وجہ سے تیز انداز میں کی گئی دستک نے مجھے زندگی کی وادیوں میں گھسیٹ لیا۔ میں تقریبا بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے اختر بارش میں شرابور کھڑا تھا۔

’’ارے تم۔۔۔‘‘ وہ مجھے حیرت سے دیکھتا ہوا بولا۔

’’اتنی دیر تم نے کہاں لگادی اختر۔‘‘ میں نے پریشانی سے کہا۔

’’ارے پگلی۔‘‘ اس نے کھینچ کر مجھے سینے سے لگالیا۔ ’’میں جب ناصر کے گھر سے نکلا تو موسم ٹھیک تھا۔ ایک دم ہی بارش نے آلیا۔ موٹر سائیکل پر آتے آتے یہ حال ہوگیا۔‘‘

میں اس کے سینے میں سما گئی۔ دروازہ بند کر کے ہم اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے کمرے میں چلے آئے۔ وہ میرے بستر میں لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

’’جناب، جائیے اب جا کر گیلے کپڑے اتار دیجئے۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔‘‘ کتنی ہی دیر بعد میں نے اس کی بے باک نظروں سے گھبرا کر کہا۔

’’زاہدہ۔۔۔‘‘ اس نے مجھے لحاف کے اندر گھسیٹ لیا۔ میں بے خودی ہوگئی مگر جب وہ حد سے بڑھنے لگا تو میں سنبھل گئی۔ ہوش میں آگئی۔

’’ہوش میں آؤ اختر۔ کیا کر رہے ہو؟‘‘ میں نے اس کے گستاخ ہاتھوں کو روکتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

’’آج مجھے مت روکو زاہدہ۔ دیکھو۔ یہ رات، یہ موسم، یہ تنہائی کیا کہہ رہی ہے۔‘‘ اس نے اس زور سے مجھے لپٹایا کہ میرا انگ انگ کراہ اٹھا۔

’’کیا کر رہے ہو اختر۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟‘‘ میں سہم سی گئی اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر بہکتے جذبات اور موسم نے اختر سے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ وہ وحشی ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اسے دھمکی دی، شور مچانے کی۔ مچلی، تڑپی، روئی مگر وہ بہک چکا تھا۔

پھر میں چیخ اٹھی۔ ایک بار۔ دو بار۔ کہ شاید کوئی مدد کو آ پہنچے اور وہی ہوا۔ کوئی راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتا چلا آرہا تھا۔ اختر گھبرا گیا۔ بہکے ہوئے جذبات کا بھوت اس کے سر سے اتر گیا۔ خدا نے میری عزت بچالی۔ میں لٹتے لٹتے رہ گئی!

''کون ہے اندر؟ دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔۔۔'' چچا جان دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے۔ اختر نے ادھر اُدھر دیکھا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو کھڑکی کھلی تھی اور اختر اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ پھر میری ایک نہ سنی گئی۔ مجھے پیٹا گیا۔ گالیاں دی گئیں۔ تہمتیں تراشی گئیں۔ الزام لگائے گئے۔ بدکار' طوائف' بدچلن اور ایسے کتنے ہی خطابات سے نوازا گیا۔ اپنے گھر کو ایک گندی مچھلی سے پاک کرنے کے لئے مجھے' ایک جوان لڑکی کو' سگی بھتیجی کو' اس طوفانی رات کے حوالے کر دیا گیا مگر اختر نہ آیا۔ شاید اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے کے بعد اس کے پاس کوئی نیا لبادہ نہ رہ گیا تھا۔ اس سے بعد میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ آسمان کی عنایات سے بے دم ہو کر ایک کوٹھی کے سائبان تلے رک گئی تھی۔ پھر کیا ہوا' مجھے کچھ معلوم نہیں!''

وہ خاموش ہو گئی۔

''بڑی دردناک کہانی ہے آپ کی؟'' کچھ دیر بعد وہ ایک طویل سانس لے کر آہستہ سے بولا۔ زاہدہ آنکھیں خشک کرنے لگی۔

''مگر نئی نہیں ہے۔'' وہ دونوں ایک آواز سن کر چونک پڑے۔ دروازے کے پاس پڑے صوفے پر ڈاکٹر ہاشمی بیٹھے تھے۔ ''دنیا میں ایسے ہزاروں واقعات روزانہ پیش آتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر ان کے قریب چلے آئے۔ ''تم خوش قسمت ہو بیٹی کہ ایک وحشی کے ہاتھوں بے آبرو ہونے سے بچ گئیں ورنہ یہ بات تقریباً ناممکن ہو جایا کرتی ہے۔'' وہ بستر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

زاہدہ کا سر جھک گیا۔

''آپ کب آئے انکل؟'' طاہر نے ان کی جانب دیکھا۔

''جب کہانی کلائمکس پر تھی۔'' وہ بولے اور طاہر سر ہلا کر رہ گیا۔ زاہدہ سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''چائے لیں گے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بھئی۔ اس وقت طلب نہیں۔ ہاں بیٹی۔ ذرا ہاتھ ادھر دو۔'' وہ اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر گھڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ ''اب تو بالکل ٹھیک ہو تم۔'' وہ انجکشن دے کر فارغ ہو گئے۔ ''یہ کیپسول ہر تین گھنٹے بعد لیتی رہو۔ انشاء اللہ شام تک ان سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔'' پھر وہ اٹھ گئے۔ ''اچھا بھئی طاہر۔ میں اب چلوں گا۔ شام کو پھر آؤں گا۔''

''بہتر انکل۔'' وہ بھی کھڑا ہو گیا اور سیف کو پکارا۔ چند لمحے بعد وہ کمرے میں تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب کو گاڑی

تک چھوڑ آؤ۔‘‘ سیف نے آگے بڑھ کر ان کا بیگ اٹھا لیا۔ ڈاکٹر ہاشمی چل دیئے۔ ’’اور سنو۔ سیف بابا سے دو کپ چائے کا کہہ دو۔‘‘

’’جی بہتر۔‘‘ وہ سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ زاہدہ تکئے سے ٹیک لگائے جانے کس سوچ میں گم نیم دراز تھی۔

’’ہوں۔ تو آپ صبح اسی لئے ان لوگوں کے پاس بھاگ کر واپس جا رہی تھیں۔‘‘ وہ اسے چونکاتا ہوا گویا ہوا۔

’’جی۔۔۔ جی نہیں۔‘‘ وہ افسردگی سے بولی۔ ’’وہ میرے لئے مر چکے ہیں۔‘‘

’’کیا۔۔۔ اختر بھی؟‘‘ اس نے زاہدہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

’’وہ بھی تو انہی میں سے تھا۔‘‘ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ’’اگر وہ پیٹھ نہ دکھاتا اور میری ڈھال بن جاتا تو میں اس وقت یہاں نہ ہوتی۔‘‘

اور اس کے سینے سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ لبوں پر پھر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تیر گئی۔ ’’تو پھر۔۔۔ کہاں جانے کے لئے اتنا بے قرار تھیں آپ؟ دیکھئے۔ وہی گھسا پٹا جواب نہ دیجئے گا کہ جہاں قسمت لے جاتی۔‘‘ وہ لہجے کو نسوانی بناتے ہوئے بڑی افسردگی سے بولا۔ زاہدہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ’’ارے۔۔۔ آپ تو ہنستی بھی ہیں۔‘‘ وہ بڑی حیرانی سے بولا اور اپنے جواب ندارد سوال کو بھول کر اس کے رنگیں لبوں کی مسکراہٹ میں کھو گیا جو اب کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ’’بس یونہی مسکراتی رہئے۔ ہنستی رہئے۔ بخدا زندگی جنت بن جائے گی۔ ویسے ایک بات کہوں۔ صبح آپ پتہ ہے کیوں بھاگ رہی تھیں؟‘‘ اس نے پھر زاہدہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

’’آپ کا خوفزدہ ذہن مجھ سے بھی ڈر رہا تھا۔ اختر کی طرح۔‘‘

اور اس نے سنجیدہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ شاید یہ سچ تھا۔

سیف بابا چائے لے آیا۔ کچھ دیر بعد وہ چائے سے فارغ ہو گئے۔

’’اچھا مس زاہدہ۔ آپ آرام کیجئے۔ میں کچھ کام نبٹا آؤں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بیل موجود ہے۔‘‘ اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ چند لمحوں بعد سیف کمرے میں تھا۔

’’دیکھو سیف بابا۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ کھانا پورے ایک بجے۔۔۔ اور رات کے کھانے پر تو میں گھر پر ہی ہوں گا۔‘‘

''بہتر صاحب۔'' وہ ادب سے بولا۔

''بس جاؤ۔'' اور وہ واپس پلٹ گیا۔

''اب میں چلوں گا۔ گھبرایئے گا نہیں۔ اور یہاں سے جانے کا ابھی مت سوچئے گا۔ کیونکہ میری غیر موجودگی میں کوئی آپ کو یہاں سے جانے نہیں دے گا۔ شام کو لوٹوں گا تو باقی باتیں ہوں گی۔ پھر طے کریں گے کہ آپ کو آگے کیا کرنا ہے؟'' وہ مسکراتا ہوا کپڑوں والی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ ''ارے ہاں۔ مجھے اپنا وعدہ تو بھول ہی گیا۔'' اچانک واپس آ کر وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اسے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھنے لگی۔

''دیکھئے صاحب۔ ابو تو ہمارے بھی اللہ کے پیاروں کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں۔ بس ایک امی ہیں۔ اور ان کا یہ اکلوتا 'کلم کلا' فرزندِ ارجمند۔ آج کل وہ زمینوں پر گئی ہوئی ہیں۔ بڑی سخت گیر ہیں۔ ملازموں کو سر نہیں چڑھاتیں۔ ان کی خبر لیتی رہتی ہیں۔ اور میں یعنی مسٹر طاہر۔ امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم کا واحد اور بلا شرکت غیرے مالک۔ تاکہ وقت گذرتا رہے۔ بیکار بیٹھنے سے بچنے کا اک بہانہ ہے۔ بس یہ تھی ہماری مختصری زندگی' جس کے بارے میں میں نے آپ کو بتانے کا وعدہ کیا تھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنی مسکراہٹ کو دبا نہ سکی۔

طاہر الماری سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو کچھ دیر کو وہ بھی مبہوت رہ گئی۔ کچھ اتنا ہی سمارٹ لگ رہا تھا وہ۔

وہ ہاتھ ہلا کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ زاہدہ پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

☆

پندرہ دن ایک آنکھ مچولی کی سی کیفیت میں گزر گئے۔ اس شام وہ ڈاکٹر ہاشمی کے ہاسپٹل میں ان کے پاس موجود تھا۔

''طاہر بیٹے۔'' ڈاکٹر ہاشمی کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلے گئے۔ ''تم میں جلد بازی کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ تم ہر اس شے کو حاصل کر لینا چاہتے ہو جو تمہاری نگاہوں کو تسکین دے دے۔ تمہارے دل کو پسند آ جائے لیکن۔۔۔'' وہ رک گئے۔ طاہر بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ ''دوسرے کے جذبات' رستے میں آنے والی رکاوٹوں' حقیقت اور ہر تغیر سے تم بالکل بے بہرہ ہو جاتے ہو۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا انکل۔'' وہ مضطرب سا ہو گیا۔

''جوانی دیوانی ہوتی ہے بیٹے لیکن اگر اسے سنبھل کر خرچ کیا جائے تو یہ کبھی ختم نہ ہونے والا سکون بھی بن جایا سکتی ہے۔''

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر ڈاکٹر ہاشمی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹ پھر بند ہو گئے۔

”ابھی اس اجنبی لڑکی کو یہاں آئے ہوئے صرف تین دن ہوئے ہیں اور تم اسے جنم جنم کا ساتھی جان کر شریکِ حیات بنانے کا بے وقوفانہ فیصلہ کر بیٹھے ہو۔“

”مگر اس کا اب دنیا میں ہے بھی کون انکل؟ اسے یہ بات بخوشی قبول ہو گی۔“

”غلط کہتے ہو۔ تم اس کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اختر کی محبت اتنی جلدی اس کے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی ہو گی۔“

”اس نے خود۔۔۔“

”کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ کہنے کو تو اس نے ان سب کو مردہ کہہ دیا ہے جن میں اس کا چچا‘ چچی اور اختر سب شامل ہیں لیکن کیا وہ حقیقتاً مر گئے ہیں۔ نہیں۔۔۔ وہ زندہ ہیں۔ جیسے میں تم اور وہ خود۔۔۔“

”لیکن۔۔۔“

”ابھی بیگم صاحبہ یہاں نہیں ہیں۔ چند روز میں وہ بھی لوٹ آئیں گی اور اس وقت۔۔۔ اس وقت تم ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے طاہر۔ تم ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو۔“

”لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں۔۔۔“

”وہ فیصلے بدل دینے کی عادی ہیں۔“

”میں بھی انہی کی اولاد ہوں انکل۔“

”اور اگر۔۔۔ اس لڑکی ہی نے تمہارا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا تو؟“

وہ سچ مچ پریشان ہو گیا۔ ڈاکٹر ہاشمی کی ہر بات اپنی جگہ اٹل تھی۔

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو بیٹے۔“ وہ نرمی سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولے۔ ”ابھی اس کے زخم تازہ ہیں۔ ان پر ہمدردی اور پیار کا مرہم رکھو۔ اسے حوصلہ دو۔ جلد بازی کو کچھ عرصے کے لئے خیر باد کہہ دو۔ اگر تم اس کے دل کا زخم بھرنے میں کامیاب ہو گئے تو شاید وہ سب کچھ ہو سکے جو تم سوچ رہے ہو مگر فی الحال ایسا کوئی چانس نہیں ہے۔ شیخ چلی کا خیالی پلاؤ تم جیسا انسان نہ پکائے تو اچھا ہے ورنہ حقیقت کی بھوک تمہیں ایسے فاقے پر مجبور کر دے گی جو جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔“

طاہر نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ مسکرا دیے۔ دھیرے سے پھر اس کا شانہ تھپکا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

”وقت آنے پر میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔“ وہ آہستہ سے بولے۔

اور اسے جیسے بہت بڑا سہارا مل گیا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ مسکرا کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”اللہ حافظ۔“ وہ ہولے سے بولا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆

شوخیوں پر نکھار آتا چلا گیا۔ شرارتیں بڑھتی چلی گئیں۔ تکلف کی دیواریں گرنے لگیں۔ دبی دبی، پھیکی پھیکی مسکراہٹیں، بلند بانگ اور زندگی سے بھرپور قہقہوں میں ڈھل گئیں۔

یک طرفہ محبت کی آگ کے شعلے بلند سے بلند تر ہونے لگے۔ اس کی نیندیں اڑنے لگیں۔ قرار چھن گیا۔ سکون رخصت ہو گیا۔ دفتر کا عملہ اس کی یکدم بڑھ جانے والی زندہ دلی، ظرافت اور پیار کو ”کسی کے مل جانے“ سے تشبیہ دینے لگا۔ اس کی سٹینو امبر نے تو کئی بار اسے ہنسی ہنسی میں یہ بات کہہ بھی دی تھی۔

دوسری طرف زاہدہ اس محبت سے بے خبر تھی۔ بالکل بے خبر۔ لگتا یہی تھا کہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر چکی ہے لیکن اس کے دل میں کیا تھا یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی اختر کی یاد اسے بے چین کر دیتی تو وہ کچھ دیر کے لئے اداس ہو جاتی لیکن جب اسے اختر کی زیادتی کا خیال آتا تو وہ اس اداسی کو ذہن سے جھٹک دیتی۔ اس کے خیال کو دل سے نکال پھینکنے کی کوشش کرنے لگتی۔ ایسے موقع پر طاہر اس کے بہت کام آتا۔ وہ منٹوں میں اس کی اداسی کو شوخی میں بدل کر رکھ دیتا۔ اسے قہقہوں میں گم کر دیتا۔ ماضی کو فراموش کر کے وہ مستقبل سے بالکل لاپرواہ ہوئی جا رہی تھی تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ چٹان کی طرح موجود تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ اختر کو مکمل طور پر اپنی یادوں سے کھرچ دینے میں ناکام رہی تھی۔

آج اسے طاہر کے ہاں آئے دو ماہ ہو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک گاؤں سے نہیں لوٹی تھیں۔ سردیاں ختم ہونے کو تھیں۔ طاہر نے اسے کیا کچھ نہ دیا تھا۔ مسکراہٹیں، خوشیاں، بے فکری، آرام آزادی۔۔۔ لیکن یہ اس کا مستقل ٹھکانہ تو نہیں تھا۔

”اے مس اداس۔۔۔“ طاہر کی شوخی سے بھرپور آواز نے اس کے خیالات کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسے مسکراتی ہوئی بڑی گہری نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے سامنے ہی آلتی پالتی مار کر لان کی نرم نرم گھاس پر بیٹھ گیا۔

”فرمایئے۔“ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”فرمانا کیا ہے ہم فقیروں نے۔ بس یہ ایک عدد خط آیا ہے امی جان کا۔“ وہ کاغذ کھول کر اسے گھاس پر بچھاتا

ہوا جیسے مشاعرے میں غزل پڑھنے لگا۔ وہ نجانے کیوں بے چین سی ہو گئی۔

"آ رہی ہیں وہ؟"

"ہاں۔۔۔ مگر تم کیوں پریشان ہو گئیں؟" وہ خط پڑھے بغیر تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"پریشان۔۔۔ نہیں تو۔ وہ۔۔۔"

"اچھا چھوڑو۔ ایک بات بتاؤ۔"

"جی پوچھیے۔"

"اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی طاہر صاحب کہ آپ نے مجھ پر کتنے احسانات۔۔۔"

"میں نے احسانات گننے کو نہیں کہا۔ یہ پوچھا ہے کہ اب آئندہ کا پروگرام کیا ہے؟" اس نے زاہدہ کی بات کاٹ دی۔

"پروگرام کیا ہونا ہے طاہر صاحب۔ ایک نہ ایک روز تو مجھے یہاں سے جانا ہی ہے۔ کئی بار جانا چاہا۔ کبھی آپ نے یہ کہہ کر روک لیا کہ کہاں جاؤ گی؟ اور کبھی یہ سوچ کر رک گئی کہ واقعی کہاں جاؤں گی میں؟ لیکن آج آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو۔۔۔" وہ رک گئی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ "آپ ہی بتائیے۔ میں کہاں جاؤں؟"

"ارے تو کون اُلو کا پٹھا تمہیں جانے کو کہہ رہا ہے؟" وہ مصنوعی جھلاہٹ سے بولا اور اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"مذاق نہیں طاہر صاحب۔ میں۔۔۔ میں آج ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ اداسی سے بولی۔

"کہاں؟"

"کہیں بھی؟" وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر رہ گئی۔

"پھر بھی؟"

"جہاں۔۔۔"

"قسمت لے جائے۔ بس اس فلمی ڈائیلاگ سے مجھے بڑی چڑ ہے۔" وہ اس کی بات اچک کر بولا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

"سنو۔۔۔" وہ اس کے بالکل سامنے بالکل قریب چلا آیا۔

اس نے طاہر کی طرف دیکھا۔

''تم کہیں مت جاؤ۔ یہیں رہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''نوکرانی بن کر۔۔۔؟'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''رانی بن کر۔'' وہ اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیران سی ہوگئی۔

''رانی کا مطلب نہیں سمجھتیں کیا۔ ارے وہی۔۔۔ جو ایک راجہ کی۔۔۔'' وہ شرارت سے مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

''طاہر صاحب۔'' وہ حیرت سے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟'' وہ بے چینی سے بولا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''ایسا مت کہیے طاہر صاحب۔ میں اتنا بھیانک مذاق سہہ نہ سکوں گی۔''

''ارے واہ۔ تم زندگی بھر کے بندھن کو مذاق۔۔۔''

''خاموش ہو جائیے طاہر صاحب۔ خدا کے لئے۔'' وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی۔

''زاہدہ۔۔۔'' اس کو شانوں سے تھام کر طاہر نے اس کا رخ اپنی جانب پھیرا۔ ''میں اختر نہیں ہوں زاہدہ۔''

''اسی لئے تو یقین نہیں آتا۔'' اس نے رخ پھیر لیا۔

''زاہدہ۔ تم۔۔۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ میں۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ رک رک کر کہہ گیا۔

''بس کیجئے طاہر صاحب۔ بس کیجئے۔ یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر بہت پہلے میرے دل میں اتر چکے ہیں۔''

''زاہدہ۔'' وہ تڑپ اٹھا۔ ''میرے خلوص کی یوں دھجیاں نہ بکھیرو۔''

''مجھے جانے دیجئے طاہر صاحب۔ مجھے جانے دیجئے۔ مجھ میں اب یہ فریب یہ ستم سہنے کی تاب نہیں۔'' وہ چل دی۔

طاہر آگے بڑھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ''جاسکوگی؟'' اس کی نم آنکھوں میں جھانک کر وہ بڑے مان سے بولا۔

وہ لرز گئی۔ ایک چٹان کھڑی تھی اس کے راستے میں!

''میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کے لئے بے قراری محسوس کی ہے زاہدہ۔ پہلی مرتبہ میرا دل کسی کے لئے دھڑکا ہے۔ تمہارے لئے۔ زاہدہ صرف تمہارے لئے۔ اگر اسی کو محبت کہتے ہیں تو۔۔۔''

''طاہر صاحب۔'' وہ پھر سسکی۔

''ہاں زاہدہ۔ میں نے جب تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو نجانے کیوں تمہیں دل میں سمو لینے دھڑکنوں میں چھپا لینے کو جی چاہا۔ میں نے اپنا کوئی آئیڈیل نہیں بنایا زاہدہ مگر اب لگتا ہے تم ہی میری نامحسوس اور اور ان دیکھی آرزوؤں کی تصویر ہو۔ میں نے اس کٹی پھٹی تصویر میں اپنی چاہت کے رنگ بھر دیے لیکن نہیں جانتا تھا کہ یہ تصویر میری بولی سے بہت زیادہ قیمت کی ہے۔ میرے پاس تو صرف خلوص کی دولت ہے زاہدہ۔ اس ظاہری شان و شوکت' اس آن بان پر تو میں کبھی تن کر کھڑا نہیں ہوا۔''

وہ بت بنی اس کی صورت تکتی رہی۔ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

''جانا چاہتی ہو؟ مجھے چھوڑ کر؟'' وہ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر آہستہ سے بولا۔ ''میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ جاؤ۔'' وہ بڑی درد بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے ایک طرف ہٹ گیا۔

زاہدہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ کر دھیرے سے حرکت کی اور چل دی۔ آہستہ آہستہ' چھوٹے چھوٹے چند قدم اٹھائے۔

طاہر کی آنکھوں کے سامنے دھندسی لہرا گئی۔ پانی کی پتلی سی چادر تن گئی۔

وہ رک گئی۔

طاہر کی پلکیں بھیگ گئیں۔

وہ پلٹی۔ دھیرے سے۔

طاہر کے ہونٹوں کے گوشے لرز گئے۔

وہ رخ پھیر کر بھاگی۔

طاہر کے بازو وا ہو گئے۔

وہ اس کے بازوؤں میں سماتی چلی گئی۔ شبنم' پھول کی پتیوں پر پھسل پڑی۔

دور برآمدے میں کھڑے ڈاکٹر ہاشمی کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ ابھری۔ شاید وہ سب کچھ جان گئے تھے۔

☆

''تو ہماری اک ذرا سی عدم موجودگی نے یہ گل کھلائے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے سر جھکائے کھڑے طاہر زاہدہ اور ڈاکٹر ہاشمی کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔

''میں نے ۔۔۔'' طاہر نے کہنا چاہا۔

''کوئی جرم نہیں کیا۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔ محبت کی ہے۔ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فلمی ڈائیلاگ بولو گے نا تم۔'' اس کی بات تیز لہجے میں کاٹ دی گئی۔ وہ ان کے پُر رعب با وقار چہرے پر پھیلتی سختی کی تاب نہ لا کر سر جھکا کر رہ گیا۔

''ڈاکٹر ہاشمی۔''

''جی بیگم صاحبہ''۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ آئے۔

''آپ بھی اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔'' وہ سرد مہری سے بولیں۔

''جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ میں ۔۔۔۔'' وہ گڑبڑا گئے۔

''گھبرایئے نہیں ڈاکٹر ہاشمی۔ آپ ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہیں۔ آپ میں تو اتنی ہمت' اتنی جرات ہونی چاہیے کہ آپ ہم سے بلا خوف بات کر سکیں' یا ہمارے نمک میں یہ اثر بھی نہیں رہا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ۔'' وہ سنبھل گئے۔

''تو پھر؟ یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ ہمیں اطلاع کیوں نہ دی گئی؟'' وہ ان کی جانب دیکھتی ہوئی بولیں۔

''میں نے ۔۔۔''

''آپ نے کچھ بھی سوچا ہو ڈاکٹر ہاشمی مگر ہمارے لئے نہیں۔ اس سر پھرے لڑکے کے لئے سوچا ہو گا' جسے آپ نے گودوں کھلایا ہے۔ ہے ناں؟''

''جی ۔۔۔ جی ہاں۔'' وہ اقرار کر گئے۔

زاہدہ سہم سی گئی مگر طاہر نے اسے نظروں ہی نظروں میں دلاسا دیا۔ تب وہ اپنے خوف کو کافی حد تک کم محسوس کرنے لگی۔

''طاہر۔'' وہ اس کی طرف پلٹیں۔

''جی امی جان۔'' وہ ادب سے بولا۔

''تمہیں ہمارا فیصلہ معلوم تھا ناں؟''

''جی۔'' اس کا سر جھک گیا۔

''پھر تم نے اسے بدلنے کے بارے میں سوچا کیسے؟''

''گستاخی معاف امی جان۔ میں نے تمام زندگی آپ کے ہر حکم پر سر جھکایا ہے۔''

''مگر اب اس لڑکی کی خاطر' اپنی پسند کی خاطر' تم ہمارے ہر اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دو گے جو ہم تم پر حکم کہہ کر لاگو کریں گے۔'' انہوں نے اس کی بات پوری کر دی۔

''جی نہیں۔ امی جان میں نے ایسا۔۔۔''

''تو تمہیں ہمارے ہر فیصلے سے اتفاق ہوگا؟'' وہ حاکمانہ انداز میں گویا ہوئیں۔ وہ جواب میں خاموش رہا۔ ایک بوجھ سا ان سب کے دلوں پر بیٹھتا چلا گیا۔

ڈاکٹر ہاشمی نے پُر درد نظروں سے ان دو پیار بھرے دلوں کو دیکھا' جو سہمے سہمے انداز میں دھڑکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اس خاموشی سے ہم کیا مطلب لیں طاہر؟''

اور اس نے آہستہ سے زاہدہ کی جانب دیکھ کر سر اٹھایا۔ ''میں آپ کے فیصلے کا منتظر ہوں امی جان۔''

''تو۔۔۔'' وہ ان کی جانب گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔ ''ابھی۔۔۔ اسی وقت۔ اس لڑکی کو۔۔۔'' وہ رکیں۔ ان سب کو تنقیدی اور جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ ''یہاں سے رخصت کر دو۔'' کہہ کر انہوں نے رخ پھیر لیا۔

ایک بم پھٹا۔ ایک زلزلہ آیا۔ ایک طوفان اٹھا۔ یہ سب ان کی توقع کے مطابق ہی ہوا تھا مگر وہ پھر بھی سہہ نہ سکے۔

''میں وجہ پوچھنا چاہوں گا امی جان۔'' ایک اور دھماکہ ہوا۔

''طاہر'' وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ تیزی سے اس کی طرف پلٹیں۔ ''وجہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ غیظ و غضب سے ان دونوں کو گھورتے ہوئے پھنکاریں۔

''میں آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ جیسے ہر خوف' ہر ڈر سے بے بہرہ ہو گیا۔

وہ ایک لمحے کو سن ہو گئیں۔ طاہر ان سے وجہ پوچھ رہا تھا۔ ان کے حکم کی تعمیل سے انکار کر رہا تھا۔ ان کی انا پر براہ راست حملہ آور ہو رہا تھا۔

مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئیں۔ جوانی جوش میں تھی' انہیں ہوش کی ضرورت تھی۔ طوفان چڑھ رہا تھا۔ بند باندھنا مشکل تھا' ناممکن نہیں۔

ان کے چہرے کی سرخی اعتدال کی سفیدی میں ڈھلتی چلی گئی۔ آنکھوں میں دہکتی ہوئی آگ' ہلکی سی چمک میں بدل گئی۔ بڑھاپا سنبھل گیا۔ جوانی کو داؤ میں لینے کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

”یہ لڑکی کون ہے۔ جانتے ہو؟“ وہ زاہدہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

”انسان ہے امی جان۔“ وہ ادب سے بولا۔

”اس کا خاندان' گھر بار' ٹھکانہ' ماں باپ۔“ وہ بل کھا کر ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ گئیں۔

”یہ بے سہارا ہے امی جان۔“

”آوارہ بھی تو ہو سکتی ہے۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”امی جان۔“ وہ احتجاجاً بولا۔

”جنگ میں زخموں کی پرواہ کرنے والے بزدل ہوتے ہیں طاہر بیٹے۔ اور تم ہمارے بیٹے ہو۔ ہمارے سامنے تن کر کھڑے ہوئے ہو تو وار سہنا بھی سیکھو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولیں۔

”امی جان۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ”یہ غریب' بے سہارا' بے ٹھکانہ ہے۔“

”تو آج تک دارالامان میں رہی ہے۔“ وہ طنز سے بولیں۔

”اپنوں کے ستم سہتی رہی ہے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”پھر یہ بے گھر کیسے ہوئی؟ کیوں ہوئی؟“ وہ جلال میں آ گئیں۔

”تقدیر جب سر سے آنچل کھینچ لینے کے درپے ہو گئی تو۔۔۔“

”تو۔۔۔ یہ تمہارے پاس چلی آئی۔“ انہوں نے اس کا فقرہ بڑے خوبصورت طنز سے پورا کر دیا۔

”میں سب بتا چکا ہوں امی جان۔“ وہ ادب ہی سے بولا۔

”مگر ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ایسی لڑکی ہمارے بیٹے کی بیوی اور ہماری بہو کہلائے۔۔۔“

”جس کے پاس دولت نہیں۔ جہیز نہیں۔ معاشرے میں اونچا مقام نہیں۔“ وہ پھٹ پڑا۔

”ٹھیک سمجھے ہو۔“ وہ نرمی سے بولیں۔

”میں ایک سوال اور کروں گا امی جان۔“

”ہم جواب ضرور دیں گے۔“

”اگر یہ لڑکی۔۔۔ فرض کیجئے یہ لڑکی ڈاکٹر ہاشمی کی بیٹی ہوتی تو؟“

”تو ہم بخوشی اسے اپنی بہو بنا لیتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر ہاشمی کی بیٹی نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسے تمہاری بیوی نہیں بنا سکتے۔“ وہ وقار سے بولیں۔

”اگر شرط یہی ہے تو سمجھ لیجئے بیگم صاحبہ۔ یہ لڑکی آج سے میری بیٹی ہے۔“ ڈاکٹر ہاشمی نے آگے بڑھ کر زاہدہ

کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ڈاکٹر ہاشمی۔'' امارت تلملا اٹھی۔

''آپ زبان دے چکی ہیں بیگم صاحبہ''۔ وہ ادب اور آہستگی سے بولے۔

''مگر یہ آپ کی سگی بیٹی نہیں ہے۔''

''آپ نے یہ شرط نہیں لگائی تھی امی جان۔'' وہ ان کے بالکل قریب چلا آیا۔

اور وہ اپنی بوڑھی' تجربہ کار مگر ممتا بھری نظروں سے اسے گھورتی رہ گئیں۔

''مان جایئے ناں امی جان۔ تمام زندگی مجھے حکم دیتی آئی ہیں۔ میری ضدیں پوری کرتی آئی ہیں۔ آج یہ ضد بھی مان لیجئے۔''

وہ پھر بھی اسے گھورتی رہیں۔ تاہم طوفان اترنے لگا تھا۔

''امی جان۔'' اس نے ان کے شانے تھام لئے۔ ''بولئے ناں۔'' اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ممتا لرز گئی اور بالآخر بے بس ہو گئی۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ پھر انہوں نے سر جھکا لیا۔ آہستہ سے بیٹے کو ایک طرف ہٹا دیا۔ دو قدم چلیں اور زاہدہ کو گھورنے لگیں۔

''ہمارے۔۔۔ قریب آؤ۔'' وہ رک رک کر کتنی ہی دیر بعد بولیں۔ وہ پلکوں پر ستارے لئے' دھیرے دھیرے' ان کے قریب چلی آئی۔

وہ چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے جانے کیا دیکھتی رہیں۔ جانچتی رہیں۔ تب اس کی پلکوں سے ستارے ٹوٹے اور بیگم صاحبہ کے قدموں پر نچھاور ہو گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ان کے قدم چوم لیتی' انہوں نے اس کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کر دی۔

فیصلہ ہو گیا۔

''ہم ہار گئے طاہر۔'' وہ زاہدہ کو سینے سے الگ کر کے آہستہ سے پلٹیں۔ ''لیکن صرف اپنے اصولوں' اپنی زبان کی خاطر۔''

''امی جان۔'' وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گیا۔

''پگلے۔ ابھی تو بڑا فلسفی بنا ہوا تھا۔'' وہ اس کے سر پر بوسہ دیتی ہوئی مسکرائیں۔

''امی جان۔'' وہ جھینپ کر بولا۔ زاہدہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر ہاشمی مسکرا رہے تھے۔

’’ڈاکٹر ہاشمی۔‘‘ کچھ دیر بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

’’جی بیگم صاحبہ۔‘‘ وہ ادب سے بولے۔

’’ہماری بہو کو گھر لے جائیے۔ ہم اگلے ماہ کی تین تاریخ کو یہ ستارہ اپنے چاند کے پہلو میں دیکھنا چاہتے ہیں۔‘‘ وہ پیار سے ان دونوں کو گھور کر بولیں۔

’’جو حکم بیگم صاحبہ۔‘‘ وہ بھی مسکرا دیئے۔

شرما کر زاہدہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپاتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ طاہر اس کے لرزتے ہوئے وجود کو دیکھ کر نشے میں جھومتا ہوا آگے بڑھا۔

’’مبارک ہو۔‘‘ زاہدہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

’’ہماری طرف سے بھی۔‘‘ بیگم صاحبہ کی آواز نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ شرم سے گڑی جا رہی تھی۔

’’ہمیں اب اجازت دیجئے بیگم صاحبہ۔ آپ نے وقت بہت کم دیا ہے۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے کہا۔

’’کاش! آپ جانتے ڈاکٹر ہاشمی کہ انتظار کس قدر تلخ شے کا نام ہے۔‘‘ وہ ہولے سے قہقہہ لگا کر بولیں۔

ڈاکٹر ہاشمی جھینپ کر رہ گئے۔ ’’اچھا۔ تو جائیے۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ’’لے جائیے ہماری امانت کو اپنے گھر چند دنوں کے لئے۔‘‘ وہ شرمائی لجائی سی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈاکٹر ہاشمی کے ہمراہ خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

بیگم صاحبہ کے چہرے پر ایک سکون تھا۔ تمکنت تھی۔ وقار تھا مگر دل میں ایک پھانس سی تھی۔ انہیں نجانے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ ایک خواب ہے جو طاہر نے دیکھا ہے' اور جب اس کی آنکھ کھلے گی تو تعبیر اچھی نہیں ہو گی۔ پھر انہوں نے سر جھٹک کر اپنے واہموں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی تاہم دل کی بے سکونی ان کی پیشانی پر تفکر کی لکیر بن کر چھلک آئی تھی۔ شاید بڑھاپا خود کو فریب دینا چاہ رہا تھا مگر تجربے کی تیسری آنکھ وا ہو چکی تھی جو آنے والے وقت کے اندیشے کی پرچھائیاں محسوس کر کے پتھرائے جا رہی تھی۔

☆

’’لو بیٹی۔ یہ ہے تمہارا نیا مگر مختصر سے وقت کے لئے چھوٹا سا گھر۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے اسے ساری کوٹھی کی سیر کرانے کے بعد واپس ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

زندگی کی خوشیاں' ہر نعمت' ہر مسرت پا کر بھی' اس پر نجانے کیوں ایک بے نام سی اداسی' نامحسوس سی یاسیت طاری تھی' جسے وہ چھپانے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔

’’دینو۔ او دینو۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

''جی مالک۔'' نوکر کمرے میں داخل ہوا۔

''دیکھو۔ دو کپ چائے لے آؤ مگر ذرا جلدی۔ مجھے ہاسپٹل پہنچنا ہے۔'' وہ چٹکی بجا کر بولے۔ دینو سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر ہاشمی نے مختصراً دینو کو اتنا ہی بتایا تھا کہ زاہدہ ان کی منہ بولی بیٹی ہے اور اگلے ماہ اس کی شادی طاہر میاں سے ہو رہی ہے۔ دینو ان کا اکلوتا اور وفادار ملازم تھا۔

ڈاکٹر ولا اور ہاشمی نے بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ سرمد۔ جسے وہ جی بھر کر پڑھانا چاہتے تھے۔ آج کل وہ لندن یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹا دو ہی افراد اس خوبصورت آشیانے کے باسی تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد غم اور خوشی کے شریک۔ راز دار دوست' سبھی کچھ تو تھے وہ۔

ثروت خانم کے دلہن بن کر آنے سے بھی پہلے سے وہ سر سلطان وجاہت کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ معالج اور مریض کا یہ رشتہ وقت نے رفتہ رفتہ دوستی میں بدل دیا اور سر وجاہت سلطان کی وفات کے بعد بیگم صاحبہ اور طاہر سے ان کا یہ تعلق سرپرستانہ ہو گیا۔ انہیں سلطان ولا میں گھر کے ایک اہم فرد ہی کی سی عزت دی جاتی تھی۔ اس تعلق کی بنیادوں میں یہ بات اولیں اہمیت کی حامل تھی کہ انہوں نے طاہر کو واقعی کسی چچا کی طرح گود میں کھلایا تھا۔

چائے ختم ہو گئی تو وہ اٹھ گئے۔

''اچھا بیٹی۔ میں ذرا ہاسپٹل ہو آؤں۔ شام تک لوٹ آؤں گا۔ تم گھبرانا نہیں۔ دینو سے بے تکلف ہو کر جس شے کی ضرورت ہو کہہ دینا۔ شام کو شاپنگ کے لئے چلیں گے۔''

وہ خاموش رہی۔ ڈاکٹر ہاشمی ہنستے ہوئے اٹھے اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

وہ کتنی ہی دیر جانی پہچانی سوچوں میں گم صوفے پر بیٹھی رہی۔ آنسو اس کی پلکوں سے شبنم کے موتیوں کی طرح ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر پھسلتے رہے۔ ذہن الجھا رہا۔ دل مچلتا رہا اور لب کپکپا کر ایک ہی نام' ایک ہی خیال کو دہراتے رہے۔

''اختر۔ کاش اختر۔ وہ سب کچھ نہ ہوتا۔ جس نے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا۔ مجھے سب کچھ ملا اختر مگر تم نہ ملے۔ کیوں اختر؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمام زندگی کے لئے مجھے یادوں کی چتا میں جلنے کو کیوں چھوڑ دیا؟ بولو ناں اختر۔ تم سنتے کیوں نہیں؟ کہاں ہو تم اختر۔ کہاں ہو تم؟''

وہ کتنی ہی دیر روتی رہی ۔ اشک بہتے رہے۔ دل سلگتا رہا۔ یادیں آتی رہیں ۔ جانے کب تک ۔ پھر وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے وہ نیند کی بانہوں میں سمٹ گئی۔ کسی معصوم بچی کی طرح۔

☆

شادی میں صرف دو دن باقی تھے۔ دونوں جانب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

ڈاکٹر ہاشمی نے اپنی چیک بک کو جی کھول کر استعمال کیا تھا۔ اب ان کی سونی سونی کوٹھی واقعی کسی ایسی لڑکی کا گھر معلوم ہونے لگی تھی' جس کی رخصتی عنقریب ہونے والی ہو۔

وہ بے حد خوش تھے۔ بھری دنیا میں ایک بیٹے اور اب اس منہ بولی' چند روزہ مہمان بیٹی کے سوا ان کا تھا بھی کون؟ وہ اسے باپ بن کر ہی بیاہنا چاہتے تھے!

بیگم صاحبہ بھی وقتاً فوقتاً ان کے ہاں چلی آتیں ۔ انہیں اپنے ہاں بلا بھیجتیں ۔ صلاح مشورے ہوتے ۔ پھر آنے والے سہانے دنوں کے خواب حقیقت بن بن کر ان کی ترستی ہوئی پیاسی آنکھوں میں ابھرنے لگتے۔

رہ گیا طاہر۔ تو اس کا ایک ہی کام تھا۔ دن بھر ٹیلی فون کر کر کے اسے تنگ کرنا۔ آنے والے خوبصورت دنوں کی باتیں کرنا۔ ٹھنڈی آہیں بھر کر وقت کے جلدی نہ گزرنے کی شکایتیں کرنا۔ بے قرار دل کا حال زار سنانا اور محبت جتانا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ اگر ڈاکٹر ہاشمی اور بیگم صاحبہ کا نادر شاہی حکم نہ ہوتا تو وہ شاید ہر پل زاہدہ کی قربت میں گزار دیتا مگر مجبور تھا۔ ہاں تھوڑا سا بے شرم ہو کر وہ زاہدہ کے لئے ہر روز کوئی نہ کوئی چیز ضرور خرید لاتا۔ کبھی ساڑھی۔ کبھی نیکلس ۔ کبھی کچھ۔ کبھی کچھ۔

بیگم صاحبہ سب کچھ دیکھ کر' سب کچھ جان کر بھی' ہولے سے مسکرا کر خاموش ہو رہتیں ۔ اور بس ۔ عجیب بات تھی کہ انہیں اب بھی اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ ان کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے۔ اب بھی ان کا وہم انہیں اندر سے ڈرائے رکھتا تھا۔

طاہر دفتر میں سارا سارا دن بچوں کی طرح ہر ایک کو چھیڑتا رہتا۔ ہر ایک کو تنگ کرتا رہتا۔ سب اس کی خوبصورت شرارتوں کو مالک کے پیار سے زیادہ ایک سچے' مخلص اور پیارے دوست کا حق سمجھ کر برداشت بھی کرتے اور موقع ملنے پر بدلہ بھی چکا دیتے۔

''امبر۔ ۔ ۔ تم بھی جلدی سے شادی کر لو۔ ایمان سے آدمی مرنے سے پہلے ہی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔'' طاہر کہتا اور وہ بیر بہوٹی بن کر رہ جاتی۔

اب تو چند دنوں کی بات تھی۔ پھر۔ ۔ ۔ اور اس ''پھر'' سے آگے وہ بڑے حسین تصورات میں گم ہو جاتا۔ کھو کر

رہ جاتا۔ ”زاہدہ۔“ ایک نام اس کے لبوں پر آتا اور وہ مدہوش سا ہو جاتا۔

دوسری طرف زاہدہ کسی اور ہی دنیا میں تھی۔ سب کچھ اس کی آنکھوں، جاگتی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ محسوس کر رہی تھی لیکن اسے یہ سب خواب معلوم ہو رہا تھا۔ ایک ایسا خواب جس میں بے چینی تھی، بے سکونی تھی، بے اطمینانی تھی۔ وہ راتوں کو بے قراری سے کروٹیں بدلتی رہتی۔ اضطراب اس پر حاوی رہتا۔ ذہن منتشر منتشر سا۔ دل مسلا مسلا سا۔ سوچیں ادھوری ادھوری سی۔ خیالات بکھرے بکھرے سے۔ وہ خود کو نامکمل سی محسوس کرتی۔ قطعی نامکمل، تشنہ اور ادھورا۔

یہ ادھورا پن، یہ تشنگی، یہ اضطراب، صرف اور صرف ماضی کی ان بے قرار یادوں کے باعث تھا جو اسے ایک پل کو چین نہ لینے دیتی تھیں۔ اس کے ہر تصور پر اختر، ہر پل، ہر لمحہ چھایا رہتا۔ اس نے جتنا ماضی سے دامن چھڑانا چاہا، مستقبل اتنا ہی اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ یادوں کے گھور اندھیروں میں ڈوبی اشکوں کے چراغ جلاتی رہتی مگر کوئی راستہ، کوئی منزل، کوئی راہگزر نگاہوں کے ہالے میں تیرتی نظر نہ آتی۔

محبت کھیل نہیں کہ بغیر چوٹ دیے ختم ہو جائے۔۔۔ یہ احساس اسے شدت سے ہو رہا تھا۔ پوری تندی و تیزی سے یہ طوفان اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اور وہ بے بسی سے اپنی نم آنکھوں میں چبھتے نوکیلے کانٹوں کی چبھن اپنی روح پر محسوس کرتے ہوئے آنسو آنسو ہو کر چیخ پڑتی۔ چلا اٹھتی۔

”اختر کہاں ہو تم۔ ظالم! یہ کس جہنم میں دھکیل دیا ہے تم نے مجھے۔ ایک بار۔ صرف ایک بار سامنے تو آؤ۔ مجھے یقین تو ہو جائے کہ تم وہ نہیں ہو جو صرف ایک رات کے لئے، ایک مختصر سے وقفے کے لئے نظر آئے تھے۔ اور اگر وہی ہو جسے میں نے صدیوں اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپائے رکھا تو میں وہی بن جاؤں، جو تمہارے لئے دیوی تھی۔ تمہاری داسی تھی۔ تمہاری تھی اختر۔ صرف تمہاری!“۔۔۔ مگر اس کے دل کی یہ پکار، جذبات کی صدا کوئی بھی تو نہ سن سکتا تھا۔ کوئی بھی تو نہیں۔ اختر بھی نہیں!

جوں جوں وہ یادگار دن قریب آ رہا تھا جس کی خاطر طاہر نے اسے فرش سے عرش پر لا بٹھایا تھا۔ جس کے انتظار میں اس نے ہر پل سپنے دیکھے تھے۔ خواب سجائے تھے، توں توں وہ اداسی، یاسیت اور خاموشی کی گمبھیر وادیوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ اس لئے کہ خوابوں کا شہزادہ وہ نہیں تھا جسے اس نے دھڑکن کی طرح دل میں چھپا رکھا تھا۔ تعبیر وہ نہیں تھی جو اس نے اپنے تصورات کے سہارے سوچ رکھی تھی۔ پھر اسے اپنی اس جذباتی غلطی، حالات سے گھبرا کر مایوسی کی باہوں میں پناہ لے لینے کے خوفناک گناہ پر پچھتاوا ہونے لگتا۔ کتنا بھیانک تھا اس ایک لمحے کی لرزش کا انجام، جو اس نے طاہر کی محبت کے سامنے سر جھکا کر کی تھی۔ وہ آج بھی اپنے خیالات میں اختر کو بسائے ہوئے تھی۔ اختر کو

بھلا دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس کی زندگی جیسے بہاروں بھرے گلشن میں تمام عمر کے لئے آگ میں جلنے جا رہی تھی۔ اور اسے یہ سب کچھ بہر حال سہنا تھا۔ رو کر یا ہنس کر۔

☆

''زاہدہ بیٹی۔ تم چھ بجے کے قریب ہاسپٹل چلی آنا۔ میں کار بھیج دوں گا۔''

''جی مگر۔۔۔'' وہ شاید وجہ پوچھنا چاہتی تھی۔

''بیٹی۔ بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا۔ وہ بھی آ رہی ہیں شام کو۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جانا چاہتی ہیں۔ تمہاری پسند کی کچھ چیزیں خریدیں گی۔'' ڈاکٹر ہاشمی کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔ ''جی بہتر۔''

''اللہ حافظ۔'' انہوں نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک بے جان' ٹوں ٹوں کرتے ریسور کو تھامے کھڑی جانے کیا سوچتی رہی۔

کلاک نے پانچ بجائے تو وہ چونک پڑی۔ آہستہ سے ایک طویل' تھکی تھکی سانس لے کر پلٹی۔ اس کی بے چین نظریں بے اختیار اپنی کلائی پر بندھی خوبصورت سی رسٹ واچ پر جم گئیں جو اسے ڈاکٹر ہاشمی نے خرید کر دی تھی۔

پھر وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں داب کر آنکھوں میں تیر جانے والے آبدار موتیوں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی صوفے پر اوندھی گر پڑی۔ سسکیاں کمرے کی خاموش اور اداس فضا کے بے جان بُت پر آہوں' دبی دبی ہچکیوں اور بے قرار جذبات کے پھول نچھاور کرنے لگیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک بلکتی رہی۔ پھر ''ٹن'' کی مخصوص آواز کے ساتھ کلاک نے وقت کے بوڑھے' متحرک رعشہ زدہ سر پر پہلا ہتھوڑا کھینچ مارا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ ضرب' یہ چوٹ اس کے دل پر لگی ہو۔ چھ بج چکے تھے۔

وہ اٹھی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی اور صوفے پر بیٹھ کر پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ اس کی خوبصورت' مدھ بھری آنکھیں سوچی سوچی نظر آ رہی تھیں۔

''سلام بی بی جی۔'' کچھ دیر بعد ایک آواز سن کر وہ چونکی۔ ڈرائیور دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ڈرائیور بھی اس کے پیچھے ہی باہر چلا آیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ڈاکٹر ہاشمی کے چھوٹے سے ہاسپٹل کے کار پارک میں اتری۔ ڈرائیور کار کو آگے بڑھا لے گیا اور وہ سر جھکائے اندر کو چل دی۔

''تم آ گئیں بیٹی۔ آؤ۔ بیٹھو۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا اور ہاتھ میں موجود ایکسرے

کو روشنی کے ہالے میں لاکر غور سے دیکھنے لگے۔ قریب کھڑی نرس ان کی جانب منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہے؟“ وہ ایکسرے کو میز پر رکھتے ہوئے پرسوچ انداز میں بولے۔ ”تم اس مریض کے کمرے میں چلو۔ میں آرہا ہوں۔“

”یس سر۔“ نرس تیزی سے باہر نکل گئی۔

زاہدہ سر جھکائے ناخن سے میز کی سطح کرید رہی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹی۔ تم کچھ اداس ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی۔۔۔ جی نہیں تو۔“ وہ پھیکے سے انداز میں بادل نخواستہ مسکرا دی۔

”ہوں۔ بیگم صاحبہ کے آنے میں تو ابھی کچھ دیر ہے۔ آؤ۔ تمہیں دکھائیں کہ ہم مریض کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔“ وہ رسٹ واچ سے نگاہ ہٹا کر اٹھتے ہوئے مسکرائے۔ زاہدہ بے اختیار کھڑی ہوگئی۔ تنہائی میں اگر وہ پھر بے قابو ہو جاتی اور بیگم صاحبہ آجاتیں تو؟ یہی سوچ کر اس نے انکار مناسب نہ سمجھا اور ان کے پیچھے چلتی ہوئی کاریڈور میں نکل آئی۔ بایاں موڑ مڑتے ہی پہلا کمرہ ان کی منزل تھا۔ وہ ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹھیک اسی وقت مریض کے بستر کے قریب کھڑی نرس ڈاکٹر ہاشمی کی جانب پلٹی۔

”سر۔ اسے ہوش آرہا ہے۔“ پرے ہٹتے ہوئے اس نے ان راستہ دیا۔

ڈاکٹر ہاشمی تیزی سے بستر کے قریب چلے گئے اور جھک کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ زاہدہ بے مقصد ہی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”اس کی والدہ کہاں گئیں؟“

”جی۔ وہ اپنے ہسبینڈ کو فون کرنے گئی ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ سیدھے کھڑے ہوگئے۔

تب۔۔۔ پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ روشنی اور اندھیرے کے ملے جلے جھماکے جو اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر گئے۔ ہر شے جیسے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ زمین لرزی۔ آسمان کانپا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ اس کی حیرت زدہ پھٹی پھٹی آنکھیں بستر پر پڑے اختر پر جمی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

ڈاکٹر ہاشمی اس کی دگرگوں ہوتی حالت کو دیکھ کر بری طرح گھبرا گئے۔

”بیٹی۔ کیا بات ہے؟“ وہ تیزی سے گرتی ہوئی زاہدہ کی جانب لپکے اور اسے باہوں میں سنبھال لیا۔ پھر ان کی بے چین آنکھوں نے زاہدہ کی حلقوں سے ابلتی برستی آنکھوں کا محور پالیا۔ وہ سن سے ہوگئے۔

’’زا۔۔۔ہدہ۔۔۔‘‘ ہڈیوں کے اس پنجر کے سوکھے ہوئے خشک لب ہلے۔

’’اختر۔‘‘ جیسے کسی زخمی روح نے تڑپ کر سرگوشی کی۔

’’زاہدہ۔۔۔کہاں۔۔۔ہو۔۔۔تم؟‘‘ ایک درد بھری صدا نے اس کا صبر و قرار چھین لیا۔

’’اخ۔۔۔‘‘ آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

’’بیٹی۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی جیسے ہوش میں آ گئے۔ ان کی تحیر زدہ نظروں میں اب درد سا امنڈ آیا تھا۔

زاہدہ بت بنی کھڑی، روتی ہوئی آنکھوں سے سرسوں کے اس پھول کو دیکھے جا رہی تھی جو شاید مرجھانے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش درد، اضطراب، کسک اور تڑپ کے رنگوں میں نئے نئے روپ دھار رہے تھے۔ نرس حیرت بھری نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ تب۔۔۔ آہستہ سے دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ کوئی سامنے چلا آیا۔

’’زاہدہ۔‘‘ حیرت اور یاس میں ڈوبی ایک آواز گونجی۔ چند لمحے حیرت، بے چینی اور آنکھوں کی دھندلاہٹ کی نظر ہو گئے۔ پھر کوئی تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے ایک قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

’’تم۔۔۔تم کہاں تھیں بیٹی؟‘‘

وہ چونک سے پڑی۔ حواس میں آ گئی۔ سنبھل گئی۔

’’آپ؟‘‘ اس کے لبوں سے مری مری آواز نکلی اور ’’بیٹی‘‘ کے لفظ نے اسے پھر حیرت سے گنگ کر دیا۔

’’ہاں بیٹی۔‘‘ چچی آنکھوں سے امنڈنے والے آنسوؤں کو رخساروں پر بہنے سے نہ روک سکیں۔ ’’میں۔ تمہاری مجرم۔ تمہاری گناہ گار۔‘‘

وہ اس کانپتی ہوئی آواز سے ڈر سی گئی۔ لڑکھڑا گئی۔ تب کسی نے اسے سہارا لیا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے رخ پھیر لیا۔

’’میرا بیٹا۔۔۔مر رہا ہے بیٹی!‘‘ ایک کراہ ابھری۔

وہ انہیں گھورتی رہی۔ اپنی بے رحم چچی کو۔

’’اختر تمہارے لئے مر رہا ہے بیٹی۔‘‘ وہ بمشکل بولیں۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔

’’میں ہاتھ جوڑتی ہوں بیٹی۔‘‘ انہوں نے بوڑھے مگر سنگلاخ ہاتھ جوڑ دیے۔

وہ پتھرائی ہوئی بے نوری آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

’’زاہدہ۔‘‘ ایک ماں کی کانپتی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔ مرجھاتے ہوئے گلاب کو خزاں کے جھونکے نے

ہلکورا دیا۔ ”تمہارا اختر مر۔۔۔“ ہچکیاں نامکمل رہ گئیں۔

”زاہدہ۔۔۔ کہاں ہو تم؟“ اختر کے ہونٹ کپکپائے۔

”اختر۔“ وہ مزید نہ سہہ سکی۔ بھاگی۔ لڑکھڑائی اور جا کر اس کے سینے سے لپٹ گئی۔

”زاہدہ۔“ آواز میں زندگی عود کر آئی۔

”اختر۔“ وہ بیقراری سے بولی۔

”تم۔۔۔“ آواز میں درد کم ہوا۔

”میں یہاں ہوں اختر۔ تمہارے پاس۔“ وہ سسک اٹھی۔

”زاہدہ۔“ ایک ہچکی ابھری اور۔۔۔ گردن ڈھلک گئی۔

”اختر۔۔۔“ ایک چیخ لہرائی۔

”یہ بے ہوش ہو چکا ہے بیٹی۔“ ایک اداس سی آواز نے اسے زندگی کی نوید دی۔ ”اس کا کمزور دماغ اس ناممکن حقیقت کو سہہ نہیں سکا۔“ ڈاکٹر ہاشمی کی افسردہ سی آواز ابھری۔

”اسے۔۔۔

”زندگی دینے والا خدا ہے بیٹی۔“ انہوں نے زاہدہ کی بات کاٹ کر اسے بستر سے اٹھایا اور کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ پھر سفید لباس میں ملبوس نرسوں کے ہمراہ ڈاکٹر ہاشمی نے اختر کے بستر کو گھیرے میں لے لیا۔

”تم نے مجھے معاف کر دیا بیٹی۔“ خود غرضی نے نیا روپ دھار لیا تھا۔

”چچی جان۔“ وہ ان سے لپٹ گئی۔

پچیس منٹ پچیس صدیاں بن کر گزرے۔ پھر ڈاکٹر ہاشمی باہر چلے آئے۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔ نرسوں کا ٹولہ بھی کمرے سے نکل گیا۔

اب چچا بھی ان دونوں کے ساتھ تھے۔ نادم نادم سے۔ کھوئے کھوئے سے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے بڑی یاس بھری نظروں سے اسے دیکھا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ وہ بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چچی بھی اس کے پیچھے لپکی۔

”نہیں۔“ چچا نے چچی کو روک لیا اور وہ نجانے کیوں مسکرا دیں۔ مطمئن سی ہو کر۔

”اختر۔۔۔“ اندر وہ اس کے سینے پر سر رکھے روئے جا رہی تھی۔

”زاہدہ۔“ وہ اسے اپنے سینے میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی جی بھر کر ارمان نکال رہی

تھیں۔

☆

وہ۔۔۔ نظریں جھکائے ڈاکٹر ہاشمی کے آفس میں داخل ہوئی۔

چچا اور چچی کے علاوہ وہاں ایک اور ایسی ہستی موجود تھی جس کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ رک گئی۔ چلنے کی سکت ختم ہوگئی۔

اس نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔ خاموشی۔ سناٹا۔ سکوت۔ ہر چہرہ اداس۔ ہر آنکھ نم۔ ہر وجود بے حس و حرکت۔ زاہدہ کی دھڑکن رکنے لگی۔ سانس گھٹنے لگی۔ یہ خاموشی، یہ سناٹا' یہ سکوت۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان گذر چکا ہو اور اپنے پیچھے اپنی تباہی و بربادی کے آثار چھوڑ گیا ہو۔

اس کی نظریں بیگم صاحبہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔ کتنا درد تھا ان میں۔ ان بوڑھے چراغوں میں' جہاں ممتا کی لاش ویرانی کا کفن اوڑھے پڑی تھی۔

وہ دبدبہ' وہ رعب' وہ کرختگی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں۔ سب ختم ہو چکا تھا۔ سب راکھ ہو چکا تھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کا دل کسی انجانے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔

''زاہدہ۔'' ایک سرگوشی ابھری۔

اس نے پلکیں اٹھائیں۔ پتھر کے لبوں پر بڑی زخمی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''ہمارے پاس آؤ۔'' جیسے کسی نے التجا کی ہو۔ وہ ان کی نم آنکھوں میں دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ مسکراہٹ میں خون کی سرخی گہری ہوگئی۔ زخم کا منہ کچھ اور کھل گیا۔

''بیگم صاحبہ۔'' وہ بلکتی ہوئی ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔

انہوں نے پاؤں کھینچے نہیں۔ اسے روکا نہیں۔ اس کی زلفوں میں بوڑھے ہاتھ سے کنگھی کرتی رہیں۔ وہ کتنی ہی دیر ان مشفق قدموں سے لپٹی دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔ پھر انہوں نے آہستہ سے اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''منزل مبارک ہو بیٹی۔'' ان کے لب کپکپائے اور آنکھیں چھلک گئیں۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا۔ بھینچ لیا۔ کتنے ہی گرم گرم موتی ان کے رخساروں سے ٹوٹ کر زاہدہ کی سیاہ گھٹاؤں میں جذب ہوگئے۔ پھر جب انہوں نے اسے سینے سے الگ کیا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی بہت قیمتی شے کھو گئی ہو۔

''ابو۔'' وہ پلٹ کر ڈاکٹر ہاشمی سے لپٹ گئی۔

''بیٹی۔'' وہ اس کا شانہ تھپکتے ہوئے خود بھی بے قابو سے ہو گئے۔ ''میں نے کہا تھا ناں۔ تو میری چند روز کی مہمان بیٹی ہے۔'' ایک باپ دکھی ہو رہا تھا۔

''ابو۔'' وہ مزید کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

پھر اس سسکتی کلی کو اس کے اپنے' ماضی کے دشمنوں اور حال کے دوستوں نے باہوں میں سمیٹ لیا۔ دامن میں بھر لیا۔

''ڈاکٹر ہاشمی۔''

''جی بیگم صاحبہ۔'' وہ سر جھکائے آگے بڑھ آئے۔

''اختر کس حال میں ہے؟''

''یہ اسے گھر لے جا سکتے ہیں بیگم صاحبہ۔ مسیحا ان کے ساتھ ہے۔'' وہ ان کی بات کے جواب میں آہستہ سے بولے۔

بیگم صاحبہ نے اختر کے والدین کی جانب بڑی یاس بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھ گئے۔ بڑے اداس تھے وہ بھی۔ شاید بیٹے کی حالت نے ان کا سارا زہر نکال دیا تھا۔

''ہم کس طرح آپ کا شکریہ۔۔۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ ہم بھی ایک بیٹے کی ماں ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے بڑی دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بس ایک کرم کیجئے ہم پر۔''

''جی۔ آپ حکم کیجئے۔'' چچا کی آواز میں ممنونیت کا دریا بہہ رہا تھا۔

''جتنی جلدی ہو سکے آپ یہاں سے رخصت ہو جائیے۔ طاہر ادھر نکل آیا تو ہم اپنے آپ میں نہ رہ سکیں گے۔''

''جی۔'' چچا اور چچی کے چہروں پر دھواں سا پھیلا جبکہ زاہدہ سرسوں کے پھول جیسی زرد ہو گئی۔

ان سب کے سر جھک گئے۔ احسان کے بوجھ سے۔ پھر وہ رخصت ہونے کے لئے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

''زاہدہ۔'' ایک آواز پر وہ رک گئی۔ پلٹی اور بیگم صاحبہ کی جانب دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم اٹھے۔ وہ ان کے قریب چلی آئی۔

''ہاتھ لاؤ۔''

اور بے ساختہ زاہدہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں چلا گیا۔

''اس پر تمہارا ہی حق تھا۔'' ایک ہیرا اس کی انگلی میں جڑ دیا گیا۔

اس کے ہونٹ لرزے۔ ہاتھ کی مٹھی بھینچ گئی اور پلکوں کے گوشے پھر نم ہو گئے۔

''نہیں۔ اب نہیں۔ کبھی نہیں۔'' ان کے ہونٹوں پر پھر ایک خون رستی مسکراہٹ تیر گئی۔

وہ بے قابو ہو کر پلٹ کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وقت تھم سا گیا!

''ڈاکٹر ہاشمی۔'' ایک شعلہ لرزا۔

''جی بیگم صاحبہ۔'' لو تھرتھرائی۔

''یہ تھا وہ خوف جو ہمیں طاہر اور زاہدہ کے ملاپ سے روکتا تھا۔ ہم جانتے تھے پہلی محبت کبھی بھی زاہدہ کے دل سے نکل نہیں سکے گی۔ اختر کا خیال اسے کبھی بھی طاہر میں پوری طرح مدغم نہ ہونے دے گا۔ اور ڈاکٹر ہاشمی۔ یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے ناں کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ اس لباس میں کسی اور کا پیوند لباس کو لباس نہیں رہنے دیتا' چیتھڑا بنا دیتا ہے اور طاہر چیتھڑے پہن کر زندگی گزار سکتا ہے کیا؟''

جواب میں ڈاکٹر ہاشمی صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔ بیگم صاحبہ کا اندیشہ کتنی جلدی حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا' وہ اس سوچ میں ڈوب گئے۔

☆

کار کا انجن آخری مرتبہ کھانسا اور بے دم ہو گیا۔ وہ ڈیش بورڈ پر پڑا گفٹ پیک سنبھالتا باہر نکل آیا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ کوٹھی دلہن بنی ہوئی تھی۔ بڑی حسین اور امنگوں بھری مسکراہٹ لبوں پر لئے دھیمے سروں میں کوئی پیارا سا گیت گنگناتا وہ داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔

''امی آج بھی کوئی نئی خریدی ہوئی چیز آگے رکھے میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' اس نے سوچا اور بڑے دلکش خیالات میں گم اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''امی۔ آپ۔۔۔؟'' وہ کھڑکی کے کھلے پٹ کا سہارا لئے کھڑی دور کہیں اندھیرے میں گھورتی بیگم صاحبہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ خاموش اسی انداز میں کھڑی رہیں۔ ''اس سردی میں۔ اس وقت تک آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ ان کے قریب چلا آیا۔ بیگم صاحبہ بدستور چپ رہیں۔

''آپ بولتی کیوں نہیں امی؟'' وہ گھبرا سا گیا۔

تب وہ آہستہ سے پلٹیں اور اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا۔ سوجی سوجی آنکھیں جن میں کبھی بھوری چٹانوں کی سی سختی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ زرد رنگت جو ہمیشہ وقار اور دبدبے کے بوجھ سے ابلتے ہوئے خون کی چغلی کھاتی تھی۔ کملایا ہوا چہرہ جس پر پہاڑوں کے عزم اور آسمانوں کی سی عظمت کے سوا کبھی کچھ نہ ابھرا تھا۔

”امی۔“ کسی انجانے حادثے کی وہ منہ بولتی تصویر اس کا صبر و قرار چھین لے گئی۔ ”کیا بات ہے امی؟“ وہ تڑپ اٹھا۔

وہ بڑی درد بھری نظروں سے اس کے معصوم سے خوفزدہ چہرے کو گھورتی رہیں۔

”بولئے امی۔ آپ بولتی کیوں نہیں؟“ وہ بے پناہ بے قراری سے بولا۔

انہوں نے سر جھکا کر رخ پھیرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

”امی۔“ وہ تیزی سے ان کے سامنے چلا آیا۔ ”آپ کو میری قسم امی۔“

انہوں نے بڑے کرب سے پلکیں بھینچ لیں۔ پتھر سے چشمہ پھوٹ نکلا۔ وہ گنگ سا کھڑا ان کی طرف بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”زاہدہ۔۔۔“ ایک سسکی ان کے کانپتے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

”کیا ہوا اسے؟“ وہ بے چینی سے بولا۔

”چلی گئی۔“ ڈاکٹر ہاشمی کی آواز اس کی سماعت کے لئے توپہ شکن دھماکہ ثابت ہوئی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔

گفٹ پیک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چمکدار فرش پر آ رہا۔ سنگ مرمر کا خوبصورت اور بے داغ تاج محل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ بکھر گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے منہ پھیرے کھڑی بیگم صاحبہ اور سر جھکائے ڈاکٹر ہاشمی کو گھورتا رہ گیا۔

کتنی ہی دیر۔۔۔ ہاں کتنی ہی دیر اس اذیت ناک خاموشی کے قبرستان میں ارمانوں کے مزار پر کھڑے گزر گئی۔ بجھتے چراغوں کا دھواں نظروں کی دھندلاہٹ میں بدل گیا۔

”چلی گئی۔۔۔؟“ ایک سپاٹ جذبات سے عاری دھیمی سی صدا ابھری۔

جھکے ہوئے سر اٹھے۔

”بیٹے۔“ بیگم صاحبہ کا دل جیسے پھٹ گیا۔

”اور آپ اسے روک بھی نہ سکے۔“ اس کا لہجہ درد سے پُر تھا۔ بیگم صاحبہ نے تڑپ کر پھر رخ پھیر لیا۔

''وہ کیوں چلی گئی امی؟'' وہ بچوں کی طرح سوال کر بیٹھا۔

''ڈاکٹر ہاشمی۔'' بیگم صاحبہ نے سسک کر صوفے کا سہارا لے لیا۔ ''اسے بتایئے ڈاکٹر ہاشمی' وہ کیوں چلی گئی۔'' ان کی آواز بھیگ گئی۔

''میں جواب آپ سے چاہتا ہوں امی۔'' وہ جیسے کرب سے چیخ اٹھا۔ تڑپ کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''جواب دیجئے۔ وہ کیوں چلی گئی۔ کہاں چلی گئی۔ کس کے ساتھ چلی گئی؟'' وہ ان کو جھنجھوڑتا ہوا چیخ اٹھا۔

''اختر موت کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اسے جانا پڑا۔''

''اختر کا گھر اس کی منزل تھا۔ وہ وہیں لوٹ گئی۔''

''اختر اس کی محبت ہے۔ اسی کے ساتھ چلی گئی۔''

''نہیں نہیں نہیں۔'' وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

نہ جانے کس ضبط سے اس نے اپنے دل کا خون رخساروں پر چھلکنے سے روکا۔ اس کی آنکھیں کتنی ہی دیر بھنچی رہیں' جیسے اسے زہر کے تلخ اور کسیلے گھونٹ حلق سے اتارنا پڑے ہوں۔ جیسے وہ زہر اس کے جسم کی ہر رگ کو کاٹ رہا ہو۔ اس کے ہاتھ مضبوطی سے کانوں پر جمے رہے۔ جیسے اب وہ کچھ سننے کی تاب نہ رکھتا ہو۔ جیسے اب اگر ایک لفظ بھی اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرایا تو وہ ہمیشہ کے لئے سماعت سے محروم ہو جائے گا۔ پھر وہ آہستہ سے پلٹا۔

بیگم صاحبہ دل کو دونوں ہاتھوں میں جکڑے صوفے پر بیٹھتی چلی گئیں۔ کھڑے ہونے کی سکت ہی کہاں رہ گئی تھی ان میں۔

ڈاکٹر ہاشمی نے چہرے پر ابھر آنے والے کرب کو رخ پھیر کر چھپاتے ہوئے صوفے کی پشت کا سہارا لے لیا لیکن وہ ہر ایک سے بے نیاز دھیرے دھیرے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے لرزتے ہوئے بے جان' بے سکت ہاتھ ٹوٹے ہوئے' بکھرے پڑے تاج محل کے ٹکڑوں سے ٹکرائے۔

''تو کیا تاج محل صرف چاندنی راتوں ہی میں محبت کی کہانیاں سنتا ہے۔ اندھیری راتوں میں یہ خود بھی بکھرا رہتا ہے کیا؟'' وہ مرمر کے بے جان ٹکڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔

دھیرے دھیرے اس نے تمام ٹکڑوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ آہستہ سے اٹھا اور ہولے ہولے چلتا ہوا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

''طاہر۔'' بیگم صاحبہ کی غمزدہ آواز نے اس کے قدم روک لئے لیکن وہ پلٹا نہیں۔

ایک لمحے کا وقت معنی خیز خاموشی میں بیت گیا۔

”گھبرائیے نہیں امی۔ ابھی دل دھڑک رہا ہے۔ لاشیں بے گور و کفن بھی تو پڑی رہتی ہیں۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ شبِ پُرنم کی زلفیں کھلتی چلی گئیں۔ شبنم گرتی رہی۔ اور خزاں کا کہر ہر سو پھیلتا چلا گیا۔ پھیلتا چلا گیا۔

☆

سمور کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے دوسرے ہاتھ میں بڑا سا پیکٹ سنبھالے وہ گنگناتی ہوئی آفس میں داخل ہوئی۔ ہر سو ایک بے نام اور خلاف معمول خاموشی کا راج تھا۔ ہر شخص سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھا۔

اس کے خوبصورت ہونٹ ساکت ہو گئے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ہلکی ہلکی الجھن تیرنے لگی۔ ہر وقت قہقہوں میں ڈوبا رہنے والا آفس اداسی میں تہہ نشین تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل پڑی۔ رجسٹر پر جھکی نجمہ اس کے قدموں کی آہٹ پر چونکی۔

’’اوہ۔ امبر۔۔۔‘‘ وہ اس کی جانب دیکھ کر آہستہ سے مسکرائی۔

سر کے اشارے سے سب سے سلام لیتے اور دیتے ہوئے وہ اس کی میز کے قریب پہنچ گئی۔

’’کیا بات ہے بھئی۔ آج گلشن اداس ہے۔‘‘ وہ اس کی میز پر بیٹھ گئی۔

’’آج باس اداس ہیں۔‘‘ نجمہ دھیرے سے بولی۔

’’اداس۔۔۔؟‘‘ وہ چونک پڑی۔

’’ہاں۔‘‘

’’مگر کیوں؟‘‘

’’کوئی نہیں جانتا۔ بس۔ صبح خاموشی سے آئے۔ کسی سے سلام لیا نہ کسی سے بات کی۔ سیدھے آفس میں چلے گئے۔ اب تک وہیں بند ہیں۔‘‘

امبر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ نجمہ اپنا کام نپٹانے لگی۔

’’اچھا۔ میں مل کر آتی ہوں۔ یہ کارڈ آ گئے ہیں۔ یہ دے آؤں۔ شاید کچھ وجہ بھی معلوم ہو جائے اس بے وقت اداسی کی۔ کل تو ان کی شادی ہے۔‘‘

’’ہاں۔ تم سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔ ان کی چہیتی ہو ناں۔‘‘ نجمہ شرارت سے بولی۔

’’تم جلا کرو۔‘‘ وہ پیکٹ ہاتھ میں لئے مسکراتی ہوئی چل دی۔ سب کی نظریں پل بھر کو اٹھیں اور جھک گئیں۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ وہ چونکا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں دروازے سے اندر داخل ہوتی ہوئی امبر پر جم گئیں۔

’’مارننگ سر۔‘‘ اس نے مخصوص لہجے میں کہا اور ساتھ ہی اس کا نرم و نازک ہاتھ ماتھے پر پہنچ گیا۔

’’مارننگ۔‘‘ وہ جیسے بڑبڑایا۔

وہ پل بھر کو ٹھٹکی۔ پھر ہولے ہولے مسکراتی ہوئی اس کی میز کے قریب چلی آئی۔

’’لیجیے سر۔ آپ کے میرج کارڈ۔۔۔‘‘ وہ پیکٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے میز کے کونے سے ٹک گئی۔

اس کی حالت ایکدم بدل گئی۔ چہرے پر زردی اور سرخ آنکھوں میں بے چینی سی پھیل گئی مگر پھر فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔

’’کیا بات ہے سر۔ آپ رات ٹھیک سے سوئے نہیں کیا؟‘‘ وہ گہری نظروں سے اس کی بدلتی ہوئی حالت اور سرخ سرخ آنکھوں کو پرکھتے ہوئے دھیرے سے سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

’’آں۔۔۔ نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ جیسے بڑے ورد سے بادل نخواستہ مسکرایا۔ پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے کارڈز کا پیکٹ چھو کر بھی نہ دیکھا۔

’’سر‘‘ وہ ڈر سی گئی۔ اس کا معصوم دل دھڑک اٹھا۔ یہ بے چینی، یہ اضطراب، یہ کسی چیز کو پوشیدہ رکھنے کی سعی ہے۔ وہ بچی نہیں تھی۔ یہ کسی ایسے ہی کی نشانی ہے۔ اس نے سوچا۔

’’آں۔۔۔‘‘ اس نے سر جھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔

’’سر۔ مجھے لسٹ دے دیجئے۔ میں نام ٹائپ کر دوں۔‘‘ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پریشانی کی وجہ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔

جواب میں اس کے ہونٹوں پر خشک ہونٹوں پر بڑی کرب انگیز مسکراہٹ تیر گئی۔

’’سر۔ آپ کچھ پریشان ہیں؟‘‘ وہ کہتے ہوئے نہ جانے کیوں اس سے نظریں چرا گئی۔

’’ہاں۔ بہت پریشان ہوں امبر۔‘‘ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

’’مجھے بتایئے سر۔ شاید میں آپ کے کچھ کام آ سکوں۔‘‘ وہ بے تابی سے بولی۔

’’تم۔۔۔؟‘‘ وہ خالی خالی نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ ’’ہاں۔ تم میری پریشانی کا خاتمہ کر سکتی ہو۔‘‘ اس کا لہجہ اب بھی ویران سا تھا۔

”کہیے سر۔“ وہ کچھ اور بے چین ہو گئی۔

اس کی نظریں پیکٹ میں بندھے کارڈوں پر جم گئیں۔ ”امبر۔ یہ کارڈ ہیں نا۔۔۔“ وہ ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”یس سر۔“ وہ حیران سی ہو گئی۔

”ان کو۔۔۔ان کو آگ لگا دو امبر۔“ وہ اسی خالی خالی سپاٹ آواز میں بولا۔

امبر پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”امبر۔ انہیں جلا کر راکھ کر دو۔ شعلوں میں پھینک دو۔“ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ۔۔۔ یہ مجھے راس نہیں آئے امبر۔ انہیں یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ کوئی حق نہیں امبر۔“ وہ پیکٹ پر جھپٹ پڑا۔۔۔ چند ہی لمحوں بعد فرش پر ہر سو کارڈز کے پرزے پھیل گئے۔ امبر حیرت بھری پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت دم توڑ گئی۔

”یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟“ وہ سوچتی رہی۔ اور وہ فرش پر بکھرے ان بے جان پرزوں کو ویران، سرخ سرخ شب بیدار آنکھوں سے تکتا رہا۔

”بیٹھ جاؤ امبر۔ کھڑی کیوں ہو؟“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

وہ کسی بے جان مشین کی طرح کرسی پر گر گئی۔ اس کی نظریں اب بھی طاہر کے ستے ہوئے چہرے پر جمی تھیں۔

”سر۔“ کتنی ہی دیر بعد دھیرے سے اس نے کہا۔ طاہر نے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کیسے ہوا سر؟ کیوں ہوا؟“ اس کی آواز بے پناہ اداسی لئے ہوئے تھی۔

”ریگی۔“ وہ بڑے کرب سے ہنسا۔

”سر۔ وہ تو آپ کے ساتھ۔۔۔“

”دو دن بعد شادی کرنے والی تھی۔“ اس نے امبر کی بات کاٹ دی۔

”جی سر۔ اور پھر یہ انکار۔۔۔“

”وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی امبر۔“ وہ مسکرایا۔ بڑے عجیب سے انداز میں۔

”سر۔۔۔“

”ہاں امبر۔ اس کا محبوب موت کی دہلیز پر کھڑا اسے پکار رہا تھا۔ وہ زندگی بن کر اس کے پاس واپس لوٹ گئی۔“

”اور آپ۔۔۔؟“ وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

”ابھی تک زندہ ہوں۔ نہ جانے کیوں؟“ وہ پھر مسکرایا۔

اور نہ جانے کیوں امبر کا جی چاہا۔ وہ رو دے۔ لاکھ ضبط کے باوجود اس کی پلکوں کے گوشے نم ہو گئے۔

”ارے۔۔۔“ وہ اسے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم رو رہی ہو۔“ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ ”پگلی۔ تم سن کر رو دیں۔ میں تو سہہ کر بھی خاموش رہا۔“

”سر۔ آپ ہمارے لئے کیا ہیں؟ آپ نہیں جانتے۔ آپ کی ذرا سی خاموشی اور اداسی نے سارے آفس پر موت کا سا سناٹا طاری کر دیا ہے۔ کیوں؟ کیوں سر؟“ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”امبر۔“ وہ اس کی کانپتی آواز کے زیر و بم میں کھو کر رہ گیا۔

”صرف اس لئے سر کہ آپ۔۔۔ آپ اس آفس کے چپڑاسی سے لے کر مینجر تک کے لئے کسی دیوتا سے کم نہیں ہیں۔ پُر خلوص، بے لوث، بے پناہ محبت کرنے والا دیوتا۔ آپ نے اپنے آفس میں ان بیروزگاروں کو، اپنے والدین، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کے واحد سہاروں کو اس وقت پناہ دی، جب وہ مایوسی کی باہوں میں سما جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ آپ کے دکھ درد، آپ کی مسرت کو آپ سے زیادہ محسوس کرتے ہیں سر۔ آپ اداس ہوں تو اس چھوٹے سے گلستاں کا ہر باسی مرجھا جاتا ہے۔ آپ خوش ہوں تو ان کی زندگی میں بہار رقصاں ہو جاتی ہے۔ یہ سب آپ کے سہارے، آپ کی مسکراہٹوں کے سہارے جیتے ہیں سر۔ آپ پر اتنا بڑا حادثہ، اتنا بڑا سانحہ گزر جائے اور ہم پتھر بنے مرجھائے ہوئے بے حس پھولوں کی طرح آپ کو تکتے رہیں۔ کیسے سر؟ ہم یہ کیسے کریں؟“

”چپ ہو جاؤ امبر۔ چپ ہو جاؤ۔“ اس نے گھبرا کر اس کے کانپتے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں۔۔۔ میں تو پاگل تھا۔ دیوانہ تھا۔ مجھے ایک فرد کی محبت نے، ایک تھوڑی سی محبت نے اتنی ڈھیر ساری محبت، اتنے بہت سوں کے پیار سے پل بھر میں، کتنی دور پہنچا دیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم لوگ مجھے اتنا چاہتے ہو۔ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہو۔ بخدا امبر۔ میں اب بالکل اداس نہیں ہوں۔ بالکل پریشان نہیں ہوں۔ میں۔۔۔ میں تو مسکرا رہا ہوں۔ ہنس رہا ہوں۔ میرے اتنے سارے اپنے ہیں۔ ایک بیگانہ چلا گیا تو کیا ہوا؟ کیا ہوا امبر؟ کچھ بھی تو نہیں؟ پھر میں کیوں اداس رہوں؟ میں کیوں افسوس کروں۔ دیکھو۔ میں مسکرا رہا ہوں امبر۔ میں ہنس رہا ہوں۔ ہنس رہا ہوں۔ ہاہا۔ ہاہا۔ میں ہنس رہا ہوں امبر۔ دیکھو۔ ہاہاہا۔ میں ہنس رہا ہوں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہاہا۔“ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ پاگلوں کی طرح رقت آمیز انداز میں ہنستا چلا گیا۔ بالکل دیوانوں کی مانند۔ پھر جب مزید قہقہے لگانے کی سکت ہی نہ رہی تو اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالکل رک گئی۔ امبر نے دیکھا۔ اس کے لب اب بھی مسکراہٹ کے انداز میں وا تھے اور آنکھوں کی نمی چھلکنے کو

تھی۔

''سر۔'' اس کی آواز تھرا گئی۔ ''دکھ بھرے قہقہوں سے دل کے زخم بھرنے کی بجائے کچھ اور کھل جایا کرتے ہیں۔'' وہ پلٹ کر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ باہر جمع ہجوم اسے روک نہ سکا۔ وہ دوڑتی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔

☆

زندگی۔۔۔ کسی ویرانے کی طرح اداس' کسی بے زبان کی طرح خاموش اور کسی لاش کی طرح سرد ہوتی چلی گئی۔

بہار کچھ اس انداز سے رخصت ہوئی تھی کہ خزاں نے گلشن میں ہر سو ڈیرے ڈال لئے۔ جیسے ہمیشہ کو اس نے یہ کھوکھلا چمن خرید لیا ہو۔

زندگی۔۔۔ ہاں' اگر سانس کی آمد و رفت کو زندگی کہتے ہیں تو وہ واقعی زندگی تھی' جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ گھسٹ رہی تھی۔ اس کے سوکھے ہوئے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ ابھرتی تھی لیکن یہ مسکراہٹ کتنی کرب آلود ہوتی تھی۔ وہ اب بھی قہقہے لگاتا تھا مگر ان قہقہوں میں کتنی چیخیں چھپی ہوتی تھیں' یہ وہ خود بھی جانتا تھا۔

بیگم صاحبہ!

ہر وقت کھوئی کھوئی اور حسرت بھری نگاہوں سے اسے تکا کرتیں۔ وہ ان ویران سے جلتے بجھتے چراغوں کی سسکتی ہوئی روشنی سے دامن بچا کر گذر جاتا۔

وقت گزرتا رہا۔ انجانی رفتار سے۔ یوں ہی دو سال گزر گئے۔

ایک بیگانہ اپنا بنتے بنتے رہ گیا تھا اور کتنے بیگانے پل بھر میں اپنے بن گئے۔ وہ سوچتا اور پھر نجانے کیوں ہنس دیتا' بڑے کرب سے۔ وقت اگر زخم دے کر مرہم نہ رکھے تو اس دنیا سے زندگی اور موت' دونوں کا وجود ناپید ہو جائے۔ ختم ہو جائے۔

پُرسکون جھیل میں پتھر گرا۔ لہریں کناروں سے پھر پھر کر ٹکرائیں بھنور ابھرے۔ گرداب پھیلے لیکن جب پتھر اس جھیل کی تہہ میں بے جان بوجھ بن کر رہ گیا۔ ایک خلش بن کر پڑ رہا' تو لہریں پھر سمٹ گئیں۔ بھنور دم توڑ گئے۔ گرداب سکوت پذیر ہو گئے۔ جھیل کے ساکت پانی میں پھر ایک کنول کھلا۔

اور اس کنول کا نام تھا۔۔۔ امبر۔ اس کی خوبصورت پرسنل سیکرٹری۔

خلوص اور ہمدردی کا منہ بولتا پیکر' جس نے اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔ اسے زندگی کے سامنے چٹان بن

جانے کا عزم بخشا۔ جو مسلسل اس کے خزاں آلود گلشن میں اپنی پیاری پیاری مسکراہٹوں کے پھول کھلا رہی تھی۔

وہ چپکے سے اپنی ناکام خواہش کے مندر میں اسے دیوی بنا کر بٹھانے کی سوچنے لگا جبکہ وہ اس کی ہر سوچ سے بے خبر تھی۔ ہر خیال، ہر فیصلے، ہر تصور سے بے بہرہ تھی۔ اسے تو بس ایک ہی بات سے غرض تھی کہ وہ اسے ہر وقت خوش رکھے۔ اسے قہقہے لگاتا دیکھتی رہے۔ اسے ایک ہی دھن تھی کہ اس کا باس ہر وقت مسکراتا رہے اور یہ اسی کی عنایت تھی کہ آج زاہدہ کے دیے ہوئے زخم پر کھرنڈ جم چکا تھا۔ ٹیسیں اٹھنا بند ہو گئی تھیں۔ ہاں، کبھی کبھی زخم کے گرد دل کو چلتی ہوئی میٹھی میٹھی جان لیوا خارش سی ہوتی۔ یادوں کی سرخی ابھر آتی تو وہ بے چین ہو اٹھتا اور اس اضطراب آلود کیفیت سے اس وقت بھی اسے صرف اور صرف امبر کی من موہنی ہستی نجات دلاتی۔

کبھی پکچر، کبھی لنچ، کبھی ڈنر اور کبھی سارے آفس کے ساتھ ایکدم بن جانے والا پکنک پروگرام۔ یہ سب امبر ہی کی نوازشیں تھیں۔ وہ مالک اور ملازم کے دائرے سے نکل کر دوستی کے حلقے میں داخل ہو چکے تھے۔

زندگی پھر کروٹ لینے کو پر تول رہی تھی۔ وقت کا بوڑھا ہاتھ داستانِ حیات کا ایک اور ورق الٹنے کو متحرک ہو رہا تھا۔

جھیل کی سطح پر ہر سو پھیلی کہر چھٹنے لگی۔ دھند کی چادر چاک ہونے لگی۔ دھواں وقت کی فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ جھیل میں ایک پُر زور لہر نے طوفان سا بپا کر دیا۔ جیسے ایک ناکام تمنا اپنی منزل کو سامنے پا کر بے قابو ہو جائے۔ وہ آگے بڑھی۔ پورے زور سے۔ پھر رک گئی۔ ناکامی، شکست اور ماضی۔ ایک سوال ایک ٹیس بن کر اس کے ذہن میں ابھرے اور حواس پر چھاتے چلے گئے۔ اس کا جوش دم توڑ گیا۔ ہوش آنے لگا۔

’’منزل تمہارے پاس خود چل کر نہ تو آئے گی۔‘‘ سوچ نے کہا۔

’’میں تمہارے ساتھ ہوں۔‘‘ دل سے صدا ابھری۔

اور مسافر کے قدم بے اختیار راستے پر اٹھ گئے۔

منزل دور نہ تھی مگر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی آمد سے بے خبر، گہری نیند سو رہی تھی۔ بے خبری کی نیند۔ وہ امید کا دامن تھامے، قدم بہ قدم آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆

راستہ طویل نہ تھا مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بے تحاشا لپک کر منزل کا دامن تھام لیتا۔

انتظار۔۔۔ ہاں اسے انتظار کرنا تھا۔

ابھی تو اسے منزل، سوئی سوئی منزل، بے خبر منزل کے بارے میں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اسے اپنا مسافر بھی

تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ ابھی تو یہ سب خواب تھے۔ سراب تھے۔

اس نے کتنی ہی مرتبہ کوشش کی اور کئی بار اس کی زبان پر آ کر دل کی بات رک گئی۔ وہ مضطرب سا ہو جاتا۔ پہلو بدل کر رہ جاتا۔ بے چینی اس کے رگ و پے میں بجلی بن کر سرایت کر جاتی مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ جذبات بے زبان حیوان کی طرح سرکشی پر اترتے رہے۔ احساس چوٹ کھائے ہوئے پرندے کی مانند پھڑ پھڑ اتا رہا۔ بہار، خزاں کے قفس میں سر ٹکراتی رہی لیکن کب تک؟ آخر وہ لمحہ بھی آیا جب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ اذیت کی تپش اسے ہر پل، ہر گھڑی، خشک لکڑی کی طرح جلانے لگی۔ وہ کسی ویرانے میں سلگتی ہوئی اس شمع کی طرح پگھلنے لگا جس کا کوئی پروانہ نہ تھا۔

شمع، پروانے کو جلائے بغیر خود جلتی رہے۔ پگھلتی رہے۔ یہ وہ کب گوارا کر سکتی ہے؟ یہی اس کے ساتھ ہوا۔ ضبط انتہا کو پہنچ کر دم توڑ گیا۔ پیمانہ لبریز ہوا اور چھلک پڑا۔

’’میں آج امبر کو سب کچھ بتا دوں گا۔۔۔ سب کچھ۔‘‘ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

’’صاحب۔ ناشتے پر بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔‘‘ سیف نے اسے چونکا دیا۔

’’تم چلو۔ میں آ رہا ہوں۔‘‘ اس نے بستر سے نکلتے ہوئے کہا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا۔ ناشتہ خاموشی سے کیا گیا۔ ملازم نے میز صاف کر دی۔ وہ اخبار دیکھنے لگا۔

بیگم صاحبہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ ان کا داہنا ہاتھ سامنے پڑے سفید لفافے سے کھیلنے میں مصروف تھا۔

’’اوہ۔ دس بج گئے۔‘‘ وہ اخبار رکھ کر رسٹ واچ پر نظریں دوڑاتے ہوئے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

’’بیٹھ جاؤ۔‘‘ بیگم صاحبہ کی دھیمی سی آواز نے اسے بے ساختہ پھر بٹھا دیا۔ ان کی سوچ زدہ آنکھوں میں سنجیدگی کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کا دل بے طرح سے دھڑک اٹھا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

’’جی امی۔‘‘ اس نے خاموشی کا دامن چاک کیا۔

’’بیٹے۔‘‘ اداس سی آواز ابھری۔ ’’ہم چاہتے ہیں کہ زندگی کا دامن چھوڑنے سے پہلے تمہیں زندگی کی خوشیوں میں کھیلتے دیکھ لیں۔ اب ہم مزید پتھر کی یہ سل اپنے دل پر برداشت نہ کر سکیں گے۔‘‘

وہ سر جھکائے ناخنوں سے میز کی سطح کریدتا رہا۔

’’زندگی میں ناکامیاں بھی آتی ہیں بیٹے لیکن اس لئے نہیں کہ انسان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے بلکہ اس لئے کہ اگلے امتحان میں پچھلی ناکامی کی کسر بھی نکال دے۔ ایک تمنا پوری نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انسان آرزو

کرنا ہی چھوڑ دے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سنبھلنے کے لئے جتنا وقت درکار ہوتا ہے ہم اس سے بہت زیادہ وقت تمہیں دے چکے ہیں۔ ہر ماں کی طرح ہماری بھی تمنا ہے کہ ہم اپنے بیٹے کے پہلو میں چاندی بہو دیکھیں۔'' وہ ایک لمحے کو رکیں۔

اس کا جھکا ہوا سر تب بھی جھکا ہی رہا۔

''کئی ایک گھروں سے رشتے آئے ہیں۔ ہم نے ابھی کسی کو جواب نہیں دیا۔ صرف تمہاری خاطر۔''

تب اس نے دھیرے سے چہرہ اوپر اٹھایا۔ تھوڑا تھوڑا مضطرب لگ رہا تھا وہ۔

''ہم تمہیں فیصلے سے پہلے انتخاب اور پسند کا پورا پورا موقع دیں گے۔'' انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنے سامنے پڑا لفافہ اس کی جانب سرکا دیا۔ ''اس میں کچھ تصویریں ہیں۔ زاہدہ کی چچا زاد بہن نرگس کی بھی۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولیں۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''وہ خاص طور پر اس رشتے کے خواہش مند ہیں۔ لڑکی چند ہی روز پہلے انگلینڈ سے واپس آئی ہے مگر اس پر مشرقی اقدار پوری طرح حاوی ہیں۔''

''مگر میں۔۔۔''

''شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' تلخی سے کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''یہی جواب ہے ناں تمہارا۔''

''جی نہیں۔ میں نے یہ کب کہا۔''

''تو پھر؟'' وہ حیرت سے بولیں۔

''کیا ضروری ہے کہ ان ہی میں سے اور پھر خاص طور پر نرگس ہی سے۔۔۔''

''ہم سمجھتے ہیں بیٹے لیکن ہم نے یہ بات ایسے ہی نہیں کہی۔ نرگس واقعی گل نرگس ہے۔ زاہدہ اور اس لفافے میں موجود کوئی بھی لڑکی اس کے سامنے ہیچ ہے۔''

''لیکن۔۔۔''

''کہیں تم کسی اور کو تو۔۔۔''

''یہ بات نہیں ہے امی۔'' وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے پھر بے چین سا ہو گیا۔

''دیکھو بیٹے۔ تم کیوں یہ چاہتے ہو کہ تم محبت کی شادی کرو۔ کیا ضروری ہے کہ جس سے تم شادی کرو وہ شادی سے پہلے تم سے محبت کرے۔'' وہ کھل کر کہہ گئیں۔

''میں نے ایسا کب کہا امی۔'' اس کی آواز دب سی گئی۔

''پھر کیا تم یہ چاہتے ہو کہ شادی سے پہلے تم اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ محبت کے چار دن ضرور گزارو۔''

''ایسی بھی میری کوئی شرط نہیں ہے امی۔''

''تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟'' ان کی آواز میں تلخی ابھر آئی۔

''امی۔'' اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''میں نے ایک زخم کھایا ہے۔ ایسی لڑکی کو چن لیا جو پہلے ہی کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ اب میں ایسے کسی حادثہ سے دوچار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں مجھے جو لڑکی بیوی کے روپ میں ملے وہ صرف میری ہو ہر طرح سے۔ اس کے خیالوں پر اس کی سوچ پر میرے سوا کسی اور کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہو۔''

''شریف گھرانوں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں بیٹے۔ اور یہ سب تصویریں شرفا کی بیٹیوں ہی کی ہیں۔''

''زاہدہ بھی تو شریف گھرانے ہی سے تعلق رکھتی تھی امی۔''

''بیٹے۔'' وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔ ''محبت ایسا جذبہ ہے جس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ زاہدہ نے اگر ایسا کیا تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہاری جلد بازی اور میری ممتا نے مل کر ایک ایسی غلطی کو جنم دیا جس کا خمیازہ ہم دونوں کو بھگتنا پڑا۔''

''یعنی۔۔۔؟'' اس نے سوالیہ انداز میں ماں کی جانب دیکھا۔

''ہمیں پہلے زاہدہ کے بارے میں پوری چھان بین کرنی چاہئے تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ وہ لڑکی دھوکے باز نہیں تھی ورنہ اگر وہ کوئی چالباز ہوتی اور واردات کی نیت سے آئی ہوتی تو ہم اس کے چکر میں پھنس کر اب تک مال اور عزت دونوں گنوا چکے ہوتے۔''

''تو اب آپ جس لڑکی سے بھی میری شادی کرانا چاہتی ہیں اس کے بارے میں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ وہ مجھ سے پہلے کسی اور کے ساتھ انوالو نہیں رہی؟''

بات چیت بڑی کھل کھلا کر ہو رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اپنے مزاج کے خلاف اس صورتحال کا بڑے حوصلے اور برداشت کے ساتھ سامنا کر رہی تھیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بات کو کسی منطقی انجام تک لے جانا چاہتی تھیں۔

''تم اگر چاہو تو جس لڑکی کو پسند کرو اس کے ساتھ تمہاری ملاقات کرائی جا سکتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لو سمجھ لو۔ پھر کسی فیصلے پر پہنچ سکو اس کا یہ بہت اچھا راستہ ہے۔''

''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ لڑکی ہمارے امیر گھرانے میں شادی کے لئے مجھ سے اپنا ماضی نہیں چھپائے

گی ۔ جھوٹ نہیں بولے گی ۔‘‘

’’اب وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا بیٹے ۔ تم ایک ہی چوٹ کھا کر تمام طبیبوں سے بدظن ہو گئے ہو ۔ اس طرح تو زندگی نہیں گزر سکتی ۔‘‘

’’اور پھر ایک آدھ ملاقات میں ہم ایک دوسرے کو کیسے مکمل طور پر جان لیں گے ۔‘‘

’’تو کیا اب سالوں کے سال چاہئیں تمہیں بیوی منتخب کرنے کے لئے ؟ تم کھل کر کیوں نہیں کہتے ' جو تمہارے دل میں ہے ؟‘‘ وہ جھنجھلا گئیں ۔

’’میں ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔‘‘ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی ۔

’’کسی کو پسند کر چکے ہو کیا ؟‘‘ وہ اس کی جانب غور سے دیکھ کر بولیں ۔

’’جی ۔ ۔ ۔ جی ہاں ۔‘‘ سرگوشی سی ابھری ۔ وہ جوتے کی ٹو سے فرش کریدنے لگا ۔

’’ہوں ۔ کون ہے وہ ؟‘‘ ان کے لہجے سے کچھ بیزاری ' ناگواری اور ناپسندیدگی ظاہر تھی ۔

’’امبر ۔ ۔ ۔‘‘ وہ اسی طرح بولا ۔

’’کون امبر ؟‘‘

’’میری اسٹینو ۔‘‘

’’طاہر ۔ ۔ ۔‘‘ وہ بے پناہ کڑواہٹ سے بولیں ۔

’’وہ بڑی اچھی لڑکی ہے امی ۔‘‘ وہ بمشکل تمام کہہ سکا ۔

’’زاہدہ بھی تو بری نہیں تھی ۔‘‘ وہ تلخی سے بولیں ۔

’’مگر امی ۔ ۔ ۔‘‘

’’ہم جانتے ہیں ۔ ڈائیلاگ تمہاری زبان پر دھرے رہتے ہیں ۔ ہمیں قائل کرنے کے لئے تم ایڑی چوٹی کا زور لگا دو گے لیکن یہ سوچ لو طاہر ۔ ہم بار بار ایک ہی زخم نہ کھا سکیں گے ۔‘‘ وہ تلخی سے شکست خوردگی پر اتر آئیں ۔

’’نہیں امی ۔ آپ ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔‘‘

’’جاؤ ۔ اس وقت ہمیں تنہا چھوڑ دو ۔ ہم ماں ہیں ۔ جوان اولاد کی خوشی پر ایک مرتبہ پھر اپنی انا قربان کر رہے ہیں لیکن یاد رکھنا طاہر ۔ یہ آخری بار ہو رہا ہے ۔ اس کے بعد ہم داؤ لگائیں گے نہ بساط کے مہرے کی طرح پٹنے پر تیار ہوں گے ۔‘‘

’’شکریہ امی جان ۔ میری جیت بھی تو آپ ہی کی جیت ہے ۔‘‘ وہ اپنی خوشی کو دباتے ہوئے بمشکل کہہ سکا ۔

”بس جاؤ۔ ہم کل ہی اس لڑکی کے گھر جانا چاہیں گے۔“

”جی۔ مگر۔ اتنی جلدی۔۔۔“ وہ ہکلایا۔

”بکو مت۔ ہر بات میں اپنی منوانے کے عادی ہو چکے ہو۔ بس۔۔۔ کل ہم امبر کے گھر جا کر اسے دیکھنا چاہیں گے۔“

”جی۔۔۔ بہتر۔“ وہ خفیف سا ہو گیا۔ چند لمحے کھڑا رہا۔ بیگم صاحبہ پھر کسی خیال میں کھو گئی تھیں۔ وہ آہستہ سے پلٹا اور خارجی دروازے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اس کے قدموں میں لرزش اور اضطراب نمایاں تھا۔

☆

”اوہ۔ ساڑھے گیارہ ہو گئے۔“ وہ ٹہلتے ٹہلتے رکا اور وقت دیکھ کر بڑبڑایا۔ اس کی بے چینی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ قدموں نے پھر قالین کی سینہ کوبی شروع کر دی۔ امبر ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس نے کبھی اتنی دیر نہیں کی تھی۔ اور پھر بغیر اطلاع۔ اس کا دل بار بار کسی نئے اندیشے کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا۔

”اگر وہ آج نہ آئی تو؟“

”نہیں نہیں۔ وہ ضرور آئے گی۔“ وہ بڑبڑایا اور نظریں پھر رسٹ واچ پر پھسل پڑیں۔ ”بارہ۔“ اس کے بے چین اور بے قرار خیالات کے سانس اکھڑنے لگے۔

اس کے متحرک قدم رکے۔ داہنا ہاتھ تیزی سے کال بیل کی جانب لپکا۔ دوسرے ہی لمحے نادر کمرے میں تھا۔

”یس سر۔“

”دیکھو۔ مس امبر ابھی تک۔۔۔“ الفاظ اس کے لبوں پر دم توڑ گئے۔ دروازے سے امبر اندر داخل ہو رہی تھی۔

”جاؤ۔ تم جاؤ۔“ وہ جلدی سے بولا اور نادر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

”مارننگ سر۔“ وہ شوخی اور شرارت سے بھرپور آواز میں آدھے سلام کے ساتھ بولی۔

”ہوں۔۔۔“ وہ اس کے خوبصورت اور سڈول جسم کو دیکھتا ہوا اس کے گلاب ایسے کھلے ہوئے چہرے پر آ کر رک گیا۔ ”یہ مارننگ ٹائم ہے۔“ وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے سینے میں جیسے کسی نے ہلچل مچا دی۔

”سر۔۔۔ وہ۔۔۔ بات ہی ایسی تھی۔“ وہ شرما سی گئی۔

”بات۔۔۔ کیسی بات؟ اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“ وہ اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھ کر جلدی سے بولا۔

”یہ۔۔۔ یہ سر۔۔۔“ وہ گڑبڑا سی گئی۔ قوس قزح کے حسین لہریے اس کے حسین چہرے پر پھیلتے چلے گئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ وہ اس کی پیشانی پر ابھرتے پسینے کے قطروں کو دیکھ کر الجھن میں پڑ گیا۔

”کیا بات ہے امبر؟“ وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

”سر۔۔۔ وہ۔۔۔“ وہ جیسے کہہ نہ پا رہی تھی۔

”ارے بولو نا۔ پھر مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔“

”تو پہلے آپ بتائیے۔“ وہ اسے دیکھ کر بڑے پیارے انداز میں مسکرائی۔

”اوں ہوں۔ پہلے تم۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

”تو سر۔ پہلے آپ۔۔۔ انتظار آپ کر رہے تھے میں نہیں۔“ وہ شوخی سے بولی۔

اور اس کا دل جیسے پسلیوں کا قفس توڑ کر سینے سے باہر آ جانے کو مچلنے لگا۔ ”میں تو۔۔۔“ وہ خود گڑبڑا گیا۔

”ہوں۔ کوئی خاص ہی بات ہے۔“ وہ پھر شرارت پر اتر آئی۔

”امبر۔ وہ۔ میں۔۔۔“ جسم میں ابلتا ہوا لاوا جیسے سرد پڑنے لگا۔ اچھا بیٹھو تو۔“ وہ کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں۔ بیٹھ گئی۔ تو پھر بھاگنے میں دقت پیش آئے گی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا مطلب؟“

”بات ہی ایسی ہے سر۔“ وہ پھر شرما گئی۔

”ہوں۔“ وہ اسے بڑی عجیب اور تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

”بتائیے نا سر۔“ وہ اس کے انداز پر کچھ جھینپ سی گئی۔

”امبر۔“ وہ کچھ دیر بعد بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ ”امبر۔ اگر کوئی کسی کو پسند کرنے لگے تو؟“ اس کی پیشانی بھیگ سی گئی۔

”تو اسے اپنا لے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ بڑی لاپرواہی سے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

طاہر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بدستور مسکراتی رہی۔

”لیکن اگر کوئی اس بات سے بے خبر ہو کہ اسے کوئی پسند کرتا ہے۔ اسے اپنانا چاہتا ہے۔ تب؟“

”تب اسے بتا دے۔“ اس نے سیدھا سا نسخہ بتایا۔ اور وہ جھلا گیا۔

”بڑی آسان بات ہے ناں۔“ اور وہ اس کے جھنجلانے پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ بڑے پیار سے اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔

”دیکھو امبر۔ فرض کرو۔“ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ ”فرض کرو۔ کوئی تمہیں پسند کرتا ہے۔“ اس کی زبان لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے رہ گئی۔

فقرہ ختم کر کے اس نے امبر کی جانب دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گالوں پر حیا کی سرخی ضرور ابھر آئی تھی۔ اس کا حوصلہ جیسے دوچند ہو گیا۔

”تمہیں چاہتا ہے۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔ لیکن تم۔۔۔ تم اس سے بے خبر ہو۔ تمہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو۔“

”لیکن ہم بے خبر نہیں ہیں سر۔“ وہ شرارت بھرے انداز میں کہہ کر بے طرح شرما گئی۔

”امبر۔“ اس کا سینہ پھٹنے لگا۔ دماغ چکرا کر رہ گیا۔ ”تو کیا؟“ مسرت اس کے انگ انگ میں ناچ اٹھی۔

”لیس سر۔ یہ رہا اس کا ثبوت کہ ہم بے خبر نہیں تھے۔ ہم بھی کسی کو چاہتے تھے۔“ وہ پل بھر کو رکی۔ اس کا ہاتھ پشت پر سے سامنے آیا جس میں ایک سفید لفافہ دبا ہوا تھا۔ ”اور اسے حاصل بھی کر سکتے ہیں۔“ اس نے لفافہ طاہر کے ہاتھ میں تھمایا اور شرم سے سرخ رُو پلٹ کر بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

”امبر۔“ اس کے لبوں سے ایک سرگوشی ابھری اور امبر کے پیچھے فضا میں تحلیل ہو گئی۔ بہاریں ناچ اٹھیں۔ دھڑکتا ہوا دل جھوم سا گیا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور۔۔۔ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اندھیرا اور روشنی جیسے پوری قوت سے آپس میں ٹکرا گئے۔ رات اور دن ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ آسمان اور زمین نے جگہیں بدل لیں۔ ہر شے درہم برہم ہو گئی۔

وہ بے جان سے انداز میں کرسی پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی بے اعتبار نگاہیں لفافے سے نکلنے والے کارڈ پر ٹھہری گئیں۔

وہ امبر کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔

اس کی امبر، اس کی اپنی امبر، کسی دوسرے کی امانت تھی، یہ تو اسے معلوم ہی نہ تھا۔ پگلا تھا ناں۔ ہر پسند آ جانے والی شے کو حاصل کر لینے کی خواہش نے اسے ایک بار پھر ناکامی اور محرومی کا داغ دیا تھا۔ پہلی بار جلد بازی نے ایسا کیا تھا اور دوسری بار شاید اس نے خود دیر کر دی تھی۔

خاموشی۔ اداسی۔ سناٹا۔ اور وہ۔ کتنے ہی لمحوں تک باہم مدغم رہے۔ شاید صدیوں تک۔

’’امبر۔‘‘ آخر ایک سسکی اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ ساکت آنکھوں کے گہرے اور ہلچل زدہ سمندر نے دھندلاہٹ کے گرداب سے چند موتی پلکوں کے کناروں پر اچھال دیے۔ موتی دعوت نامے پر چمکتے ’’امبر‘‘ کے لفظ پر گرے اور پھیل گئے۔ لفظ کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا۔

اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے حرکت کی اور لرزتے لبوں نے پہلی اور آخری بار مہرِ تمنا ’’امبر‘‘ کے لفظ پر ثبت کر دی۔

☆

’’سیف بابا۔ طاہر ابھی تک نہیں آیا۔‘‘ بیگم صاحبہ نے ناشتے کی میز پر اخبار بینی سے اکتا کر کہا۔

’’جی۔ میں دیکھتا ہوں۔‘‘ وہ ادب سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ اکتائی اکتائی نظریں پھر گھسی پٹی خبروں پر دوڑانے لگیں۔

’’السلام علیکم امی جان۔‘‘ وہ دھیرے سے کہہ کر اندر داخل ہوا۔

انہوں نے جواب دے کر آہستہ سے اس کی جانب دیکھا اور بے ساختہ چونک اٹھیں۔ وہ ان کی نظروں کی چبھن سے گھبرا گیا۔ نگاہیں جھکا کر اپنی سرخ سرخ آنکھوں پر پردہ ڈالتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

وہ بغور اس کا جائزہ لیتی رہیں۔ تنا ہوا چہرہ۔ شب بیداری کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سرخ سرخ انگارہ آنکھیں۔ جیسے بہت بڑا سیلاب روکے بیٹھی ہوں۔ تھکے تھکے قدم۔ جواری کے سب کچھ ہار جانے کا پتہ دے رہے تھے۔ ’’مگر کیوں؟‘‘ وہ اس کا جواب ڈھونڈنے میں ناکام رہیں۔

’’تم نے ابھی کپڑے نہیں بدلے؟‘‘ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی زبان سے نکلا۔

’’ناشتے کے بعد بدل لوں گا امی۔‘‘ وہ آہستہ سے بولا اور اخبار پر نظریں جما دیں۔

’’طاہر۔‘‘ ان کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

’’جی۔‘‘ وہ سنبھل گیا۔

’’کیا بات ہے؟‘‘

’’کچھ بھی تو نہیں امی۔‘‘ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

’’واقعی۔۔۔؟‘‘ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولیں۔

وہ نگاہیں چرا کر رہ گیا۔ ’’جی۔۔۔ جی ہاں امی۔ کوئی خاص بات نہیں۔‘‘

''ناشتہ کرو۔'' وہ چائے دانی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

''میں صرف چائے پیوں گا۔''

اور بیگم صاحبہ کا توس والی پلیٹ کی جانب بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ ایک لمحے کو انہوں نے سر جھکائے بیٹھے مضطرب اور بے چین بیٹے کی جانب دیکھا۔ پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ انہوں نے بھی صرف چائے کے کپ پر اکتفا کیا۔ خاموشی گہری ہوتی گئی۔ خالی کپ میز پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھہرو۔'' ایک تحکم آمیز آواز نے اسے بت بنا دیا۔

''جی۔'' وہ پلٹے بغیر بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

اور وہ کسی بے جان شے کی طرح پھر کرسی پر گر پڑا۔

''کل ہم نے تم سے کچھ کہا تھا۔''

''جی۔'' اضطراب کی حالت میں پہلو بدل کر وہ ایک نظر ان کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔

''لیکن اب ہم نے اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر دی ہے۔''

''جی۔'' وہ کچھ بھی نہ سمجھا۔

''ہم لڑکی کے گھر جانے سے پہلے اسے کہیں اور ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''امی۔'' وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ پُرسکون انداز میں اسے دیکھتی رہیں۔ ''تمہیں اعتراض ہے کیا؟''

''مجھے۔۔۔ نہیں تو امی۔''

''تو جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ آفس چلیں گے۔'' ایک ہتھوڑا سا اس کے ذہن پر برسا۔

''مگر امی۔۔۔'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''ہم اسے آج۔۔۔ ابھی۔۔۔ اسی وقت دیکھنے جانا چاہتے ہیں۔''

''چند روز رک نہیں سکتیں آپ؟'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

''وجہ؟'' بڑے جابرانہ انداز میں استفسار کیا گیا۔

''اسے۔۔۔'' وہ ایک پل کو رکا۔ ''دلہن بنا دیکھ لیجئے گا اسے۔''

''ہم سمجھے نہیں۔'' وہ واقعی حیرت زدہ رہ گئیں۔

اور جواب میں طاہر کا ہاتھ گاؤن کی جیب سے باہر نکل آیا۔ اس سے کارڈ لیتے ہوئے ان کا ہاتھ نجانے کیوں کانپ گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ یہ دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی کہ کارڈ دیکھ کر بوڑھی چٹان ایک مرتبہ پھر لرز کر رہ گئی تھی۔

''طاہر۔'' ماں کے لبوں پر ایک آہ مچلی اور نظروں کے سامنے دھوئیں کی دیوار بن کر پھیل گئی۔ وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنے لرزتے ہاتھوں میں کپکپاتے اس پروانہ مسرت کو دیکھ رہی تھیں جو ان کی ہر خوشی کے لئے زہر بن گیا تھا۔

''یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہوا میرے بدنصیب بیٹے۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کب تک ہوتا رہے گا؟'' کتنی ہی دیر تک ایک بے جان بت کی مانند بیٹھے رہنے کے بعد وہ آہستہ سے بڑبڑائیں۔

''جب تک میری ہر دھڑکن تنہائی اور محرومی سے آشنا نہیں ہو جاتی۔ تب تک یہ ہوتا رہے گا امی۔'' وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔

وہ اسے دکھی نظروں سے گھورتی رہ گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ نجانے کس طرح؟

''اللہ حافظ امی۔'' وہ دروازے کی جانب پلٹ گیا۔

وہ تب بھی پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔ خاموش اور بے حس و حرکت مجسمے کی مانند۔ کسی سحر زدہ معمول کی طرح۔ بالکل ایسے۔ جیسے غیر معمولی صدمے کے سحر نے ایک جاندار کو بے جان شے میں تبدیل کر دیا ہو۔

☆

''بنو۔ ان دنوں باہر نہیں نکلا کرتے۔ درخواست ہی دینا تھی تو مجھے کہہ دیا ہوتا۔'' رضیہ نے شرارت سے امبر کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا اور اس کے لبوں سے سسکی نکل گئی۔

''ارے۔ درخواست کا تو صرف بہانہ ہے۔ اس کا گھر پر دل ہی کہاں لگتا ہے۔ غلامی سے پہلے جی بھر کر آزادی منا لینا چاہتی ہے۔'' انجم نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا تو وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''ہائے۔ یہ شب بیدار آنکھیں ضرور ہمارے دولہا بھیا کی شرارتوں کی تصویریں بناتے بناتے سرخ ہوئی ہیں۔ واللہ۔ محبت ہو تو ایسی ہو۔'' نجمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ باقی تینوں نے بھی اسی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''دیکھو۔ خدا کے لئے مجھے بخش دو۔'' اس نے فریادیوں کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر ان سے پیچھا چھڑانے کی

کوشش کی۔

''اوں ہوں۔ بی بی۔ ہم سے تو آج کل میں پیچھا چھڑا لو گی مگر وہ جو تمام عمر تمہارے پیچھے لٹھ لئے بھاگتے پھریں گے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' نجمہ نے کہا تو وہ شرم سے لجا کر رہ گئی۔

''ہائے۔ اب ہمارے صاحب کا کیا بنے گا؟ وہ تو دیوداس بن کر رہ جائیں گے۔ پھر یہ آفس امپورٹ ایکسپورٹ کے بجائے تان سین کا ڈیرہ بن کر رہ جائے گا۔'' رضیہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے کہا۔

''بکومت۔'' وہ ایکدم سنجیدہ ہو گئی۔ ''مذاق میں بھی ان کے بارے میں ایسی بیہودہ گفتگو مت کیا کرو۔'' اس نے جھیا سے ڈانٹ دیا۔

''اے فلسفہ بیگم۔'' انجم نے اس کے بازو پر زور سے چٹکی لی۔ ''مذاق کو اتنا سیریس کیس مت بنایا کرو۔ ہم بھی جانتی ہیں کہ وہ تمہارے لئے ہی نہیں ہمارے لئے بھی دنیا میں شاید ماں باپ کے بعد سب سے زیادہ قابل احترام ہستی ہیں۔ ہم تم سے زیادہ چاہتے ہیں انہیں۔'' اور سب کی سب مسکرا دیں۔

''ارے۔ صاحب آ گئے۔'' اچانک نجمہ نے دروازے کی جانب اشارہ کیا تو وہ چاروں سنبھل کر کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت وہ سب امبر کے کیبن میں تھیں۔

''بی پجارن۔ دیوتا کا سواگت کرو ناں جا کر۔ ان کے چرنوں میں اپنی ایپلی کیشن کے پھول چڑھاؤ۔ انکار تو وہ کر ہی نہیں سکیں گے۔'' رضیہ نے اسے کہنی سے ٹھوکا دے کر آہستہ سے کہا۔

''بکومت۔'' وہ جھینپ سی گئی۔

طاہر پل بھر کو ہال میں رکا۔ لڑکیوں کی تمام سیٹیں خالی دیکھ کر ایک لمحے کو اس نے کچھ سوچا۔ پھر اپنے آفس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ تمام لوگ اس کے کمرے میں جاتے ہی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

''چلو۔ اب اپنا اپنا کام کرو جا کر۔ میری جان بخشو۔'' وہ اپنا خوبصورت چھوٹا سا شولڈر بیگ اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھی۔

''جی ہاں۔ اب آپ مندر جا رہی ہیں۔'' نجمہ نے شرارت سے کہا اور سب کا مشترکہ ہلکا سا قہقہہ گونج کر رہ گیا۔

''بکتی رہو۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

''چلو بھئی۔ وہ تو گئی۔ اب کام شروع کریں۔ سیزن کے دن ہیں۔ بہت کام ہے۔'' وہ سب بھی چل دیں۔

دروازہ دھیرے سے کھلا ''مارننگ سر۔'' وہ اندر آتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''اوہ۔ امبر تم ۔۔۔ آؤ آؤ۔'' وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ امبر دھڑکتے دل کے ساتھ نظریں جھکائے آگے بڑھی اور ایک کرسی کی پشت تھام کر کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو۔'' وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اور نجانے کیوں نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا۔

امبر نے کچھ کہنے کے لئے چہرہ اوپر اٹھایا' لب کھولے مگر اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر شرما گئی۔ اس کا سر پھر جھک گیا۔ پھر وہ آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اپنی سیٹ پر چلا آیا۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر امبر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''سر۔''

''ہوں۔'' وہ پیپر ویٹ سے کھیلتے کھیلتے رک گیا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے مسکرا کر امبر کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جی ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ سر۔'' وہ ہکلا گئی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' وہ ہنس دیا۔ ''شادی ہر لڑکی کی ہوتی ہے۔ شرم و حیا ہر لڑکی کا زیور ہوتا ہے لیکن تم تو سب پر بازی لے گئیں۔''

وہ سر جھکائے بیر بہوٹی بنی ناخن سے شیشے کی ٹاپ کریدتے ہوئے' نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس کی آواز کی مٹھاس میں گم ہو گئی۔

''اور پھر اپنوں سے کیا شرمانا امبر۔ ہم نے ایک عرصہ ساتھ گزارا ہے۔ اچھے دوستوں' اچھے ساتھیوں کی طرح۔'' وہ ایک پل کو رکا۔ ''ہاں۔ اب کہو۔ لیکن شرمانا نہیں۔'' وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولا تو وہ شرمیلی سی ہنسی ہنس دی۔

''سر ۔۔۔ یہ ۔۔۔'' اس نے بیگ کھول کر ایک کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ اسے تھامتے ہوئے حیرت سے بولا۔

''ایپلی کیشن سر۔''

''کیسی ایپلی کیشن؟''

''چھٹی کی سر۔''

''ارے چھوڑو بھی۔'' اس نے ایک جھٹکے سے اس کے دو اور پھر چار ٹکڑے کر کے باسکٹ میں پھینک دیے۔

''سر مگر ۔۔۔''

”آفس کی کارروائی مکمل کرنے کے لئے ایسے تکلفات کی ضرورت ہوتی ہے امبر۔۔۔ لیکن تم ان ملازموں میں شمار نہیں ہوتیں جن کے لئے ایسی کارروائیوں کا اہتمام لازم ہو۔ تم نے جس طرح میرے ساتھ مل کر THE PROUD جیسے پراجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے‘ اس کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم ایسے تکلفات میں وقت ضائع کیا کریں۔“

”سر۔“ حیرت اور مسرت سے اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

”ہاں امبر۔ میں نے اس آفس کے ہر فرد کو اپنا سمجھا ہے۔ اپنا جانا ہے اور تم۔۔۔ تم تو وہ ہو‘ جو میری زندگی اور موت کے درمیان سینہ تان کر آ کھڑی ہوئی تھیں۔“ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ”تم نے ایک مرتبہ مجھے دیوتا کہا تھا امبر لیکن مجھے ایسا لگتا ہے‘ دیوی تم ہو۔ پیار کی۔ وفا کی۔ رفاقت کی۔ تم میرے لئے ایک ایسی مخلص دوست ہو امبر‘ جس کے ہر پل کی رفاقت مجھ پر احسان ہے۔ اور دوستوں میں‘ محبت کرنے والوں میں یہ رسمیں بڑی بور لگتی ہیں۔ لگتی ہیں نا۔“ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ اس پر جھک سا گیا۔

”سر۔“ اس کی آنکھوں میں تشکر امڈ آیا۔

”پگلی۔“ وہ ہولے سے مسکرایا اور سیدھا ہو گیا۔ ”کتنے دنوں کی چھٹی چاہیے تمہیں؟“ وہ شریر سے لہجے میں بولا۔

اور امبر نے ناخنوں سے میز کی سطح کو کریدتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ”ایک۔۔۔ ایک ہفتے کی سر۔“ وہ بمشکل کہہ پائی۔

”ہا۔۔۔۔ س۔“ وہ لفظ کو کھینچ کر بولا۔ ”آج دس تاریخ ہے۔“ وہ کلائی پر بندھی گھڑی میں تاریخ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بارہ کو شادی ہے۔ دو دن یہ گئے۔ اور باقی بچے صرف پانچ دن۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے رکا۔ ”ارے۔ صرف پانچ دن۔“ وہ حیرت اور بھولپن بھری شرارت سے اس کے سامنے ہاتھ کھول کر نچاتے ہوئے بولا۔

”سر۔۔۔“ وہ جھینپ سی گئی۔ طاہر زور سے ہنس دیا۔

”تمہیں ایک ماہ کی رخصت دی جاتی ہے۔“ وہ شاہانہ انداز سے بولا۔

”مگر سر۔۔۔“

”کچھ نہیں۔ کوئی بات ہے بھلا۔ شادی ہو اور صرف پانچ دن بعد پھر ڈیوٹی سنبھال لی جائے۔“

”مگر میں کچھ اور کہہ رہی تھی سر۔“

”ہاں ہاں۔ کچھ اور کہو۔ بڑے شوق سے کہو۔“

”وہ سر۔۔۔وہ۔۔۔وہ نہیں چاہتے کہ میں شادی کے بعد بھی جاب کروں۔“ وہ بڑے اداس لہجے میں بولی۔

اور۔۔۔اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ ایک پل کو اس کے چہرے پر جیسے خزاں کا رنگ بکھر گئے مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ اس کے کانپتے لبوں پر ایک کرب آلود مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے ہونٹوں کو زور سے بھینچ لیا اور یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے کسی انجانی صدا پر لبیک کہہ رہا ہو۔ پھر وہ آہستہ سے نامحسوس مگر درد بھرے انداز میں ہنس دیا۔

”ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔“ وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ اٹھا۔ ”پھر۔۔۔کب سے ہمارا ساتھ چھوڑ رہی ہو؟“ وہ پھر مسکرا دیا۔

”آپ کا ساتھ تو مرتے دم تک رہے گا سر۔ دوستوں سے ایسی باتیں نہ کیا کیجئے۔“ وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

وہ چند لمحوں تک اسے عجیب نظروں سے گھورتا رہا۔ ”اس کا مطلب ہے۔“ وہ پہلو بدل کر بولا۔ ”کہ تم صرف یہی مہینہ ہمارے ساتھ ہو جس کے دس دن گزر چکے ہیں۔“

”یس سر۔“

”ہوں۔“ وہ بجھ سا گیا۔ ”ٹھیک ہے امبر۔“ کچھ دیر بعد وہ ایک طویل اور سرد آہ بھر کر گویا ہوا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی تمہیں بھول نہ سکے گا۔“

”سر۔“ اس کی آواز تھرا گئی۔

”ارے ہاں۔“ وہ بات بدل گیا۔ ”یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارے وہ کرتے کیا ہیں؟“

اور جذبات کے ریلے میں بہتی ہوئی امبر ساحلِ حواس پر آ گری۔ ”وہ کالج میں لیکچرار ہیں سر۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہوں۔“ وہ پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔

”آج کی ڈاک سر۔“ نادر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا اور ڈاک میز پر رکھ کر واپس لوٹ گیا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ڈاک ایک جانب سرکا کر اس نے امبر کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور جھک گئیں۔

”امبر۔“

”یس سر۔“

”میں کچھ کہوں۔ برا تو نہ مانو گی۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ سر۔“

''امبر۔۔۔ میں۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ ''میں تمہاری شادی میں نہ آسکوں گا۔''

''کیوں سر؟'' وہ تڑپ سی گئی۔

''مجھے گاؤں جانا ہے امبر۔ وہاں نجانے کتنے دن لگ جائیں۔'' اس نے بڑی ہمت کر کے جھوٹ بولا۔ ''لیکن میں اس سے پہلے تمہارے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دینا چاہتا ہوں امبر۔''

''سر۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ مگر۔ آپ۔۔۔''

''مجھے احساس ہے امبر۔ لیکن یقین کرو وہ کام انتہائی اہم اور وقت طلب ہے کہ میں مجبور ہو گیا ہوں۔'' وہ میز کے کونے پر بیٹھ گیا۔ ''دیکھو۔ تم جس طرح چاہو میں تم سے معذرت کرنے کو تیار ہوں لیکن خدارا' مجھ سے خفا مت ہونا۔ تم کہو تو میں اپنا کام چھوڑ کر تمہاری خوشی میں شریک ہونے کو چلا آؤں گا لیکن تم مجھ سے ناراض مت ہونا۔'' وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اداس اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔

''نہیں سر۔ میں آپ سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں؟ آپ اپنا کام التوا میں مت ڈالئے لیکن اس کے لئے آپ کو میری بھی ایک بات ماننا پڑے گی۔''

''ہاں ہاں' کہو۔''

''شادی کے بعد میں آپ کے اعزاز میں ایک پارٹی دوں گی جس کے لئے آپ کوئی بہانہ نہ بنا سکیں گے۔''

وہ چند لمحوں تک اس کی پُر امید آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' وہ میز سے اٹھ گیا۔ وہ کھل اٹھی۔

''لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا سر؟'' بے تابی سے اس نے پوچھا۔

''پارٹی یہاں' اسی آفس میں دی جائے گی۔ تمام انتظام میرا ہو گا اور تم اور تمہارے وہ مہمان خصوصی ہوں گے۔''

''بالکل نہیں سر۔'' وہ مچل سی گئی۔ ''پہلی بات تو ٹھیک ہے لیکن باقی دونوں باتیں غلط ہیں۔ پارٹی ہم دیں گے اور مہمان آپ ہوں گے۔''

''غلط۔ بالکل غلط۔ جا تم رہی ہو۔ اور الوداعی پارٹی جانے والے کے اعزاز میں دی جاتی ہے۔ لہذا میرا حق پہلے بنتا ہے۔''

''وہ حق تو آپ پارٹی دے کر استعمال کر ہی رہے ہیں سر۔''

''نہیں۔ یہ رسمی پارٹی ہے۔ بعد کی پارٹی اعزازی اور خاص ہو گی۔''

’’سر۔‘‘ وہ جیسے ہارتے ہارتے جیت کی امید پر بولی۔ ’’سب کچھ تو آپ لے گئے سر۔ ہمارے ہاتھ کیا آیا؟‘‘ اس نے منہ بنا کر کہا۔

’’تمہارے حصے میں ہماری دعائیں، ہماری محبتیں، ہمارے جذبات یعنی یہ کہ خدا کرے تم اور تمہارے ’’وہ‘‘ پھلو پھولو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ ہماری خوشیاں بھی خدا تمہیں دے دے۔ وغیرہ وغیرہ۔‘‘

’’سر۔‘‘ اس نے شرما کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ پھر کچھ دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

’’اب میں چلوں گی سر۔‘‘ وہ سر جھکا کر بولی۔

اور جیسے طاہر کے دل کو کسی نے مٹھی میں مسل ڈالا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اسے گھورتا رہا۔ زاہدہ بھی تو یوں ہی گئی تھی۔

’’جاؤ۔‘‘ اس کے لب کپکپا گئے۔

اس نے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں۔

’’سر۔‘‘ پلکوں پر تیرتے موتی لرز گئے۔ طاہر پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کر رہ گیا۔ پھر اس کی پلکوں کے گوشے بھی نم ہو گئے۔ شاید ضبط کا آخری بند ٹوٹنے کو تھا۔

’’اللہ حافظ۔‘‘ اس نے بے ساختہ اسے شانوں سے تھام کر کہا۔

’’سر۔‘‘ وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔

’’پگلی۔‘‘ اس کا جی چاہا۔ اسے باہوں میں سمیٹ کر سینے میں چھپا لے۔ پوری قوت سے بھینچ لے مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے پھسل کر دروازے کو چل دی۔

ہارا ہوا جواری، اپنے غلط داؤ پر اس مرتبہ بھی پٹ گیا تھا اور اب شاید اس کا دامن، ہر آرزو، تمنا اور خواہش سے خالی ہو چکا تھا۔ اسی لئے تو وہ اپنی غیر متوقع ہار کا انجام دیکھ کر اتنے تلخ انداز میں مسکرایا تھا کہ اس کے جذبات پر ناامیدی کی ایک سرد تہہ جمتی چلی گئی تھی۔

وہ آفس سے نکل آیا۔ بے مقصد ادھر ادھر کار بھگائے پھرتا رہا، جو لمحہ بہ لمحہ سپیڈ پکڑتی جا رہی تھی۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں تیزی سے پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک پر منجمد تھیں۔ ذہن، دل، خیالات، جذبات۔ ایک جنگ تھی جو اس کی سوچ اور احساس کے مابین شدت سے جاری تھی۔

’’تم پھر ہار گئے۔‘‘

’’جیت تمہاری تقدیر میں نہیں۔‘‘

’’تم زندگی بھر یونہی تنہائیوں میں بھٹکتے رہو گے۔‘‘

’’تمہارا دامن محبت سے سدا خالی رہے گا۔‘‘

’’تم ساری عمر تشنہ رہو گے۔‘‘

’’تم سراپا ہار ہو۔ اپنے لئے‘ اپنی ہر آرزو کے لئے‘ اپنی ہر تمنا کے لئے‘ اپنے ہر جذبے کے لئے۔ داؤ لگانا چھوڑ دو۔ تم اناڑی جواری ہو۔ تمہاری خواہشات کی تاش کا ہر پتہ بے رنگ ہے۔ بے وفا ہے۔‘‘

’’کوئی نہیں آئے گا جو تمہیں اپنے دل کے نہاں خانے میں محبت کے نام پر سجالے۔ تم دیوتا ہو۔ انسان نہیں۔ لوگ تمہارا احترام تو کرتے ہیں‘ تم سے محبت نہیں کرتے۔ کسی کی محبت تمہارے مقدر میں لکھی ہی نہیں گئی۔‘‘

’’تم بن منزل کے لٹے پٹے مسافر ہو۔ منزل کی تلاش چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ منزل کی تلاش چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔‘‘

کار کے بریک پوری قوت سے چیخے اور بھاگتی ہوئی کار الٹتے الٹتے بچی۔

گھر آچکا تھا۔

وہ یوں ہانپ رہا تھا‘ جیسے میلوں دور سے بھاگتا آیا ہو۔ چہرہ پسینے میں شرابور اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیرنگ پر سخت ہوتی چلی گئی۔ پھر اس نے اپنا سر اسٹیرنگ پر دے مارا۔ کتنی ہی دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر آہستہ سے اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اب وہ بالکل پُرسکون تھا۔ طوفان تھم گیا تھا۔ بادل چھٹنے لگے تھے۔ اس کے ہاتھ کو حرکت دی۔ ہارن چیخ اٹھا۔

چند لمحوں بعد گیٹ کھل گیا۔ وہ کار اندر لیتا چلا گیا۔ کار کو گیراج میں بند کر کے وہ داخلی دروازے سے ہال میں رکے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

’’صاحب۔ بیگم صاحبہ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔‘‘ سیف بابا نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

’’ان سے کہو‘ مجھے بھوک نہیں۔ وہ کھا لیں۔‘‘ اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

’’صاحب۔ وہ تبھی سے بھوکی ہیں جس دن سے آپ نے کھانا چھوڑ رکھا ہے۔‘‘

’’کیا۔۔۔؟ تمہارا مطلب ہے انہوں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔‘‘

’’جی ہاں صاحب۔ ایسا ہی ہے۔‘‘

وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم صاحبہ سر جھکائے میز پر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ اس کے

آنے کی آہٹ سن کر انہوں نے سر اٹھایا۔

”امی۔۔۔“ وہ بے تابی سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ سر جھک گیا۔ آہستہ سے آگے بڑھ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحوں تک اسے بڑی درد بھری نظروں سے گھورتی رہیں۔

”کھانا کھائیے امی۔“ پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے وہ ان کی نظروں کی چبھن سے گھبرا گیا۔

ایک طویل سانس لے کر انہوں نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں نے خاموشی سے اور بہت کم کھایا۔ سیف نے میز صاف کر دی۔ طاہر نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ انہوں نے ایک طائرانہ نظر اس پر ڈالی۔

”جاؤ۔ سو جاؤ جا کر۔ رات کافی جا چکی ہے۔“

اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر۔۔۔ نظریں ملتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ آہستہ سے اٹھ کر چل دیا۔ پھر رکا۔ ایک نظر پلٹ کر دیکھا۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ تب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”پگلا کہیں کا۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائیں اور کسی گہری سوچ میں ڈوبتی چلی گئیں۔

☆

آج پورے سات دن بعد وہ آفس آیا تھا۔ یہ دن اس نے گھر پر اپنے کمرے میں قید رہ کر گزارے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ نادر کب کا ڈاک دے کر جا چکا تھا مگر اس نے اس کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

”ٹر۔ ر۔ رن۔ ٹرن۔ ٹرر۔ رن۔“ ٹیلی فون کی چیختی ہوئی آواز نے اس کے سکوت کا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔

”ہیلو۔“ ریسیور کان سے لگاتے ہوئے اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

”مارننگ سر۔“ ایک دلکش اور خوبصورت جانی پہچانی آواز سن کر وہ چونکا۔

”امبر۔۔۔“ اس کے لرزتے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ ”ہیلو امبر۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”کیسے ہیں سر؟“ وہ چہکتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔

”ٹھیک ہوں۔ وہ مسکرایا۔ ”تم کہو۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا ناں۔“

”آپ کی عدم موجودگی بڑی بری طرح محسوس کی جاتی رہی سر؟“

”ہوں۔“ وہ ہولے سے پھر مسکرا دیا۔ ”میں تو وہیں تھا امبر۔ تم نے محسوس ہی نہیں کیا۔“

”ایسا نہ کہیے سر۔“ وہ بات سمجھ نہ سکی اور جلدی سے بولی۔

’’اور کہو۔ تمہارے ’’وہ‘‘ کیسے ہیں؟‘‘ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شگفتگی سے بولا۔

’’سر۔‘‘ وہ شاید شرما گئی تھی۔ طاہر نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا۔ ’’آپ فارغ ہیں آج شام کو؟‘‘ کچھ دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔

’’کیوں۔ کوئی خاص بات؟‘‘ اس کا دل دھڑکا۔

’’آپ بتایئے ناں سر۔‘‘ وہ مچلی۔

’’کوئی اہم مصروفیت تو نہیں ہے مجھے۔‘‘ وہ سوچ کر بولا۔

’’تو بس۔ آج رات کا کھانا آپ ہمارے ہاں ہمارے ساتھ کھا رہے ہیں۔‘‘

’’مگر امبر۔‘‘ وہ گڑبڑا گیا۔

’’دیکھئے سر۔ انکار مت کیجئے۔ پہلے ہی آپ بہت زیادتی کر چکے ہیں۔‘‘

’’تمہارے ’’وہ‘‘ بھی ہوں گے؟‘‘

’’ان ہی کا تو حکم ہے۔‘‘

’’تو اس کا مطلب ہے تم مجبوراً بلا رہی ہو۔‘‘ وہ ہنس پڑا۔ ’’اگر وہ نہ کہتے تو۔۔۔‘‘

’’کیسی باتیں کرتے ہیں سر؟‘‘ وہ بے چین سی ہو گئی۔ ’’وہ تو انہوں نے۔۔۔‘‘

’’اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ مذاق کر رہا تھا۔ میں پہنچ جاؤں گا۔‘‘

’’سات بجے تک پہنچ جایئے گا۔‘‘

’’اور کون کون انوائٹ ہے؟‘‘ اس نے بات اڑا دی۔

’’آج کی شام صرف آپ کے نام ہے سر۔‘‘ سن کر وہ مسکرا دیا۔

’’تو پھر آپ آ رہے ہیں ناں؟‘‘

’’حلف اٹھا لوں۔‘‘ طاہر نے کہا تو امبر ہنس دی۔

’’اچھا سر۔ شام تک اللہ حافظ۔‘‘ اس نے اسے اپنے سسرالی مکان کا پتہ لکھوا کر کہا۔

’’اللہ حافظ۔‘‘ اس نے دھیرے سے کہا۔ امبر نے رابطہ کاٹ دیا مگر وہ کتنی ہی دیر تک ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا۔

’’سر۔ دستخط کر دیں۔‘‘ کلرک نے اس کے سامنے فائل رکھتے ہوئے کہا تو طاہر نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور فائل پر نظریں دوڑانے لگا۔ پھر قلم اٹھایا اور دستخط

کر دیے۔ وہ فائل لئے باہر نکل گیا تو اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں موند لیں۔

سوچیں۔ لامتناہی سوچیں۔ تنہائی۔ ویران تنہائی اور وہ خود۔

یہی تو تھی اس کی مختصر اور محدود سی دنیا۔

☆

کار آہستگی سے رکی۔ وہ باہر نکلا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ چھوٹی سی خوبصورت کالونی تھی۔ ایک ایک دو دو منزلہ عمارتیں بڑی ترتیب اور خوبی کے ساتھ کھڑی کی گئی تھیں۔ ٹی شرٹ اور پتلون میں وہ بیحد سمارٹ لگ رہا تھا۔ سر کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے وہ چل پڑا۔ پانچ چھ مکان چھوڑ کر وہ ایک دو منزلہ خوبصورت اور بالکل نئے مکان کے دروازے پر رک گیا۔

''پروفیسر قمر واصف۔'' اس نے نیم پلیٹ پر نظر دوڑائی اور ڈگریاں پڑھے بغیر ہی کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ کسی کے تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور دروازہ کھل گیا۔

''ایوننگ سر۔'' وہی مخصوص پیارا سا انداز۔ امبر کا ہاتھ ماتھے پر تھا۔

وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

''آیئے سر۔'' امبر کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ چونک پڑا۔ بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ایوننگ۔'' دھیرے سے کہہ کر اس نے قدم بڑھایا۔

وہ اسے لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ ''آپ بیٹھئے سر۔ میں ان کو خبر کرتی ہوں۔'' وہ نظریں چرا کر باہر نکل گئی۔

وہ دل کا درد دل میں دبائے صوفے پر بیٹھ گیا۔ سرسری نظر سے سجے سجائے دیدہ زیب اور دلکش ڈرائنگ روم کا جائزہ لے کر وہ جانے کیا سوچنے لگا۔

''السلام علیکم۔'' ایک مردانہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ دروازے سے امبر ایک مرد کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور۔۔۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ سارا بدن جھنجنا اٹھا۔ اسے ہر شئے گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ حیرت اور اضطراب کے ملے جلے جذبات سے لبریز نظریں پروفیسر قمر کے چہرے پر گڑی گئیں۔ وہ حواس میں آیا تو اس وقت جب پروفیسر قمر نے اس کے غیر ارادی طور پر آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ بڑی گرمجوشی تھی اس کے مصافحے

میں لیکن۔۔۔ اس کی حیرت زدہ نگاہیں اب بھی نوجوان گورے چٹے پروفیسر قمر کے چیچک زدہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

’’مجھے قمر کہتے ہیں۔‘‘ وہ مسکرایا۔ ’’پروفیسر قمر۔‘‘

’’میں۔۔۔ طاہر۔۔۔‘‘ اس کی آواز جیسے بہت دور سے آئی۔ امبر سر جھکائے ان دونوں کے قریب کھڑی تھی۔

’’بیٹھیے بیٹھیے۔ آپ کھڑے کیوں ہیں؟‘‘ قمر خوش اخلاقی سے بولا تو وہ کچھ سنبھلا۔ سب لوگ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

’’امبر تو ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی ہے۔‘‘

’’جی۔‘‘ وہ غیر محسوس انداز میں مسکرایا۔ ’’یہ تو اس کی محبت ہے۔‘‘

’’لگتا ہے آپ اپنے ہر ورکر کے دل و دماغ پر ثبت ہو چکے ہیں۔ شادی کے روز آپ کے سٹاف کے تقریباً تمام لوگ موجود تھے اور کوئی زبان ایسی نہ تھی جو آپ پر اپنی والہانہ عقیدت کے پھول نچھاور نہ کر رہی ہو۔‘‘

’’جی۔ بس یہ تو ان سب کا پیار ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری شخصیت کیا؟‘‘ وہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

پھر پروفیسر قمر ہی باتیں کرتا رہا۔ وہ ہوں ہاں کر کے اس کی باتوں سے لاتعلقی پر پردہ ڈالتا رہا اور امبر ناخن کریدتی رہی۔

’’ارے بھئی امبر۔ وہ چائے وائے۔‘‘ کچھ دیر بعد قمر نے امبر کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’اوہ۔۔۔ میں ابھی پتہ کرتی ہوں۔‘‘ وہ اٹھی اور طاہر کی طرف دیکھ کر باہر نکل گئی۔

’’میں ابھی حاضر ہوا طاہر صاحب۔‘‘ قمر بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ کر باہر نکل گیا۔

اور۔۔۔ اس کا سلگتا ہوا ذہن جلتے ہوئے دل کی تپش سے بھڑک اٹھا۔ ’’یہ۔۔۔ یہ کیا تھا؟ یہ کیا ہے؟ کیا یہ تھی امبر کی محبت۔ امبر کی پسند۔ امبر کی زندگی کا ساتھی۔ اس کا شریک حیات۔ کیا یہ ممکن تھا؟ کیا یہ ممکن ہے؟‘‘ اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ رگیں تن گئیں۔

’’آیئے سر۔‘‘ امبر کمرے میں داخل ہوئی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھیں امبر پر چنگاریاں سی برسانے لگیں۔ ’’امبر۔۔۔‘‘ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

امبر کے معصوم لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ اس کے قریب چلی آئی۔ ’’میں جانتی ہوں سر۔ سمجھتی ہوں۔ لیکن۔۔۔‘‘ وہ ایک پل کو رکی۔ ’’محبت اسی کا نام ہے سر۔ کہ اسے وفا کی راہوں پر چلتے ہوئے روحوں

کے سنگم پر پالیا جائے۔ جسموں اور چہروں کی خوبصورتی اور حسن فانی چیزیں ہیں۔ اصل حسن تو خوبصورت جذبوں میں پلتا ہے اور اسے دیکھنے کے لئے من کی آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آنکھیں تو اکثر دھوکا دے جاتی ہیں جو ہم چہروں پر سجائے پھرتے ہیں۔ جیسے آپ نے فریب کھایا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہتی رہی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ تکتا رہا۔

"میں جانتی ہوں سر۔ آپ کے ذہن میں کتنے ہی سوال چکرا رہے ہیں۔ لیکن۔۔۔" وہ بڑے پُرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پھر گویا ہوئی۔ "لیکن یہ سوال آپ کی سوچ کے کسی گوشے میں پیدا نہیں ہونا چاہئیں سر۔ اس لئے کہ میں نے جو کچھ پایا، جو کچھ سیکھا' آپ سے پایا' آپ سے سیکھا۔ سر۔ قمر کا چہرہ داغدار ہوا تب ہمیں نئے نئے پیمان باندھے ہوئے بہت تھوڑے دن ہوئے تھے لیکن ان کے لاکھ انکار' دور ہونے کی التجا' بھول جانے کی فریاد کے باوجود میں نے ان کو سنبھال لیا۔ اس لئے کہ اگر یہی حادثہ ہماری شادی کے بعد پیش آتا تب کیا ہوتا؟ کیا اس وقت بھی میں ان کا ساتھ چھوڑ دیتی۔ ضرور چھوڑ دیتی سر۔ ضرور چھوڑ دیتی' اگر میں ان سے محبت نہ کرتی ہوتی مگر ہم نے تو ٹوٹ کر چاہا تھا ایک دوسرے کو۔ میں اگر ان کی بات مانتے ہوئے ان سے ناطہ توڑ لیتی تو جانتے ہیں کیا ہوتا؟ وہ خودکشی کر لیتے۔ اس لئے کہ کسی سے دور ہونے، دور رہنے کا فیصلہ کر لینا بہت آسان ہے مگر اسے نبھانے کے لئے پتھر بن جانا پڑتا ہے سر۔ اور انسان پتھر بن جائے تو اس میں اور کسی لاش میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ محبت کے مارے ناکام ہو جائیں یا جان بوجھ کر محرومی کو گلے لگا لیں تو بہت کم ایسے ہوں گے جو زندگی کی لاش ارمانوں کی خارزار راہوں پر گھسیٹنے پر تیار ہوں۔ جیسے آپ۔۔۔ مگر آپ تو سب سے مختلف ہیں۔ انسانوں سے مختلف ہیں۔ بلند ہیں۔ اس لئے کہ آپ دیوتا ہیں۔ خلوص کے۔ وفا کے دیوتا۔" وہ ایک لمحے کو رکی' پھر کہا۔ "اور یہی سوچ کر میں نے قمر کو اپنا لیا۔ قمر جو گہنا گیا تھا مگر تھا تو قمر۔ شکستہ آئینے تو ویسے بھی دل والوں کے لئے انمول ہوتے ہیں سر۔ ان میں اپنے چہرے ان کو بڑے صاف و شفاف دکھائی دیتے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

طاہر کے لبوں پر لرزتی مسکراہٹ کسی مزار پر جلتے دیے کی مانند تھرتھرا اٹھی۔

"میں نے ٹھیک کیا ناں سر؟" عجب معصومیت سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے امبر نے پوچھا۔

دھیرے سے طاہر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"سر" وہ مسکرائی۔ ہونٹ لرزے اور اس کی پلکوں کے گوشے نم ہو گئے۔ "میں جانتی تھی آپ میرے فیصلے پر اثبات کی مہر ثبت کرتے ہوئے ایک پل کی دیر نہیں کریں گے۔ میں ٹھیک کہتی ہوں سر۔ آپ دیوتا۔۔۔"

اور طاہر نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے قبل ہی نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بڑے پیار سے' آہستگی سے اس نے کہا۔

''تم۔۔۔ تم دیوی ہو۔'' اس کی تھرائی ہوئی آواز ابھری۔

اور امبر نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔ طاہر کا جی چاہا آگے بڑھ کر ان انمول موتیوں کو اپنے ہونٹوں سے چن لے۔ وفا کی اس دیوی کی پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دے۔ وہ جو اسے دیوتا کہتی تھی خود کتنی عظیم تھی۔ اسے محبت کا مفہوم معلوم تھا۔ اسے محبت نبھانا آتا تھا۔

''چلئے سر۔'' امبر کی آواز میں نئی زندگی تھی۔

''چلو۔'' وہ بھی اک نئے انداز سے مسکرایا۔ پُرسکون' باوقار اور والہانہ انداز میں۔ اس کے دل کی ساری جلن شبنم میں ڈھل گئی تھی۔ امبر کو نہ پاسکنے کا کوئی پچھتاوا' کوئی دکھ کوئی غم نہیں رہا تھا۔ ہر پچھتاوا' ہر دکھ ہر غم اس حسرت میں ڈھل گیا تھا کہ کاش' قمر کی جگہ وہ خود ہوتا۔

وہ دونوں کمرے سے نکلے اور کاریڈور میں چل پڑے۔ کھڑکی کے پاس کھڑا قمر' گہنایا ہوا قمر' پلکوں پر ستارے سجائے مسکرا رہا تھا' فخر سے۔ پیار سے۔ ناز سے۔ جو سب کا سب امبر کے لئے تھا۔

☆

آفس کو کسی نوعروس کی طرح سجایا گیا تھا۔

سب کے چہروں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ مسکرایا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے۔ آپ سب لوگ بری طرح تھک چکے ہیں۔''

''اب بھی کوئی شک ہے سر۔'' نجمہ نے بے تکلفی سے کہا۔ اور وہ ہنس پڑا۔

''بھئی تم لوگوں کی لیڈر کو پارٹی دینا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔''

''کتنے بجے آئیں گے وہ لوگ سر؟'' کلرک اختر نے پوچھا۔

''بھئی اس وقت چار بجے ہیں۔ سات بجے کا وقت طے ہے ان سے۔''

''اوہ۔ ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔'' انجم جیسے تڑپ گئی۔ ''انتظار کا یہ وقت کیسے کٹے گا؟''

''اچھا ایسا کرتے ہیں کسی انگلش پکچر پر چلتے ہیں۔ انٹرول کے بعد پکچر شروع ہوتی ہے اور ساڑھے چھ تک ہم بآسانی واپس آسکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟''

سب نے بخوشی رضامندی ظاہر کر دی۔ طاہر نے نادر کو دو بڑے نوٹ دے کر سینما پہنچنے کو کہا کہ وہ سب کی ٹکٹیں لے کر ان کا انتظار کرے۔ سب لوگ باری باری منہ ہاتھ دھو کر دس پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آفس کی گاڑیوں

میں لد کر چل دیے۔

پکچر چھ بجے ختم ہو گئی۔ ان کی بوریت اور تھکن کافی حد تک دور ہو گئی کیونکہ پکچر اچھی تھی۔ سوا چھ بجے وہ واپس آفس میں موجود تھے۔

''اچھا بھئی۔ ایک خاص بات۔'' وہ سب بیٹھ گئے تو ایک دم طاہر سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم میں سے کس کس نے قمر صاحب کو دیکھا ہے؟''

''ہم سب ہی نے دیکھا ہے سر۔ ہم آپ کا مطلب سمجھتے ہیں۔'' انجم جلدی سے بولی۔ ''ہم انہیں ہرگز ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے، جس سے معلوم ہو کہ انہوں نے چہرے پر زرہ بکتر پہن رکھی ہے۔'' اور سب کے ساتھ وہ بھی بے ساختہ ہنس دیا۔

''بس۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''میں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ وہ کسی بھی طرح اپنی انسلٹ محسوس کریں۔''

اور سب نے برا منائے بغیر وعدہ کر لیا۔

پھر سات بج گئے مگر امبر اور قمر نہ پہنچے۔ ساڑھے سات ہو گئے۔ ان دونوں کا اب بھی کوئی پتہ نہ تھا۔ طاہر نے دو تین مرتبہ گھر پر فون کیا مگر کسی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ یہ ان کے روانہ ہو جانے کی نشانی تھی۔ لیکن وہ اب تک پہنچے کیوں نہیں؟ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

پونے آٹھ بجے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

''سر۔ وہ آ گئے۔'' نادر کمرے میں داخل ہوا۔

سب لوگ بیتابی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ابھی آفس کا لان پار کر رہے تھے کہ اس نے آفس کے دروازے پر ان کو ریسیو کیا۔

''معاف کیجئے گا۔ ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔'' قمر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے معذرت سے بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔'' وہ کسی گڑیا کی مانند سجی امبر کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''نائٹ سر۔'' وہی مخصوص سا ادھورے سلام کا انداز۔ اور کھلتی ہوئی مسکراہٹ۔

''نائٹ۔'' وہ بھی مسکرا دیا۔

تمام لوگوں سے قمر کا فرداً فرداً تعارف پہلے سے تھا۔ رضیہ، انجم اور نجمہ امبر کو گھیرے کھڑی تھیں اور وہ ان کی

باتوں سے کٹی جا رہی تھی۔ شرم کے مارے پانی پانی ہو رہی تھی مگر آج وہ اسے معاف کرنے کے موڈ میں نہ تھیں۔ مرد حضرات لڑکیوں سے پرے صوفوں پر جم گئے۔ دلچسپ باتوں، قہقہوں، مسکراہٹوں کا خوشگوار سلسلہ چھڑ گیا۔ آج وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ بات بے بات کھلا جا رہا تھا۔ نجانے کیوں؟

کچھ دیر اسی حسین فضا کا تسلط رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میرا خیال ہے اب دیر کرنا مناسب نہیں۔ کیوں قمر صاحب؟“ اس نے پوچھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ کچھ بھی نہ سمجھا۔

وہ مسکرا کر ایک طرف سجی سجائی بڑی سی میز کی جانب بڑھ گیا اور اس پر پڑا خوبصورت کپڑا کھینچ لیا۔ سب لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے مسکراتے ہوئے چھری اٹھائی اور پاس کھڑی امبر کی طرف بڑھا دی۔ اس نے بڑے دل نشیں انداز میں قمر کی جانب دیکھا اور بڑے سے کیک کے ٹکڑے ہونے لگے۔

تالیاں گونجیں، چھینا جھپٹی ہوئی اور بہاریں گنگنا اٹھیں۔ کھانے کی ہر ڈش نے ان سے بے پناہ داد وصول کی۔ پھر کچھ دیر بعد چائے اور کافی وغیرہ سے شغل کیا گیا۔ تب وہ یادگار لمحہ بھی آن پہنچا جب وہ میز کے پاس کھڑا ’بڑے دلربایانہ انداز سے ان سب کو دیکھ رہا تھا‘ جو اس کے سامنے مسکراہٹوں کے پھول لئے کھڑے تھے۔ چند لمحے گزر گئے۔ پھر آہستہ سے اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔

”ساتھیو!“ وہ رکا۔ اس کی نظریں امبر کی نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ ”مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ تقریب جو ہم نے اپنے آفس کی روح رواں، اپنی ایک بہترین دوست، رفیق اور ساتھی اور آج سے مکمل طور پر پرائی ہو جانے والی ہستی کے اعزاز میں منعقد کی ہے اور جسے آپ سے متعارف کرانے کی، میں ضرورت نہیں سمجھتا۔“ وہ ذرا ٹھہرا۔ پھر بولا۔ ”مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں بلکہ میں فخر سے اس بات سے آپ سب لوگوں کو آگاہ کروں گا کہ امبر۔۔۔“ اس کی نظریں امبر کے مضطرب چہرے پر پھیل گئیں۔ ”اس ادارے کی وہ ممبر ہے جس کی محبت، رفاقت، پیار اور دردمندی سے جدائی پر دل چاہتا ہے کہ میں جی بھر کر آنسو بہاؤں۔ دل کھول کر روؤں اور اس کے درخشاں مستقبل کی جھلک دیکھ کر، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی پلکوں پر چمکنے والے ہر آبدار موتی کو اس کی مسرتوں، آنے والی خوشیوں کے قدموں پر نچھاور کر دوں۔“ اس کے لرزتے لبوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

”دوستو! غم ہر انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔ کب، کیسے، کس شکل میں آئیں گے؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ایک دکھ کا پہاڑ میرے وجود پر بھی ٹوٹا تھا۔ حسرتوں کا ایک آتش فشاں میری زندگی میں بھی پھٹا تھا اور میرا خیال ہے اس سے آپ بھی بخوبی واقف ہیں۔“

اس نے ایک طائرانہ نظر ان بتوں پر ڈالی جو سانس بھی اتنی آہستگی سے لے رہے تھے کہ سکوت خود پر بوجھ بن گیا تھا۔ پھر اس کی گھمبیر آواز نے اس بوجھ کو سرکانا شروع کیا۔

’’میں اس دکھ، اس غم، اس سزائے بے جرم کو برداشت کر سکتا تھا نہ کر سکا۔ زندگی مجھ پر بوجھ بن گئی۔ ہر سانس میرے لئے دائرہ حیات تنگ کرتی چلی گئی۔ دنیا اور اس کی ہر رنگینی میرے لئے تاریک رات کی پرچھائیں بن کر رہ گئی۔ مجھے روشنی اور اندھیرے ایک ہی ناگن کے دو روپ دکھائی دینے لگے۔ میں زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں کی طرح بے حس ہوتا چلا گیا۔ آپ سب نے میرے دکھ کو محسوس کیا۔ میرے غم کی شدت اور میرے زخم کی ٹیس اپنے دلوں میں محسوس کی لیکن ایک ہستی آپ میں ایسی بھی تھی جو آپ سب پر آپ سب کے احساس پر بازی لے گئی۔ جس نے مجھے دلدل میں دھنستے دھنستے کنارے پر کھینچ لیا۔ جو مجھے گرداب سے پھر ساحل پر لے آئی۔ جس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ نے میرے زخم پر مرہم رکھ دیا۔ جس کی دلجوئی نے میرے دکھ کی جڑیں کاٹیں۔ جس کی محبت، پیار اور عظمت نے نہ صرف مجھے دوبارہ زندگی دی بلکہ زندگی کی امانت، زندگی کو لوٹا دینے کی کامیاب کوشش کی۔ وہ۔۔۔ وہ امبر تھی۔‘‘ بے ساختہ اس کی پلکوں کے گوشے نم ہوئے۔ تقریباً سب کا یہی حال تھا۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو شدت جذبات سے بوجھل نہ ہو رہا ہو۔ کوئی چہرہ ایسا نہ تھا جو فرطِ احساس سے تپ نہ رہا ہو اور امبر کے رخساروں پر تو شبنم ٹپکی پڑنے کو بیتاب تھی۔ طاہر دھندلائی ہوئی نظروں سے ان سب کو دیکھ کر اپنی کپکپاتی آواز پر حتی الامکان قابو پاتے ہوئے پھر گویا ہوا۔

’’آپ سب نے امبر کے ساتھ تعاون کیا اور مجھے اپنی محبتوں کی آغوش میں چھپا لیا۔ آپ‘ جو بیگانے ہوتے ہوئے بھی میرے اپنے بن گئے‘ آپ‘ جو میرے اپنے ہیں لیکن آپ کی قسم۔ اگر امبر نہ ہوتی تو شاید آج میں بھی نہ ہوتا۔‘‘

’’سر‘‘۔ امبر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور قمر کے شانے پر سر رکھ دیا۔ اس نے پیار سے اس کا شانہ تھپکا۔ طاہر نے پل بھر کو امبر کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

’’لیکن کتنی بڑی زیادتی ہے میرے ساتھ۔ کتنی بڑی ناانصافی ہے میرے ساتھ۔‘‘ وہ بھرائے ہوئے انداز میں ہنسا۔ ’’کہ یہ دیوی مجھے دیوتا کہتی ہے۔ آخر کیوں؟‘‘ اس نے پیار بھرے بھیگے بھیگے سوالیہ انداز میں ان سب کو دیکھا۔ ’’کیا صرف اس لئے کہ میں نے چند ضرورت مندوں کو بدحالی کے زمانے میں پناہ دی۔ ان کو کبھی ملازم نہیں سمجھا۔ اپنا جان کر ان سے پیار کیا۔ ان کی ضروریات کا پاس کرتا ہوں۔ کیا ایسے معمولی کام کرنے والے ہر انسان کو دیوتا کہا جاتا ہے؟ کیا میرے لئے یہ نام مناسب ہے؟ ہرگز نہیں۔ قطعی نہیں۔ یہ تو آپ کی محبت ہے۔ عقیدت

ہے۔ پیار ہے۔ ورنہ میں اور دیوتا؟ کوئی جوڑ بھی ہے میرا اور اس لفظ کا۔‘‘

وہ طاہر کے مسکراتے ہوئے چہرے کو خاموشی سے تکتے رہے۔

‘‘سر’’۔ تب دھیرے سے امبر ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ قمر کے لبوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ طاہر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنس دیا۔

‘‘آپ کی ہر بات درست۔ ہر لفظ بجا۔۔۔ لیکن مجھے بتایئے سر’’۔ وہ پل بھر کو اس کی جانب دیکھ کر رکی۔ اور پھر کسی داستان کی طرح کھلتی چلی گئی۔

‘‘ایک ماں کا جگر گوشہ، ایک مجبور لڑکی کی بہن، صرف اس لئے دلہن نہ بن سکے کہ اس کے تن پر سجا ہوا سرخ جوڑا، جہیز کی لالی سے محروم ہے۔ اس کی رخصتی صرف اس لئے نہ ہو سکے کہ اس کے ماتھے پر سونے کا جھومر اور بدن پر زرتار لباس نہیں ہے۔ وہ ساری زندگی ماں باپ کے گھر صرف اس لئے بیٹھی رہے کہ وہ سسرال جاتے وقت اپنے ساتھ ذاتی مکان کے کاغذات، نقد روپیا اور کار نہیں لے جا سکتی۔ اس وقت آسمان سے ایک فرشتہ اترے۔’’

‘‘امبر۔۔’’ وہ اضطراب اور گھبراہٹ کے ملے جلے تاثرات سے گڑبڑا گیا مگر وہ اس کی پروا کئے بغیر کہتی رہی۔

‘‘وہ انسان۔ وہ فرشتہ نما انسان اس لڑکی کو سونے میں پیلا کر دے۔ اس کے سرخ جوڑے میں جہیز کی لالی بھی بھر دے۔ وہ سسرال جائے تو اس کے ساتھ ذاتی مکان کے کاغذات بھی ہوں اور اس کا دولہا اسی کی کار میں سوار ہو تو اس معصوم اور بھولی بھالی دلہن کے بوڑھے والدین اور اس کی بہن اس انسان کو دیوتا نہ کہیں، تو کیا کہیں سر۔ اسے دل ہی دل میں پوجیں نہیں تو کیا کریں سر۔’’

‘‘امبر۔ چپ ہو جاؤ’’۔ وہ جیسے بھرے مجمعے میں بے ستر ہو گیا۔

‘‘پھر کسی کا بھائی اس کی جیب سے تعلیم حاصل کرے۔ کسی کی بیوہ بہن اس کے خرچ پر زندگی گزارے۔ کسی کی بیٹی اس کے احسان کے دوش پر پرائے گھر جا کر راج کرے۔ کسی کا بیٹا اس کے زیر سایہ روزی کمائے تو ہم اسے دیوتا کیوں نہ کہیں سر؟ بولئے۔ جواب دیجئے۔’’ وہ گلوگیر آواز میں اس سے سوال کر بیٹھی۔

وہ سر جھکائے کسی مجرم کی طرف خاموش کھڑا رہا۔ جیسے اس پر لگایا جانے والا ہر الزام صحیح ہو۔ سچ ہو۔ حقیقت بھی تھی کہ امبر کی چھوٹی بہن کی شادی پر اس نے پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ آفس کے تقریباً تمام لوگوں پر کسی نہ کسی صورت میں اس کی نوازشات جاری رہتی تھیں۔ کسی کا بیٹا اس کے خرچے پر پڑھ رہا تھا کسی کی بیٹی کے لئے وہ ہر ماہ معقول رقم دیتا تھا۔ کسی کو خاموشی سے بلینک چیک تھما دیا جاتا کہ وہ اس سے اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان خرید سکے۔ کسی

کے بوڑھے والدین کی بیماری اس کی ادا کی گئی فیس سے صحت میں بدل رہی تھی۔ کسی کا بھائی اس کی سفارش پر کہیں نہ کہیں نوکری حاصل کر چکا تھا اور کسی کی بہن بیوگی کے دن اس کے وظیفے سے باآسانی کاٹ رہی تھی۔ کتنے ہی رفاہی اداروں میں وہ ماہانہ دیتا تھا۔ کتنے ہی فرضی ناموں سے کئی ادارے اس نے فلاحی کاموں کے لئے کھول رکھے تھے، جہاں ان گنت لوگ فیض یاب ہو رہے تھے۔ بیکاری کے مارے روزگار پا رہے تھے۔ ضرورت مند اپنے خالی دامن مرادوں سے بھر رہے تھے۔ یہ سلسلہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور ان حقیقتوں سے اس کے علاوہ صرف امبر واقف تھی۔ اس کے اور امبر کے درمیان یہ طے تھا کہ زندگی کے آخری سانس تک، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ دونوں کہیں بھی رہیں، ان رفاہی کاموں کی منتظم صرف اور صرف امبر رہے گی۔ ان نیکیوں کے لئے کروڑوں کے بینک اکاؤنٹ کو صرف وہ آپریٹ کرے گی۔ جیسے اور جہاں چاہے اس پیسے کو خرچ کرے گی۔ طاہر نے اپنے بزنس کے ایک خاص پراجیکٹ کی ساری آمدنی براہِ راست THE PROUD نامی فلاحی ادارے کے لئے مختص کر رکھی تھی اور یہ آمدنی براہِ راست اس ادارے کے اکاؤنٹ میں جاتی تھی، جس کے تحت یہ سب نیکیاں انجام پاتی تھیں۔ بیگم صاحبہ تک کو اس نے اس کی ہوا نہ لگنے دی تھی۔۔۔ لیکن آج امبر نے علی الاعلان اس کا پول کھول دیا تھا۔ جو نہیں جانتا تھا اسے بھی علم ہو گیا تھا کہ بظاہر انسان نظر آنے ولا یہ انسان اندر سے کس مقام پر کھڑا ہے؟ کتنے ہاتھ اس کے حق میں دعاؤں کے لئے اٹھتے ہیں؟ کتنے دل اس کی زندگی اور خیر خواہی کے لئے دھڑکتے ہیں؟ کتنی آنکھیں اس کے نام پر تشکر آمیز آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں اور کتنی زندگیوں کی خوشیاں، مسرتیں اور مسکراہٹیں اس کے اشاروں پر رقصاں ہیں؟

وہ منہ پھیرے، سر جھکائے میز کا سہارا لئے کھڑا تھا اور وہ سب خاموش، بے جان بت بنے اسے دیکھ رہے تھے۔۔۔ کتنی ہی دیر بعد وہ بڑی آہستگی سے ان کی طرف پلٹا۔ اس کے چہرے پر اداسی اور یاسیت کے بادل امڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ سراپا خزاں لگ رہا تھا۔ بکھرا ہوا، مرجھایا ہوا گلاب نظر آ رہا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا امبر؟“ وہ بڑبڑایا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک دم بادل چھٹ گئے۔ گلاب مہک اٹھا۔ وہ مسکرا دیا تھا، بڑی معصومیت سے۔ امبر کا جی چاہا، بھاگ کر اس دیوتا کے چرنوں میں جا گرے اور یوں پگھل جائے جیسے شمع کا یہ حق صرف اسی کو حاصل ہے مگر اس کے لب صرف کپکپا کر رہ گئے، آواز نہ نکلی۔ اس کا جسم صرف لرزا، حرکت نہ کر سکا۔

”مجھے کوئی گلہ نہیں امبر کہ تم نے مجھے، اپنے دیوتا کو پھولوں کے پہاڑ تلے دفن کر کے رکھ دیا۔ کچھ اس طرح کہ اب اگر میں ان پھولوں کے بوجھ سے آزاد بھی ہونا چاہوں تو نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں امبر کہ ان پھولوں کی مہک کو ہمیشہ تازہ رکھوں گا۔ انہیں مرجھانے نہیں دوں گا۔“

بے اختیار امبر کی آنکھیں چھلک گئیں۔ ''سر۔ میں نے آپ کو دیوتا کہہ کر غلطی نہیں کی۔'' وہ سب لوگوں کی طرف پلٹی۔ ''کیا میں نے غلط کہا؟''

ان سب کے سر جھک گئے۔ اقرار میں۔ اثبات میں۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے ایک مندر میں دیوتا کے حضور ان گنت چراغ سر جھکائے کھڑے لو دے رہے ہوں۔ احسان و وفا کے مندر میں۔ پیار کے دیوتا کے حضور محبت کے پجاری سرنگوں کھڑے تھے۔

تب قمر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔ ''آپ بہت خوش قسمت ہیں طاہر۔'' وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

وہ جواب میں ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ اس نے دیکھا' سارے ہی چہرے پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ اب مسکراہٹوں میں پہلے کی نسبت زیادہ تازگی تھی۔ باتوں میں زیادہ شگفتگی اور نظروں میں زیادہ والہانہ پن تھا۔

پھر وہ فرقتوں کا پیامبر لمحہ بھی آن پہنچا جس کے لئے یہ سارا اہتمام کیا گیا تھا۔ چہرے ایک بار پھر اداس ہوگئے۔ جذبات افسردہ ہونے لگے۔ دل بوجھل ہوتے چلے گئے۔

''امبر۔'' طاہر اس کی اور قمر کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ وہ دونوں اسے استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگے۔ ''تمہارے دوستوں نے تم لوگوں کو رخصت کرتے وقت اپنے جذبات تحفوں میں چھپا کر پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور میرا خیال ہے اب وہ یادگار وقت آ چکا ہے جب ہمیں اپنے ان جذبوں کا اظہار کر دینا چاہیے۔''

اس نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا اور وہ اس کا اشارہ سمجھ کر کمرے کے ایک گوشے کی جانب بڑھ گئے۔ چند لمحوں بعد وہ لوٹے تو امبر اور قمر کے سامنے گفٹ پیکس کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ پرے کھڑا مسکراتا رہا۔ آخر میں وہ آگے بڑھا اور ایک سفید بڑا لفافہ امبر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''اس میں کیا ہے سر؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''اس میں۔۔۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''اس میں ایک چھوٹا سا گزارش نامہ ہے امبر جس کے تحت آج سے تم THE PROUD کی تاحیات چیئر پرسن ہو۔''

''سر۔۔۔'' وہ سُن ہوگئی۔

''کچھ مت کہو امبر۔ یہ تمہارا وہ حق ہے جو مجھ پر قرض تھا۔ آج کے بعد بھی تمام معاملات ویسے ہی چلتے رہیں گے جیسے اب تک چلتے آ رہے تھے۔ صرف ایک شق ختم ہو جائے گی اور وہ یہ کہ آج کے بعد کسی چیک' کسی دستاویز پر

تمہیں میرے دستخط درکار نہیں ہوں گے۔ اب تم خود فائنل اتھارٹی ہو۔ بس ایک بات یاد رکھنا کہ ہم دونوں کے درمیان جو اس کام کو نسل در نسل جاری رکھنے کا عہد ہوا تھا اس میں کوئی دراڑ نہیں آنی چاہئے۔ کوئی تعطل نہیں آنا چاہئے۔ THE PROUD کو آسمان خیر پر ہمیشہ دمکتا رہنا چاہئے۔ ہم رہیں نہ رہیں' اس عہد کو زندہ رہنا چاہئے۔ میں تمہاری شادی پر تمہیں اس ذمے داری کے تحفے کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔''

''سر۔۔۔'' امبر نے لفافے کو چوم کر پلکوں پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی شبنم نے اس عہد نامے پر پاکیزگی کی مہر ثبت کر دی۔

''قمر صاحب۔'' طاہر نے پروفیسر قمر کی جانب دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔'' میرا خیال ہے آپ کو اس پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ کوئی جاب نہیں ہے۔''

''قطعاً نہیں طاہر صاحب۔ یہ تو ایک سعادت ہے جس میں مَیں خود امبر کا ساتھ دینا چاہوں گا۔'' وہ بڑے جاندار انداز میں مسکرایا۔

''شکریہ۔'' طاہر نے اس کا ہاتھ دبایا اور چھوڑ دیا۔ پھر اس نے نادر کو اشارہ کیا۔ وہ تحائف دو تین پھیروں میں باہر طاہر کی کار میں رکھ آیا۔

''امبر۔ ایک آخری بات۔'' طاہر نے اپنی کار کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔'' یہ تمہاری کار کی چابی ہے۔''

''یہ تو آپ کی۔۔۔'' امبر نے کہنا چاہا۔

''اب یہ کار تمہاری ہے۔ THE PROUD کی چیئر پرسن کو ادارے کی جانب سے کار اور رہائش کی سہولت دی جائے' یہ ادارے کے چارٹر میں طے ہے۔ اس سفید لفافے میں تمہاری نئی رہائش کے کاغذات بھی موجود ہیں۔ انکار مت کرنا کہ یہ تمہارا حق ہے۔''

''او کے سر۔'' امبر بے اختیار مسکرا دی۔'' میں بار بار حیرت اور انکار کے چکر میں پڑ کر کیوں آپ کا دل دکھاؤں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

''ڈیٹس گڈ۔'' طاہر بھی مسکرا دیا۔

''نائٹ سر۔'' کار میں بیٹھ کر امبر نے لرزتے ہاتھ کو پیشانی تک لے جا کر اسی مخصوص انداز میں کہا اور بے ساختہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''نائٹ امبر۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر دعاؤں' آنسوؤں' محبتوں اور بے پناہ بوجھل جذبات کی چھاؤں میں وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

ویران ویران آفس کی ہر چیز اداس تھی۔ مندر سونا ہو گیا تھا' دیوتا کے دل کی طرح۔ دیوتا کی داسی جا چکی تھی ناں۔ شاید اسی لئے!

☆

”طاہر۔“ بیگم صاحبہ کی آواز نے سیڑھیوں کی جانب جاتے ہوئے اس کے قدم روک لئے۔

”جی امی۔“ وہ ان کی طرف لوٹ آیا۔

”بیٹھو۔“ انہوں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”بہت تھکے سے لگ رہے ہو۔“ انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کام بہت تھا آج آفس میں۔“ اس نے گردن پیچھے ڈال دی۔

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ ”جاؤ۔ فریش ہو جاؤ۔ کھانے کی میز پر بات کریں گے۔“ بیگم صاحبہ کی آواز میں بیحد نرمی تھی۔

”کوئی خاص بات امی؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

”ایسی بھی خاص نہیں مگر ضروری ہے۔“

”تو ابھی کر لیجئے۔ میں بھوک محسوس نہیں کر رہا۔“

”تم جانتے ہو ابھی تک ہم نے اپنی عادت نہیں بدلی۔ تم نہیں کھاؤ گے تو ہم بھی بھوکے سو جائیں گے۔“

”یہ زیادتی ہے امی۔“ وہ انہیں شکوے بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”کسی وقت مجبوری بھی ہوتی ہے میں باہر کھانا کھا کر آؤں۔۔۔“

”تب ہم نے کبھی اصرار نہیں کیا طاہر۔۔۔ مگر آج تم کھا کر نہیں آئے۔“

”امی۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”آپ سے جیت نہیں سکتا میں۔“ وہ اٹھ گیا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

آدھ گھنٹے بعد دونوں ماں بیٹا کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور اب کافی کا دور چل رہا تھا۔

”جی امی۔“ اس نے چسکی لے کر مگ میز پر رکھا۔ ”اب کہئے کیا بات تھی؟“

”بات نئی ہے نہ بحث طلب طاہر۔ بس تمہاری طرف سے کسی پیشرفت کے منتظر ہیں ہم۔“

طاہر نے بے اختیار سر جھکا لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس نے آنکھیں موند لیں اور جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بیگم صاحبہ اسے خاموشی سے تکتی رہیں اور کافی کا کپ خالی کرتی رہیں۔

”جیومیٹری کا مسئلہ حل کر رہے ہو بیٹے؟“ کافی دیر گزر گئی تو وہ بول اٹھیں۔

”نہیں امی۔“ بیساختہ وہ ہنسا اور آنکھیں کھول دیں۔ ”لیکن یہ میرے لئے مسئلہ فیثا غورث سے کم بھی نہیں ہے۔“

”تم زندگی کو اپنے لئے اتنا مشکل کیوں بنا رہے ہو طاہر۔“ بیگم صاحبہ نے اسے محبت سے دیکھا۔ ”بیٹے۔ زندگی اللہ کی نعمت ہے۔ اسے اس طرح ضائع مت کرو کہ یہ کفران بن جائے۔ زندگی کی خوشیوں پر تمہارا جتنا حق ہے اتنا ہی خوشیوں کا تم پر بھی حق ہے۔ اپنا حق چھوڑو نہ کسی کا حق غصب کرو، کاروبار کی طرح یہ کلیہ زندگی کے شب و روز پر بھی لاگو ہوتا ہے۔“

”میں نے اپنی سی کر کے دیکھ لی امی۔ میں تو اپنی زندگی سے وہ مسرت کشید نہیں کر سکا جس کا خواب میں نے ہمیشہ دیکھا۔ جو کچھ ہوا آپ کے سامنے ہے۔ پھر بھی۔۔۔“

”تم نے آج تک جو بھی کیا، اس میں کہیں تمہاری جلد بازی کو دخل ہے اور کہیں دیر کو۔ ہم نے ایک ماں ہونے کا تمہیں بھرپور ایڈوانٹیج دیا ہے طاہر۔ ہم نے تمہارے اچھے یا برے، غلط یا صحیح، کسی بھی فیصلے کو خوشی سے یا مجبوراً بہر حال قبول کیا۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم تمہاری خوشیوں میں کہیں بھی حائل ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر تم نے ٹھوکر کھائی ہے تو تمہیں سنبھلنے کے لئے ہم نے وقت بھی دیا ہے اور یہ بات تو تم بھی تسلیم کرو گے کہ ہم نے تمہیں ہر بار جی بھر کے وقت دیا ہے۔۔۔ لیکن بیٹے۔ کب تک؟ کب تک تم اپنے مفروضے پر اڑے رہو گے اور ہم تمہاری ناکامیوں پر چھپ چھپ کر آنسو بہاتے رہیں گے؟“ ان کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

”امی۔“ وہ بیتاب سا ہو گیا۔ ”میں نے اپنی طرف سے کبھی بدنیتی سے کام نہیں لیا۔ جسے بھی انتخاب کیا، پورے خلوص اور محبت سے کیا مگر میری قسمت ہی میں کسی کا پیار نہیں ہے۔ شاید مجھے تنہائی کا زہر۔۔۔“

”غلط کہہ رہے ہو تم طاہر۔“ بیگم صاحبہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اپنی قسمت کو دوش مت دو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمہارا انتخاب نہیں، انتخاب کا طریقہ غلط تھا۔ بحث کریں گے تو وقت بھی ضائع ہو گا اور زخموں کے منہ بھی کھل جائیں گے جبکہ اس وقت ہمارا مقصد یہ نہیں ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ بہار کے وہ لمحے جو ناکامیوں کی ٹھوکر سے بکھر گئے ہیں،

انہیں خزاں آ جانے سے پہلے سمیٹ کر تمہارے دامن میں ڈال دیں۔ تمہاری تنہائی کو ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے طاہر جو اپنی وفا شعاری اور رفاقت کی پلکوں سے تمہاری زندگی میں خودرو پودوں کی طرح اُگ آنے والے ساری تھکن ساری محرومی کے کانٹے چن لے۔“

”امی۔۔۔“ طاہر نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر بیگم صاحبہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

”آج ایک ماں کی حیثیت سے نہیں‘ ایک دوست بن کر ہم تمہیں سمجھانا چاہتے ہیں طاہر کہ تم جو چاہتے ہو شاید وہ تمہارے مقدر میں نہیں ہے یعنی کوئی ایسی ہستی جو تمہاری زوجیت میں آنے سے پہلے تمہیں ٹوٹ کر چاہے‘ ایسا ہونا ممکن ہے تمہارے ہاتھ کی لکیروں میں نہ لکھا ہو لیکن یہ تو ممکن ہو سکتا ہے ناں کہ جو لڑکی بیوی بن کر تمہاری زندگی میں آئے‘ وہ تمہیں اتنی محبت دے دے کہ تمہاری ساری ناکامیاں‘ ساری محرومیاں سیراب ہو جائیں۔ اور یہ اس لئے بھی ممکن ہے بیٹے کہ ہم مشرق کے لوگ ہیں۔ یہاں کی بیویاں جسے اپنے ماتھے کا جھومر بنا لیتی ہیں اسے خدا کے بعد وہ درجہ دیتی ہیں‘ جسے صرف سجدے کا حق حاصل نہیں ہے‘ باقی تمام حقوق وہی ہیں جو خدا کے بعد صرف اور صرف ایک شوہر کو دیے گئے ہیں۔ پسند کی چیز ایک دکان سے نہ ملے تو دوسری دکان میں نہ جانا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا طاہر۔ جو شے تمہیں درکار ہے وہ صرف اور صرف ایک بیوی کی محبت ہے اور اسے تم شادی سے پہلے ہی حاصل کرنے پر کیوں مصر ہو‘ یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔“

”مجھے خوف آتا ہے امی۔“ اچانک وہ میز سے اٹھ گیا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

”خوف؟“ بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا۔ ”کیسا خوف اور کس سے؟“

”کیا ضروری ہے امی کہ جو لڑکی میری بیوی بن کر آئے وہ مجھ سے پہلے کسی اور سے انوالو نہ ہو؟“

”یہ بات تم پہلے بھی کہہ چکے ہو طاہر۔ آخر تم اس وہم میں کیوں مبتلا ہو؟“ انہوں نے اپنا رخ اس کی جانب پھیر لیا۔

”میرا دوست جمال اسی حادثے کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں جا سویا تھا امی جان۔ اس نے جس لڑکی سے شادی کی‘ وہ شادی سے پہلے کسی اور لڑکے کو چاہتی تھی۔ جمال سے شادی کے بعد بھی وہ اس لڑکے کو نہ بھول سکی اور اس سے چھپ چھپ کر ملتی رہی۔ جمال نے اس بات سے واقف ہونے کے بعد اسے طلاق دے دی مگر اپنی بیوی پروین کی جدائی اور بے وفائی برداشت نہ کر سکا۔ دو ماہ بعد اس نے خودکشی کر لی۔“

”کیا؟“ بیگم صاحبہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”ہاں امی۔“ طاہر کی آواز بھیگ گئی۔ ”وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ اس کا خیال آج بھی مجھے رلا دیتا ہے۔ میں

اسی خوف سے اس وہم کا شکار ہو گیا ہوں کہ کہیں ایسی ہی بیوی میرے نصیب میں بھی نہ لکھی ہو۔ اسی لئے میں چاہتا تھا امی کہ جس سے شادی کروں، شادی سے پہلے اس سے میرا محبت کا ایسا تعلق استوار ہو چکا ہو جس میں کسی اور کے سائے کا بھی شائبہ نہ ہو۔‘‘

’’طاہر۔‘‘ بیگم صاحبہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئیں۔ ’’بیٹے تم نے کیسا وہم پال لیا ہے دل میں۔ یہ تو ناسور بن کر تمہیں چاٹ جائے گا۔‘‘ انہوں نے اس کے ماتھے اور پھر بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ’’میری جان۔ ہر لڑکی ایسی نہیں ہوتی۔ یہ تو پروین یا اس جیسی کسی بھی دوسری لڑکی کے ماں باپ کو چاہئے کہ وہ شادی سے پہلے بالکل اسی طرح بیٹی سے بھی اس کی پسند اور مرضی معلوم کریں جیسے بیٹے سے معلوم کرتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں اس میں قصور ایسی لڑکی کا کم اور اس کے سرپرستوں کا زیادہ ہوتا ہے جو بیٹی کو اس کی پسند بتانے کا وہ حق نہیں دیتے، جو اسے ہمارے مذہب نے دیا ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں کو شادی میں اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے اظہار کا یکساں حق حاصل ہے۔ اگر پروین کے والدین بیٹی کی مرضی سے اس کی شادی کر دیتے تو اسے طلاق ہوتی نہ جمال خودکشی کرتا۔ بہرحال تمہارے وہم کا علاج ہے میرے پاس۔‘‘

’’یہی ناں کہ مجھے شادی سے پہلے لڑکی سے ملاقات کا موقع دیا جائے گا اور میں اس سے ایک دو ملاقاتوں میں یہ بات صاف کرنے کی کوشش کر سکوں گا کہ وہ کسی اور سے تو۔۔۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ بیگم صاحبہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’اس کا یہی ایک حل ہے میرے پاس۔‘‘

’’نہیں امی۔‘‘ طاہر نے ان کے ہاتھ تھام کر گالوں سے لگا لئے۔ ’’میں ایسا نہیں چاہتا۔‘‘

’’تو پھر۔۔۔؟‘‘ وہ الجھ گئیں۔

’’دو بار میں نے اپنی سی کر کے دیکھ لی۔ اب آپ کو اختیار ہے آپ جو چاہے کریں۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہو گا۔‘‘

’’طاہر۔۔۔‘‘ وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔

’’ہاں امی۔‘‘ میں اب اندھا داؤ کھیلنا چاہتا ہوں۔ آپ جو لڑکی میرے لئے پسند کریں گی، میں اس سے شادی کر لوں گا۔ اسے شادی سے پہلے دیکھوں گا نہ اس سے ملوں گا۔‘‘

’’ایسا۔۔۔؟‘‘ بیگم صاحبہ کے چہرے پر پھلجھڑیاں سی چھوٹیں۔

’’ہوں۔‘‘ طاہر نے آنکھیں موند کر ان کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

’’پھر سوچ لو طاہر۔‘‘

”سوچ لیا امی۔“ وہ سرشاری سے بولا۔ ”مجھے سمجھ آ رہا ہے کہ جب اپنے فیصلے ٹھیک نہ بیٹھ رہے ہوں تب کسی ایسی ہستی پر اعتماد کر لینا چاہئے جسے دل اپنا خیر خواہ مانتا ہو۔ اور ماں سے بڑھ کر کون ہو گا امی جسے اولاد کی بھلائی عزیز ہو۔“

”جیتے رہو طاہر۔“ بیگم صاحبہ کا دل گلاب کی طرح کھل گیا۔ آنکھیں چھلک نہ جائیں‘ یہ چھپانے کے لئے انہوں نے طاہر کی جانب سے رخ پھیر لیا۔

”امی۔“ طاہر پیچھے سے ان کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ گیا۔

”بس کرو طاہر۔ اتنا لاڈ کرو گے تو ہم رو دیں گے۔“ انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا۔

”کبھی نہیں امی۔“ طاہر نے ان کے شانے پر سر رکھ کر انہیں زور سے بھینچ لیا۔ ”میں آپ کو رونے دوں گا تب ناں۔“

بیگم صاحبہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور ہولے ہولے یوں تھپکنے لگیں جیسے اس کی محرومیوں کو اس کی ناکامیوں کو گہری نیند سلا دینا چاہتی ہوں۔

☆

بیگم صاحبہ نے بہت زور دیا مگر طاہر نے ایک ہی انکار پر کمر باندھے رکھی۔ لڑکی کی تصویر تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ ”امی۔ آپ جو چاہیں‘ جیسے چاہیں کریں۔ میں آپ کی بہو کو دیکھوں گا تو اسی وقت جب وہ دلہن بن کر اس گھر میں آ جائے گی۔“

بیگم صاحبہ کو اس کی اس بات پر محتاط ہو جانا پڑا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان سے کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جو طاہر کے اس اعتماد کو لے ڈوبے۔

ڈاکٹر ہاشمی کے مشورے سے بڑا پھونک پھونک کر سوچتے ہوئے انہوں نے ایک متوسط گھرانے کی ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد اپنی بیوہ ممانی کے پاس رہ رہی تھی۔ ممانی نے اسے حتی الامکان سہولت سے پالا تھا۔ بی اے تک پڑھایا اور سلائی کڑھائی سے لے کر کچن تک‘ گھر کے تمام کاموں میں طاق کر دیا۔ ممانی کی اپنی دو بیٹیاں تھیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ لڑکی کے ماں باپ اور پھر ماموں اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے کہ تینوں بچیوں کی شادی کے بعد بیوہ ممانی آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔

طاہر کے رشتے نے باوقار وسیلہ خاتون کو کتنے ہی دن گم صُم رکھا۔ اتنے بڑے گھرانے میں اپنی بیٹیوں یا اب صفیہ کی شادی کا تو انہوں نے خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دمے کی مریضہ اور کئی سال سے ڈاکٹر ہاشمی کے زیر علاج

تھیں۔ ڈاکٹر ہاشمی انہیں سالوں سے جانتے تھے۔ انہوں نے اس خاندان کے بارے میں بیگم صاحبہ کو پوری پوری ضمانت دی۔ صفیہ کو بھی وہ بہت اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے۔ وہ درجنوں بار وسیلہ خاتون کے ساتھ ان کے کلینک آ چکی تھی بلکہ بی اے کے آخری سال میں تو وہ ڈاکٹر ہاشمی کے نوجوان بیٹے سرمد ہاشمی سے کئی ماہ تک پڑھائی میں مدد بھی لیتی رہی تھی۔ انہی دنوں وہ صفیہ کے بارے میں زیادہ جان پائے تھے۔ یتیم اور ہونہار صفیہ کے بارے میں کبھی کبھار سوچتے تو انہیں بہت اچھا لگتا۔ صفیہ اس لئے بھی انہیں اچھی لگتی تھی کہ ان کی کوئی بیٹی نہ تھی۔ گھر میں صرف وہ اور سرمد تھے۔ بیوی کے مرنے کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ بیٹے کو پالا اور ایم بی اے کے لئے لندن بھجوا دیا۔ اب وہ اپنے ہاسپٹل میں مگن رہتے تھے۔ سرمد کی واپسی میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔ ایک آدھ بار ان کے دل میں صفیہ اور سرمد کی شادی کا خیال بھی آیا مگر وہ سرمد کی تعلیم میں ایسی کسی بات سے روڑا نہ اٹکانا چاہتے تھے جو اس کا دھیان تعلیم سے ہٹا دے۔ اس لئے یہ بات اس کی واپسی پر اٹھا رکھی۔ پھر جب بیگم صاحبہ نے ان کے سامنے طاہر کی تازہ صورتحال بیان کر کے جلد از جلد کسی متوسط گھرانے کی لڑکی تلاش کرنے کو کہا تو سب سے پہلے ان کے تصور میں صفیہ کا چہرہ ابھرا۔ انہوں نے بیگم صاحبہ سے ذکر کیا۔ بیگم صاحبہ نے ان کے ہاسپٹل ہی میں آ کر ایک دن صفیہ کو بہانے سے دیکھ لیا۔ سرو قد صفیہ کی بھولی بھالی صورت، سرخ و سفید رنگ روپ اور شیریں کلامی نے ان کا دل پہلی نظر ہی میں مٹھی میں کر لیا۔ انہوں نے ڈاکٹر ہاشمی کو وسیلہ خاتون سے بات کرنے کا عندیہ دے دیا۔

تیسرے دن جب ڈاکٹر ہاشمی نے وسیلہ خاتون سے صفیہ کے لئے طاہر کے بارے میں بات کی تو ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ انہوں نے سوچنے کے لئے چند دن کی مہلت مانگی، جو ڈاکٹر ہاشمی نے طاہر اور اس کی فیملی کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتے ہوئے انہیں دے دی۔ ساتھ ہی کہا کہ ’’جیسے وسیلہ خاتون کے گھرانے کی طرف سے ہر قسم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اسی طرح بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی ہر طرح سے میں ضامن ہوں۔‘‘

یہ بہت بڑی بات تھی مگر وسیلہ خاتون زمانے کے نشیب و فراز سے ڈرتی تھیں۔ انہیں اپنی بیٹیوں سے زیادہ اپنی یتیم و یسیر بھانجی کا خیال تھا۔ اس لئے وہ کئی دن تک ڈاکٹر ہاشمی سے دوبارہ ملنے نہ آئیں۔ بالآخر ڈاکٹر ہاشمی نے انہیں فون کر کے بلایا اور کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کے لئے بیگم صاحبہ کے خاندان کے بارے میں چھان بین کی مکمل آزادی دی۔ ساتھ ہی کہا کہ روپے پیسے جائداد وغیرہ جیسی کوئی بھی اور کسی بھی انتہا کو چھوتی ہوئی ضمانت انہیں دی جا سکتی ہے۔

وسیلہ خاتون نے ڈاکٹر ہاشمی کی اس بات پر پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’ڈاکٹر صاحب۔ اگر روپیہ پیسہ ہی بیٹیوں کے سکھ کا ضامن ہوتا تو آج کسی کروڑپتی کی کوئی بیٹی دکھی نہ ہوتی، اجڑ کر میکے نہ آ بیٹھتی اور شوہر کے سلوک کی شاکی نہ ہوتی۔ بات تو ساری نصیبوں کی ہے اور نصیب میں کیا لکھا ہے یہ کون جانے؟‘‘

”میں آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں وسیلہ خاتون۔ اور اگر آپ غور کریں تو آپ کی اس بات ہی میں آپ کے اندیشوں اور سوچوں کا حل موجود ہے۔“

”یعنی۔۔۔“ ڈاکٹر ہاشمی کی جانب دیکھ کر انہوں نے استفسار کیا۔

”دیکھئے۔ جب آپ مانتی ہیں کہ ہوگا وہی جو نصیب میں لکھا ہے تو پھر خوف کیسا؟ ہم بے اختیار انسان تو صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنے طور پر پورا اطمینان کر لیں کہ جو قدم ہم اٹھانے جا رہے ہیں وہ ہمیں کہیں کسی گڑھے میں تو نہیں لے جا رہا۔ اگر یہ اطمینان حاصل ہو جائے تو اس کے بعد ہم پر صرف یہ واجب ہے کہ ہم اپنے اللہ کی بارگاہ میں بیٹی کے سکھ کی دعا کرتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ بیٹی کا دُکھ کیا ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ساری زندگی بیٹی کے لئے ترسا ہوں۔ میرے خالق کی مرضی نہ تھی کہ مجھے بھی بیٹی کا باپ ہونے کا اعزاز ملتا وگرنہ میں، سرمد کی ماں کے مرنے تک اس خواہش میں برابر کا شریک تھا کہ ہمارے ہاں بھی ایک بیٹی جنم لیتی۔ ہمارے گھر میں بھی اللہ کی رحمت اترتی۔ یہ ساری باتیں کرنے کا سبب یہ ہے وسیلہ خاتون کہ ایک طرف تو میں بیگم صاحبہ کی طرف سے ہر بات کا ضامن ہوں، دوسری طرف میں نے آپ کو مکمل آزادی دی ہے کہ آپ ان کے بارے میں جیسے چاہیں چھان بین کر سکتی ہیں۔ تیسری بات یہ کہ آپ کی تسلی کے لئے بیگم صاحبہ ایسی ہر ضمانت۔۔۔“

”یہ بات رہنے دیں ڈاکٹر صاحب۔“ وسیلہ خاتون نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”میری کسی بات کا یہ مطلب ہے ہی نہیں۔“

”تو پھر کھل کر کہئے بات کیا ہے جو آپ گومگو کا شکار ہیں؟“

”بات صرف سٹیٹس کی ہے ڈاکٹر صاحب۔“ وسیلہ خاتون نے آخر کہہ ہی دیا۔ ”ہم اس پائے کے لوگ نہیں ہیں جس سطح سے طاہر کا رشتہ آیا ہے۔ یہی بات میرے ”ہاں“ کہنے میں مانع ہے۔“

”بس۔۔۔“ ڈاکٹر صاحب نے بغور وسیلہ خاتون کی جانب دیکھا۔ ”اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں ہے؟“

”جی نہیں۔ میں چھان بین کرنے سے بھی انکاری ہوں کہ آپ جیسا زمانہ شناس اور ذمہ دار شخص درمیان میں موجود ہے۔ میری ہچکچاہٹ کا اور کوئی سبب نہیں ہے۔“

”تو پھر سینے میں رکے ہوئے خوف سے بوجھل سانس کو آزاد کر دیجئے وسیلہ بہن۔ اگر صفیہ کو کبھی کانٹا بھی چبھ گیا تو دوسرے جہان میں میرا گریبان ہوگا اور آپ کا ہاتھ۔۔۔“

”بس ڈاکٹر صاحب۔“ وسیلہ خاتون نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”آپ کی اس معاملے میں موجودگی ہی میرے لئے بہت بڑی ضمانت ہے۔ اب آپ نے بہن کہہ دیا تو میں دوسرے جہان کے بوجھ

سے ابھی آپ کو بری الذمہ کرتی ہوں۔ اس لئے کہ بیٹیوں کے نصیب اچھے ہوں' ہم صرف یہ دعا کر سکتے ہیں اس کے لئے کوئی اعلام لکھا جا سکتا ہے نہ کوئی بوجھ ذمے لیا جا سکتا ہے۔''

''تو میں آپ کی طرف سے۔۔۔''

''جی ہاں۔ آپ بیگم صاحبہ کو میری طرف سے ہاں کہہ دیجئے۔'' وسیلہ خاتون کی آواز بھیگ سی گئی۔ ''ساتھ ہی ان سے صرف یہ عرض کر دیجئے گا کہ صفیہ میری بھانجی نہیں' بیٹی ہے۔''

''میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں وسیلہ بہن کہ صفیہ آپ کے لئے اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر ہے۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے جلدی سے کہا۔ ''تاہم ایک بات آپ سے میں بھی کہنا چاہوں گا۔''

''جی جی۔'' وسیلہ خاتون نے آنکھوں کے گوشے خشک کئے۔

''کیا آپ نے صفیہ سے پوچھ لیا؟''

''لوگ عام طور پر ایسی باتوں سے گریز کرتے اور ایسا کرنا اپنی غیرت اور شان کے خلاف سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب' لیکن میں نے صفیہ سے برابر پوچھ لیا ہے۔ جواب میں خاموشی اس کی رضامندی کا ثبوت ہے۔''

''تو میری طرف سے مبارک قبول کیجئے۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں آج دوپہر یہاں سے سیدھا بیگم صاحبہ کے ہاں جاؤں گا اور انہیں بھی یہ خوشخبری سنا دوں گا۔ بتانے کو تو یہ بات انہیں فون پر بھی بتائی جا سکتی ہے مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہ خبر انہیں خود جا کر سناؤں۔''

''اب جیسے آپ کی مرضی ڈاکٹر صاحب۔ مجھے اجازت دیجئے۔'' وسیلہ خاتون اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ضرور ضرور۔'' ڈاکٹر ہاشمی بھی سیٹ سے اٹھ گئے۔ ''میں آج کل ہی میں اگلا پروگرام آپ کے گوش گزار کر دوں گا۔''

''جی۔ اللہ حافظ۔'' وسیلہ خاتون رخصت ہو گئیں اور ڈاکٹر ہاشمی ایسے بیتاب ہوئے کہ وقت سے پہلے ہی ہاسپٹل سے نکل پڑے۔

بیگم صاحبہ نے جب ان کی زبان سے صفیہ کے بارے میں نوید سنی تو بے اختیار ان کی زبان سے ''الحمد للہ'' نکلا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے انہیں وسیلہ خاتون کے تمام اندیشوں کے بارے میں کھل کر بتایا تو انہوں نے ایک عجیب فیصلہ سنا دیا۔

''ڈاکٹر صاحب۔ صفیہ کی ممانی کے اندیشے زمانے کی چال دیکھتے ہوئے بے بنیاد نہیں ہیں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنی میکے کی پشتینی جائداد طاہر کی دلہن کے نام کر دیں گے۔ اس گھر میں آنے پر ہماری طرف سے یہ

جائداد اسے منہ دکھائی میں دی جائے گی۔"

"بیگم صاحبہ۔" ڈاکٹر ہاشمی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "آپ جانتی ہیں کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔" وہ بڑے اطمینان بھرے انداز سے مسکرائیں۔ "ہم خوب جانتے ہیں۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔ ایک تو اس لئے کہ صفیہ اور اس کے میکے والوں کو زندگی بھر کا اطمینان دلانا ہے اور دوسرے اس لئے بھی کہ ہماری بہو جب اس گھر میں داخل ہو تو کروڑوں کی مالک بن چکی ہو۔"

اور ڈاکٹر ہاشمی کی زبان تھم گئی۔ انہوں نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بیگم صاحبہ جو فیصلہ کر چکی تھیں اس کے پیچھے خاندانی جاہ و حشم اور وقار بول رہا تھا، جس پر وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کو کبھی تیار نہ ہوتیں۔

اگلے دن سے شادی کی تیاریاں ایک بار پھر پورے زور شور سے شروع ہو گئیں۔ زاہدہ کے آنے پر جس کام کی ابتدا ہوئی تھی اب اسے انجام تک پہنچانے میں بیگم صاحبہ کسی قسم کی دیر نہ چاہتی تھیں۔ اس لئے محض دو ہفتوں کے وقفے سے نکاح کی تاریخ رکھ دی گئی۔ وسیلہ خاتون کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا کہ وہ مدت سے صفیہ کی شادی کا سامان کئے بیٹھی تھیں۔

طاہر نے پروفیسر قمر اور امبر کو بلا کر بیگم صاحبہ کے سپرد کر دیا۔ اب وہ تینوں تھے اور شادی کے ہنگامے۔ طاہر خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ اسے اگر شادی کی بہت زیادہ خوشی نہ تھی تو کوئی دُکھ بھی نہ تھا۔ اس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب مقدر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلتا ہے؟ اس سے قبل، وہ شادی سے پہلے کسی کی محبت پانے کے جنون میں مبتلا تھا۔ اب وہ شادی کے بعد محبت مل جانے کی امید سے دل بہلا رہا تھا۔

مگر اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ اس سے وہ بالکل ایسے ہی بے خبر تھا جیسے ہر انسان اپنے ساتھ پیش آنے والے کسی بھی سانحے یا اچانک نکل آنے والے انعام سے لاعلم ہوتا ہے۔

☆

صفیہ نے طاہر کی دلہن کے روپ میں "سلطان ولا" میں قدم رکھا تو اسے طاہر کے ساتھ دیکھ کر بیگم صاحبہ کے ہونٹوں پر سُکھ بھری مسکراہٹ نے جنم لیا۔

امبر کے ساتھ دوسری لڑکیاں اپنے گھیرے میں اسے اور طاہر کو بقعہ نور بنے ہال کے درمیان کھڑی بیگم صاحبہ تک لے آئیں۔ بیگم صاحبہ نے انہیں خود سے دو قدم کے فاصلے پر ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"ذرا رک جاؤ بہو۔" ان کا تخاطب صفیہ سے تھا جو سرخ جوڑے میں ملبوس، زیورات اور پھولوں میں لدی چہرے پر گھونگھٹ ڈالے فرش کی جانب دیکھ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کی آواز پر اس نے دھیرے سے اوپر دیکھا۔ وہ اسی

کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"ہماری طرف دیکھو" انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔

صفیہ نے سمجھ میں کچھ نہ آنے کے سے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔

"ہم تمہیں تمہارا حق دینا چاہتے ہیں بہو۔" بیگم صاحبہ نے اس کا دایاں ہاتھ تھام کر اوپر اٹھایا اور اس میں ایک گفٹ پیک جیسا لفافہ تھما دیا۔ صفیہ نے لفافہ تھام لیا مگر وہ اب بھی الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہاری منہ دکھائی ہے۔ ہم نے اپنی میکے کی ساری جائداد تمہارے نام کر دی ہے۔"

صفیہ کا ہاتھ لرز گیا۔ اس نے گھبرا کر دائیں ہاتھ کھڑے طاہر کی طرف دیکھا جو پہلے حیران ہوا پھر ایک دم مسکرا دیا۔ اس کے مسکرانے سے صفیہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"اب آؤ۔ ہمارے سینے میں ٹھنڈک ڈال دو۔" انہوں نے بازو وا کر دیے۔

صفیہ بے اختیار آگے بڑھی اور ان کے سینے سے لگ گئی۔ اسی وقت ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ وہاں موجود ہر شخص اس اچانک نمودار ہو جانے والی خوشی میں خود کو شریک ثابت کر رہا تھا جبکہ ڈاکٹر ہاشمی ہونٹوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ لئے پروفیسر قمر کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے دبا رہے تھے۔

"امبر۔ دلہن کو اوپر لے جاؤ بیٹی۔" کچھ دیر بعد بیگم صاحبہ نے صفیہ کو خود سے الگ کیا۔ امبر' دوسری خواتین کے ساتھ صفیہ کو لئے ہوئے آہستہ قدموں کے ساتھ سرخ قالین میں لپٹی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

طاہر نے زربفت کی شیروانی اور سر سے کلاہ اتار کر ملازم کے حوالے کیا اور ایزی ہو کر اپنے آفس کے لوگوں میں آ بیٹھا۔ یہی اس کے دوست تھے۔ یہی اس کے ساتھی۔ اس نے جمال کی موت کے بعد کسی کو اپنی دوستی کے دائرے میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ اس وقت بھی اسے جمال بے طرح یاد آ رہا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو اس کی شادی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ سینے میں جلن دیتے اس کے خیال سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے وہ نجانے کس دل سے ہنس رہا تھا۔ تاہم کچھ دیر بعد وہ موجودہ صورتحال میں جذب ہوتا چلا گیا۔

ہنگامہ فرو ہوتے ہوتے رات کے گیارہ بج گئے۔ سب لوگ رخصت ہو گئے۔ گاؤں سے آئے ہوئے مزارعوں اور ان کی خواتین کا انتظام گھر کے پائیں باغ میں ٹینٹوں میں کیا گیا۔ وہ سب وہاں چلے گئے اور کھانے پینے سے لطف اٹھانے لگے جس کا وسیع پیمانے پر اہتمام تھا۔

سب سے آخر میں ڈاکٹر ہاشمی' امبر اور پروفیسر قمر رخصت ہوئے۔ امبر نے طاہر کو پورا ایک ماہ آفس نہ آنے کا نادر شاہی حکم سنایا جس پر بیگم صاحبہ نے تصدیق کی مہر لگا دی۔

''میں سب سنبھال لوں گی سر۔ آپ پورا ایک ماہ چھٹی پر ہیں اور یہ چھٹی ایکسٹینڈ بھی ہو سکتی ہے۔ نو پرابلم۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں امبر بیٹی۔'' بیگم صاحبہ ہنسیں۔ ''اسے آفس سے جتنا دور رکھ سکتی ہو تمہیں اختیار حاصل ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں بیگم صاحبہ۔'' امبر نے طاہر کی جانب دیکھا۔ ''یہ آفس میں گھسنا تو درکنار کم از کم ایک ماہ تک فون بھی نہیں کر سکیں گے۔''

''جانے دو بھئی۔ کیوں میرا کورٹ مارشل کرنے پر تلی ہو تم۔'' طاہر گھبرا گیا۔

''آپ یہی سمجھیں سر کہ آپ کا کورٹ مارشل ہو چکا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ جب آپ اپنی سزا کا گھونگھٹ اٹھائیں گے تو ایک ماہ کے ایک سال میں بدل جانے کی دعا کریں گے۔''

اس پر سب لوگوں کا ملا جلا قہقہہ گونجا۔ طاہر کو بھاگتے ہی بنی۔ ڈاکٹر ہاشمی اور پروفیسر قمر سے ہاتھ ملا کر وہ پلٹا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد امبر اور پروفیسر قمر رخصت ہو گئے اور اب ہال میں صرف ڈاکٹر ہاشمی اور بیگم صاحبہ رہ گئیں۔

''مجھے بھی اب اجازت دیجئے بیگم صاحبہ۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

''ہم آپ کے ہمیشہ ممنون رہیں گے ڈاکٹر صاحب۔'' بیگم صاحبہ نے شال کندھے پر درست کرتے ہوئے کہا۔

''ایسا نہ کہئے بیگم صاحبہ۔ طاہر کا مجھ پر بڑا حق ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''یہ آپ کا بڑا پن ہے ڈاکٹر صاحب۔ اور ہم آپ کا شکریہ ادا کر کے اس بڑائی کا قد گھٹانا نہیں چاہتے۔ ہاں اس وقت ہم آپ سے ایک مشورہ اور کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی جی۔ فرمائیے۔'' وہ جلدی سے بولے۔

''چاہتے ہیں کہ زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہونے پر اپنے اللہ کا شکر اس کے گھر میں جا کر سجدہ ریز ہو کر ادا کریں۔''

''اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی بیگم صاحبہ۔ آپ نے بہت اچھا سوچا۔'' ڈاکٹر ہاشمی واقعی متاثر ہوئے۔

''لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ اس متبرک سفر میں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں تو۔۔۔''

''میں حاضر ہوں بیگم صاحبہ۔'' ڈاکٹر ہاشمی کے چہرے پر پھول سے کھلے۔ شاید یہ سفر ان کے اندر کی آواز تھا۔

”کوئی رکاوٹ تو مانع نہیں ہے۔“ بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

”رکاوٹ کیسی بیگم صاحبہ۔ سرمد لندن میں ہے۔ ہاسپٹل کون سا میرے سینگوں پر کھڑا ہے، اسے سنبھالنے والے موجود ہیں۔ اور کوئی ایسی ذمہ داری ہے نہیں جو راستے کا پتھر بنے۔“

”تو بس۔“ بیگم صاحبہ نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔ ”آپ انتظام کریں۔ اگلے ہفتے میں کسی بھی دن ہم دونوں بہن بھائی عمرے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔“

”انشاءاللہ۔“ ڈاکٹر ہاشمی نے بے ساختہ کہا۔

پھر وہ سلام کر کے رخصت ہو گئے اور بیگم صاحبہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ ان کا رواں رواں اپنے خالق کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو بیتاب تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور اس وقت اگر وہاں کوئی سننے والا ہوتا تو سنتا کہ چند لمحوں بعد کمرے سے بھیگی بھیگی شکرانے کی صدائیں جو بلند ہوئیں تو ان کے سبب ہر طرف کیسا عاجزی اور انکساری کا دھیما دھیما نور پھیل رہا تھا۔

☆

کتنی ہی دیر گزر گئی۔

پھولوں کے بستر پر گھونگھٹ نکالے صفیہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ طاہر اس کے پاس بستر کی پٹی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ وقت یوں دبے پاؤں چل رہا تھا جیسے اسے وہم ہو کہ اس کی آہٹ ان لمحوں کو چونکا دے گی۔

کنکھیوں سے صفیہ نے طاہر کی جانب دیکھا اور بڑے غیر محسوس انداز میں پہلو بدلا۔ اسے الجھن ہونے لگی تھی۔

طاہر اس کے ہلنے پر چونکا۔ پھر اس کے چہرے پر خجالت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ سوچوں میں گم تھا اور نئی نویلی دلہن اس کی کسی بھی پیشرفت کے انتظار میں سوکھ رہی تھی۔ پہلو بدل کر اس نے گھونگھٹ میں چھپے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کا دل سینے میں اتھل پتھل ہونے لگا۔

بڑا عجیب اور جاں گسل لمحہ تھا۔ اسے گھونگھٹ اٹھانا تھا۔ اپنی باقی زندگی کے ساتھی کو دیکھنا تھا۔ اس سے باتیں کرنا تھیں۔ اسے کچھ بتانا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا تھا مگر اسے حوصلہ نہ ہو رہا تھا۔ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ سارے مراحل کیسے طے کرے؟

پھر اسے کچھ خیال آیا اور اس کے سینے سے جیسے بوجھ سا ہٹ گیا۔ بڑوں کی بنائی ہوئی رسمیں کبھی کبھار کتنا کام آتی ہیں' دل ہی دل میں اسے اقرار کرنا پڑا۔

اس نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹی سی نیلی مخملیں ڈبیا نکال کر کھولی۔ اندر نیلم جڑی وائٹ گولڈ رِنگ جگمگا رہی تھی۔

انگوٹھی نکال کر اس نے ڈبیا تپائی پر ڈالی اور دھڑکتے دل کے ساتھ بائیں ہاتھ سے صفیہ کا دایاں ہاتھ تھاما۔ اسے صفیہ کے ہاتھ میں واضح لرزش اور ایک دم در آنے والی تپش کا احساس ہوا۔ طاہر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''امی نے تو آپ کو منہ دکھائی دے دی۔ یہ میری طرف سے رونمائی کا تحفہ ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے انگوٹھی

اس کے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہنادی۔

صفیہ نے ہاتھ واپس کھینچنا چاہا۔ کھینچ نہ سکی۔ طاہر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ہاتھ دوبارہ کھڑے گھٹنوں پر رکھ لئے اور ان پر گھونگھٹ کر لیا۔ بے اختیار طاہر کو ہنسی آ گئی۔

”زندگی بھر گھونگھٹ میں رہنے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس نے بے تکلفی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

جواب میں صفیہ کا بدن ذرا سا ہلا اور شرما کر اس نے سر اور جھکا لیا۔

”دیکھئے۔ اب تو ہم آپ کا دیدار کرنے کا پروانہ بھی آپ کے حوالے کر چکے ہیں۔ کیا اب بھی اجازت میں کوئی امر مانع ہے؟“

”آپ اتنے گاڑھے الفاظ کیوں بول رہے ہیں؟“ اچانک ایک مدھر آواز نے طاہر کے کانوں میں رس گھول دیا۔

”اتنی خوبصورت آواز۔“ بیساختہ اس کا دل پکارا۔ ”اتنا حسین لہجہ۔“ وہ بے قرار سا ہو گیا۔

آہستہ سے اس کے ہاتھ بڑھے اور چاند سے بدلی ہٹا دی۔

بے خودی نے طاہر کو جکڑ لیا۔ اس کی نگاہوں میں نشہ سا اترا اور سارے وجود میں پھیلتا چلا گیا۔ اس کے سامنے ایک انسانی چہرہ ہی تھا مگر اس پر کیسا حسن ضوفشاں تھا کہ جس نے طاہر کی رگ رگ میں مستی بھر دی۔ وہ عجب بہکے بہکے انداز میں صفیہ کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ وہ اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھی تھی۔ گلاب رنگ رس بھرے گداز ہونٹوں کے گوشے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ پلکیں تھرتھرا رہی تھیں اور رخسار شرم سے دہک رہے تھے۔

ساری ہچکچاہٹیں، ساری بے حوصلگیاں دم توڑ گئیں۔ طاہر کی وارفتگی نے اسے بے بس کر دیا۔ اس نے چاہا کہ اس چاند چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کے ہونٹوں کا سارا رس پی جائے۔۔۔ مگر اسی وقت صفیہ کے ہاتھوں نے حرکت کی اور اس کا چہرہ دوبارہ گھونگھٹ میں چھپ گیا۔ طاہر کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے اور ساتھ ہی اس کے حواس لوٹ آئے۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے اپنے تپتے جسم کی ناگفتنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پھر بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو تکلف کی یہ دیوار گرانے کی باہمی کوشش کی جائے۔“ ذرا دیر بعد اس نے کہا۔

جواب میں صفیہ خاموش رہی۔ ہوں نہ ہاں۔ طاہر نے چند لمحے انتظار کیا۔

''اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ یہ بدلی اپنے چاند چہرے سے ہٹا دیں۔'' وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھتے ہوئے بولا۔

''پہلے آپ یہ مشکل مشکل الفاظ بولنا بند کریں۔'' صفیہ نے اپنی مست آواز سے طاہر کو پھر گرما دیا۔ ساتھ ہی جیسے وہ ہولے سے ہنسی۔ طاہر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''میں نے کوئی مشکل لفظ نہیں بولا۔ صرف آپ کے حسن کی تعریف کی ہے۔'' طاہر نے بے تکلفی کی جانب چھلانگ لگائی اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر صفیہ کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

صفیہ اس اچانک حملے سے بے خبر تھی' اس لئے کچھ کر نہ سکی اور اس کی نظر سیدھی طاہر کے چہرے پر جا پڑی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور چند لمحوں کے لئے وہ ایک دوسرے میں کھو کر رہ گئے۔ پھر صفیہ نے شرما کر نظر جھکا لی۔ طاہر کا دل سینے میں مچل کر رہ گیا۔ اس کے شرمانے کا انداز اسے اور بھی دلفریب لگا۔

''دیکھئے۔ یہ زیادتی ہے۔'' طاہر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

جواب میں صفیہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے استفسارانہ انداز میں دیکھا۔

''آپ نے منہ دکھائی دیے بغیر ہی ہمیں دیکھ لیا۔'' طاہر نے کہا تو صفیہ کے چہرے پر قوسِ قزح کے لہریے پھیل گئے۔

''آپ بھی تو گھونگھٹ کے بغیر ہی آ بیٹھے۔'' دھیرے سے اس نے کہا اور طاہر کے ہونٹوں سے ایسا جاندار قہقہہ ابلا کہ صفیہ نے گھبرا کر بے اختیار دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر دروازہ بند دیکھ کر جیسے اسے اطمینان ہو گیا۔

ایسی ہی چند اور باتوں نے کمرے کا ماحول تکلف کی قید سے آزاد کرا لیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں ایک دوسرے کی ہلکی پھلکی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

دیوار گیر کلاک نے رات کے دو بجنے کا اعلان کیا تو دونوں چونکے۔ صفیہ نے لمحوں میں طاہر کو موہ لیا۔ وہ اس کی باتوں اور خیالات سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ کلاک نے دو بجائے تو انہیں رات کا آخری پہر شروع ہونے کا پتہ چلا۔ تبھی طاہر کو ایک دم سنجیدگی نے گھیر لیا۔ ایک بار پھر اس کا دل' دماغ سے الجھنے لگا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس خیال سے پیچھا چھڑا لے مگر گزشتہ وقت کے سائے اس کی سوچوں پر منڈلا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر الجھا الجھا بیٹھا رہا۔ صفیہ اسے ایک دم خاموش ہوتا دیکھ کر خود بھی الجھن میں پڑ گئی۔ جب نہ رہ سکی تو بول اٹھی۔

''آپ کسی الجھن میں ہیں طاہر؟'' صفیہ کی آواز اور استفسار نے طاہر کو حواس لوٹا دیے۔ اس نے صفیہ کی جانب دیکھا اور بیچارگی سے سر ہلا دیا۔

''خیریت؟'' صفیہ کا دل دھڑکا۔

''خیریت ہی ہے۔'' وہ ہولے سے بولا۔ پھر جی کڑا کر کے اس نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''صفیہ۔ میں تم سے ایک دو خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کہئے ناں۔ اس میں الجھن یا اجازت کی کیا بات ہے۔'' وہ سنبھل کر بولی۔

''دیکھو صفیہ۔'' طاہر نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہنا شروع کیا۔ ''آج سے پہلے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ اب اتنے انجان نہیں ہیں جتنے چند گھنٹے پہلے تھے۔ آگے ایک پوری زندگی پڑی ہے جو ہمیں ساتھ ساتھ بتانی ہے۔'' وہ رکا۔

''رکئے نہیں۔ کہتے رہئے۔'' صفیہ نے اسے حوصلہ دیا اور طاہر نے نظر جھکا کر کہنا شروع کیا۔

''کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ شوہر اور بیوی کا رشتہ صرف اور صرف اعتماد کے دھاگے سے بندھا ہوتا ہے اور یہ دھاگہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اسے بڑے سے بڑا جھٹکا بھی توڑ نہیں پاتا لیکن شک کا ہلکا سا احساس اس مضبوطی کو بودے پن میں تبدیل کر کے اس دھاگے کو توڑ دیتا ہے۔ اس رشتے کو ہوا کا بدبودار جھونکا بنا دیتا ہے۔ اس لئے میں تم سے پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ کیا مجھ سے تمہاری شادی تمہاری مرضی سے ہوئی ہے؟ اس بندھن میں کوئی زبردستی‘ کوئی مجبوری تو شامل نہیں ہے؟ یا یہ کہ۔۔۔''

''میری زندگی میں آپ سے پہلے کوئی دوسرا مرد تو نہیں رہا۔'' صفیہ نے بات کاٹتے ہوئے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

طاہر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کیسی آسانی سے صفیہ نے وہ بات کہہ دی تھی جو کہنے کے لئے وہ اب تک خود میں ہمت نہ پا رہا تھا۔ تمہیدیں باندھ رہا تھا۔

''یہی پوچھنا چاہتے ہیں ناں آپ؟'' بڑے اطمینان سے اس نے پوچھا۔

جواب میں طاہر غیر محسوس انداز میں محض سر ہلا کر رہ گیا۔

''اگر میں کہوں کہ میرا جواب اثبات میں ہے تو؟'' یکایک صفیہ نے جیسے طاہر کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔

''کیا مطلب؟'' اس کے لبوں سے فوراً نکلا۔

''میں نے آپ کی طرح شاعری نہیں کی طاہر۔ سیدھے سادے الفاظ میں پوچھا ہے کہ اگر میری زندگی میں آج سے پہلے تک کوئی مرد رہا ہو جس کا وجود صرف اس حد تک میری آج سے پہلے کی زندگی میں رہا ہو کہ وہ مجھے اور میں

اسے پسند کرتی رہی ہوں اور بس۔۔۔ لیکن کسی وجہ سے میں اس کے بجائے آپ سے شادی کرنے پر مجبور ہو گئی اور اب میں یہ کہوں کہ آج کے بعد میری زندگی میں آپ کے سوا کوئی دوسرا مرد نہیں آئے گا تو آپ کیا کہیں گے؟"

"پہلے یہ کہو کہ واقعی ایسا ہے یا تم صرف فرض کر رہی ہو؟" طاہر کی آواز بکھری گئی۔

"آپ یوں سمجھ لیں کہ میں جسے پسند کرتی تھی وہ بے وفا نکلا۔ اس نے کسی اور سے شادی کر لی۔ اب میں آپ سے شادی کرنے میں آزاد تھی اس لئے آپ کے عقد میں آ گئی۔ اس صورتحال میں آپ کیا کہیں گے؟"

"یعنی تم بھی اَن چھوئی نہیں ہو۔" وہ تلخی سے بولا۔

"غلط۔" ایک دم صفیہ جھٹکے سے اکھڑ گئی۔ "ایسا بُرا اور زہریلا لفظ آپ نے زبان سے کیسے نکال دیا طاہر۔ میں نے صرف پسند کی بات کی ہے' تعلقات کی نہیں۔ اور آپ نے مجھے سیدھا کسی کی جھولی میں ڈال دیا۔" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

بات کا رخ ایسا ہو گیا کہ لگتا ہی نہ تھا کہ وہ دونوں زندگی میں پہلی بار ملے ہیں اور یہ ان کی سہاگ رات کے لمحات ہیں۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم نے سمجھ لیا۔" طاہر سنبھلا۔ "تاہم میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اگر بات پسند کی حد تک بھی رہی ہو تو میں اسے سہنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔"

"پھر۔۔۔" صفیہ کے لبوں پر تمسخر ابھرا۔ "پھر کیا کریں گے آپ' اگر یہ بات سچ ہی نکل آئے تو۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔" وہ گڑبڑا گیا اور بستر سے اٹھ گیا۔ اس کا سانس بے قابو ہو رہا تھا۔

"طلاق کا لفظ لبوں سے بغیر سوچے سمجھے نہ نکالئے گا طاہر۔ یہ سوچنے پر بھی لاگو ہو جاتی ہے۔" صفیہ نے تیزی سے کہا۔

"پھر میں۔۔۔ میں کیا کروں؟" وہ اس کی طرف پلٹا تو بے بسی اس پر پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔

"وہ بھی میں آپ کو بتاتی ہوں مگر پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیجئے۔" صفیہ بھی بستر سے اتر کر اس کے قریب چلی آئی۔

طاہر نے بجھی بجھی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ دل کی دنیا ایک بار پھر تہہ و بالا ہو چکی تھی۔ بسنے سے پہلے ہی وہ ایک بار پھر برباد ہو گیا تھا۔

"جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ ایسی شریک حیات چاہتے ہیں جو صرف اور صرف آپ سے منسوب ہو۔ جس کی زندگی میں آپ سے پہلے کوئی مرد نہ آیا ہو۔ پسند کی حد تک بھی اس کے خیالوں پر کسی کا

سایہ نہ پڑا ہو۔ صاف صاف کہئے ایسا ہی ہے ناں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ بڑی مشکل سے کہہ کر طاہر نے رخ پھیر لیا۔

’’لیکن اس کے جواب میں آپ کی شریک حیات آپ سے بھی ایسا ہی مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے یا نہیں؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف پلٹا۔

’’مطلب صاف ہے طاہر۔ اگر آپ اپنے لئے ایسی بیوی چاہتے ہیں جس کی زندگی میں کوئی مرد تصور کی حد تک بھی دخیل نہ رہا ہو تو وہ بیوی بھی تو اپنے لئے ایسا ہی مرد چاہ سکتی ہے جس کی زندگی میں پسند کی حد تک بھی کوئی لڑکی نہ داخل ہوئی ہو۔‘‘

طاہر کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت ابھری اور وہ صفیہ کو تکتا رہ گیا۔ اس بارے میں تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

’’کیا آپ خود بھی ایسے ہی ہیں طاہر جیسا آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں؟‘‘ صفیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

’’میری زندگی میں۔۔۔‘‘

’’جھوٹ مت بولئے گا طاہر۔ میاں بیوی کا رشتہ اعتماد کے ساتھ ساتھ سچ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور میں کسی اور کے بارے میں نہیں تو کم از کم زاہدہ کے بارے میں تو جانتی ہی ہوں۔‘‘ صفیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

طاہر کے سر پر جیسے بم سا پھٹا۔ اس کے حواس مختل ہو گئے۔ وہ حیرت اور خجالت بھری نظروں سے صفیہ کو دیکھتا رہ گیا‘ جو کہہ رہی تھی۔

’’اس کے باوجود میں نے آپ سے شادی کے لئے ہاں کہہ دی۔ جانتے ہیں کیوں؟‘‘ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ’’صرف اس لئے کہ انکل ہاشمی نے مجھے آپ کے اور زاہدہ کے بارے میں ایک ایک سچ بتا دیا تھا۔ اس میں آپ بے قصور تھے۔ اور وہ بھی۔ حالات نے جو تانا بانا بنا اس میں آپ دونوں الجھ کر رہ گئے۔ جب الجھنوں کے بادل چھٹے تو وہ اپنی منزل پر تھی اور آپ نے تو ابھی سفر شروع ہی نہیں کیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس صورتحال میں اگر میں آپ کی ہمسفر ہو جاؤں تو آپ کی تنہائی آسان ہو جائے گی اور میرا فیصلہ مجھے کبھی پچھتاوے کی آگ سے آشنا نہیں کرے گا۔ اور اس کی بہت بڑی اور شاید ایک ہی وجہ تھی میرے پاس۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ بے اختیار طاہر نے پوچھا۔

”صرف یہ کہ۔۔۔“ وہ پل بھر کو مسکرائی۔ ”میری زندگی میں پسند کی حد تک بھی کوئی مرد کبھی داخل ہی نہیں ہو پایا۔“ وہ بڑے اطمینان سے کہہ گئی۔

طاہر کو لگا جیسے اسے بھرے بازار میں بے عزت کر دیا گیا ہو۔ اس کا سر جھک سا گیا۔ نہ اٹھ سکا۔

”اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ امی اور ابو کے بعد ممانی نے مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح پالا اور گھر سے باہر جاتے ہوئے ایک بات کہی کہ بیٹی! زندگی میں ایک دن آتا ہے جب مرد عورت کی زندگی میں کسی طوفان کی طرح داخل ہوتا ہے یا پھر بہار کے جھونکے کی طرح۔ شادی سے پہلے آنے والا مرد اکثر طوفان کی مثل آتا ہے جو اپنے پیچھے صرف اور صرف بربادی چھوڑ جاتا ہے۔ ایسی بربادی جو اگر جسم کو پامال نہ بھی کرے تو روح پر اپنی خراشیں ضرور ڈالتی ہے۔ جسم کے زخم بھر جاتے ہیں لیکن روح کے گھاؤ کبھی مندمل نہیں ہوتے اور اس بربادی کی یادیں عورت کو کبھی اپنے شوہر سے پوری طرح وفادار نہیں ہونے دیتیں۔ اور شوہر عورت کی زندگی میں اس بہار کے جھونکے کی طرح آتا ہے جسے جلد یا بدیر آنا ہی ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عورت کا جوڑا اس کے دنیا میں آنے سے پہلے آسمانوں پر بن چکا ہوتا ہے۔ اس جھونکے کا انتظار ذرا کٹھن ضرور ہوتا ہے مگر بیٹی۔ یہ اپنے ساتھ آبادی، سکون اور محبتیں لے کر آتا ہے۔ اس لئے کوشش کرنا کہ تم اس انتظار سے سانجھ پیدا کر سکو۔ میرا تم پر نہ کوئی زور ہے نہ میں تم پر نگاہ رکھوں گی۔ میں تم پر اعتماد بھی کر رہی ہوں اور تمہیں پوری آزادی بھی دے رہی ہوں کیونکہ تم جاہل ہو نہ غلام۔ طوفان سے آشنائی میں تمہارا بھلا ہے یا بہار کے انتظار میں۔ یہ فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔ میں اس لئے بھی یہ اعتبار کا کھیل کھیل رہی ہوں کہ مجھے اپنی تربیت کا امتحان مقصود ہے۔“

صفیہ ذرا رکی۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے دم بخود کھڑے طاہر کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہوئی۔

”میں نے اس بات پر زیادہ غور نہیں کیا طاہر۔ بس یہ سوچ لیا کہ جب کسی ایک مرد سے واسطہ ہونا ہی ہے تو پھر وہ میرا اپنا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی غیر کیوں ہو؟ ایسا مرد کیوں ہو جس سے دائمی بندھن باندھنے کا موسم بعد میں آئے اور طوفان کا خطرہ ہر وقت اس کے خیال کے ساتھ بندھا رہے۔ میں اس سے کیوں نہ آشنائی رکھوں جس کے ساتھ میرا جنم جنم کا بندھن پہلے بندھے اور جب وہ آئے تو میرے دامن میں ڈالنے کے لئے بہاریں ساتھ لے کر آئے۔ بس یہ سوچا اور میں نے اپنی ساری توجہ صرف اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اب اس دوران مجھے کسی نے پسندیدہ نظر سے دیکھا ہو تو میں کہہ نہیں سکتی۔ بہر حال میں نے اس طرف اپنے کسی خیال کو بھی کبھی نہ جانے دیا۔ مگر لگتا ہے آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔“ صفیہ کے لبوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔

طاہر تھرا کر رہ گیا۔ اسے ہوش سا آ گیا۔ شرمندگی اس کے روئیں روئیں سے پسینہ بن کر ابلی پڑ رہی تھی۔

سردیوں کی رات اس کے لئے حبس کی دوپہر بن گئی تھی۔

’’میں۔۔۔ میں۔۔۔‘‘ آواز طاہر کے گلے میں درد کا گولہ بن کر پھنس گئی۔

’’میں آپ کی مشکل آسان کر دیتی ہوں طاہر۔‘‘ صفیہ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ ’’کہتے ہیں کہ انسان اپنی عزیز ترین شے کی جھوٹی قسم کھائے تو وہ چیز اس سے چھن جاتی ہے۔ میرا جی تو چاہ رہا ہے کہ میں آپ کی قسم کھاؤں کیونکہ میں جھوٹ نہیں بول رہی لیکن آپ کو یقین دلانے کے لئے میں اپنی جان کی قسم کھاتی ہوں کہ کسی کو بھی اپنی جان سے زیادہ پیارا کچھ نہیں ہوتا۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے جو کہا سچ کہا‘ سچ کے سوا کچھ نہیں کہا می لارڈ۔‘‘ اس کا دایاں ہاتھ یوں بلند ہو گیا جیسے وہ عدالت میں حلف دے رہی ہو۔ ’’اگر میں نے جھوٹ بولا ہو تو مجھ پر خدا کا قہر نازل ہو اور صبح کا سورج مجھے زندہ۔۔۔‘‘

’’بس۔۔۔ بس۔‘‘ طاہر نے لپک کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’جو منہ میں آ رہا ہے‘ کہے جا رہی ہو۔‘‘ اس نے صفیہ کو بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کے بالوں میں چہرہ چھپایا اور پھٹ پڑا۔ ’’اک ذرا سی بات کو آتش فشاں بنا دیا ہے تم نے۔ ایک زخمی دل کا مالک ہوں میں۔ اگر تم سے مرہم مانگ لیا تو کون سی قیامت آ گئی جو تم مجھے یوں بے ستر کئے دے رہی ہو۔‘‘

’’آپ نے کم نشتر چلائے ہیں کیا؟‘‘ صفیہ کی آواز بھیگ گئی۔ ’’اپنی عزت کو دوسرے کے ساتھ منسوب کر دیا۔‘‘

’’میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا تھا۔ پھر بھی مجھے معاف کر دو۔‘‘ اس نے اپنی گرفت اور سخت کر دی۔

’’کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔‘‘ وہ مچل گئی۔

’’صفو۔‘‘ طاہر نے التجائیہ سرگوشی کی۔

’’ایک شرط پر۔‘‘ وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

’’کیا؟‘‘ طاہر نے اس کے پھیلتے کاجل کو نظروں سے چوم لیا۔

’’غدر مچانے کے آغاز میں آپ نے پوچھا تھا کہ میں کیا کروں؟‘‘

’’تو۔۔۔؟‘‘ طاہر کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

’’میں نے کہا تھا کہ یہ بھی میں آپ کو بتاتی ہوں کہ آپ کیا کریں۔ یاد ہے؟‘‘

’’بالکل یاد ہے۔‘‘

’’تو شرط یہ ہے کہ جو میں کہوں گی آپ کریں گے۔ بولئے منظور ہے؟‘‘ وہ شاید طاہر کا امتحان لے رہی تھی مگر

طاہر اب کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔

”مجھے سنے بغیر ہی منظور ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”نہیں۔ پہلے سن لیجئے۔ ہو سکتا ہے بعد میں آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔“

”جلدی سے کہہ ڈالو جو کہنا ہے تمہیں۔“ طاہر بے صبرا ہو گیا۔

”تو می لارڈ۔ مجھ پر، اپنی شریک حیات پر، جس کے آپ مجازی خدا ہیں، اعتماد کیجئے۔ اندھا نہ سہی، دیکھ بھال کر ہی سہی لیکن اعتماد ضرور کیجئے تاکہ میں اس بہار کی آمد کو محسوس کر سکوں جس کے انتظار میں، جس کی امید میں میں نے زندگی کے بائیس برس اندھی بہری بن کر گزار دیے۔“

”کیا مجھے زبان سے کہنا پڑے گا کہ میں اب تم پر ویسے ہی اعتماد کرتا ہوں جیسے خود پر۔“ طاہر نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اگر آپ کو خود پر اعتماد ہوتا تو ہماری پہلی ہی ملاقات یوں بادِ سموم کا شکار نہ ہوتی۔“ صفیہ کا لہجہ شکایتی ہو گیا۔ ”اچھا تو یہ ہے کہ مجھ سے پہلے خود پر، اپنے جذبوں پر اعتماد کرنا سیکھئے طاہر۔ ورنہ یہ کج بحثیاں زندگی کا معمول بن جائیں گی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔“ طاہر کا لہجہ بدل گیا۔ ایک عزم سا جھلکا اس کی آواز میں۔

”کیا میں اس پر یقین کر لوں؟“ صفیہ نے براہ راست طاہر کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہوں۔“ طاہر نے بیباکی سے اس کی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو جائیے۔ ہم نے آپ کو معاف کیا۔“ صفیہ نے ایک شانِ بے نیازی سے کہا اور ایک دم اس کے قدموں پر جھک گئی۔ ”میرے مجازی خدا ہیں آپ۔ لیکن کبھی میری ایسی آزمائش نہ لیجئے گا کہ جس میں پوری نہ اتر سکوں۔“

”صفو۔“ طاہر تڑپ کر جھکا اور اسے بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ نجانے کب سے رکے ہوئے آنسو صفیہ کی پلکوں تک آ گئے تھے۔ ”بس۔ یہ پہلے اور آخری نمکین قطرے ہیں جو تمہاری آنکھوں سے چھلک پڑے۔ دوبارہ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔“

کسی ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح اس نے صفیہ کو بازوؤں میں اٹھا کر پھولوں کی سیج کی طرف قدم بڑھا دیے اور صفیہ نے شرما کر اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔

* * *

صفیہ اور طاہر کی شادی کو پندرھواں دن تھا جب بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر ہاشمی عمرے کے لئے روانہ ہو گئے۔

محرم کے طور پر بیگم صاحبہ نے اپنا ایک یتیم بھانجا اعجاز ساتھ لے لیا۔ فرسٹ ایئر کا طالب علم اعجاز انہی کی زیر کفالت تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی مردانہ گروپ میں انہی کے ساتھ مگر ان سے الگ اپنے طور پر سفر کر رہے تھے۔ دوران سفر ان کا رابطہ بیگم صاحبہ سے اعجاز ہی کی معرفت رہتا تھا' کیونکہ بیگم صاحبہ کے لئے وہ اس مقدس سفر کے حوالے سے بہر حال نامحرم تھے۔

انہیں ائرپورٹ پر خدا حافظ کہہ کر وسیلہ خاتون اور صفیہ طاہر کی کار میں واپس لوٹ رہے تھے کہ راستے میں وسیلہ خاتون کا موبائل گنگنا اٹھا۔

’’ہیلو۔‘‘ انہوں نے کال اٹنڈ کی۔ ’’کون سرمد بیٹا؟‘‘ ایک دم ان کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ ’’کیسے ہو تم؟‘‘

ذرا دیر وہ سرمد کی بات سنتی رہیں۔ گردن گھما کر انہیں دیکھتی ہوئی صفیہ نے صاف محسوس کیا کہ دوسری طرف سے جو کہا جا رہا ہے اس کا ردِعمل وسیلہ خاتون کے چہرے پر اضطراب کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ طاہر خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

’’ڈاکٹر ہاشمی کے بیٹے سرمد کا فون ہے ناں؟‘‘ اس نے روا روی میں پوچھا۔

’’جی ہاں۔ میں تو اسی ایک ہی سرمد کو جانتی ہوں۔‘‘ صفیہ اس کی جانب متوجہ ہو کر ہولے سے مسکرائی۔ ’’پورا ایک سال میں اس سے ٹیوشن لیتی رہی ہوں۔ اس طرح میں اس کی شاگرد بھی ہوں۔ آپ کے ساتھ تو بڑی بے تکلفی ہو گی اس کی؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ طاہر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’بس علیک سلیک اچھی خاصی کہہ سکتی ہو۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر

ہاشمی ہمارے فیملی ممبر جیسے ہیں تاہم سرمد چونکہ زیادہ تر اپنی بیرون ملک تعلیم میں محو رہا اس لئے اس کے ساتھ بہت زیادہ وقت نہیں گزرا۔ ہماری شادی میں بھی وہ اسی لئے شریک نہیں تھا کہ ان دنوں وہ لندن میں ایم بی اے کر رہا ہے۔"

"طاہر بیٹے۔" اسی وقت وسیلہ خاتون کی آواز نے ان کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ان دونوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب انہوں نے سرمد سے گفتگو کا سلسلہ ختم کیا۔ "مجھے گھر پر اتار دینا۔"

"جی نہیں آنٹی۔ آپ ہمارے ساتھ چل رہی ہیں۔ جب تک امی واپس نہیں آ جاتیں' آپ وہیں رہیں گی۔" طاہر نے جواب دیا۔

"ارے نہیں بیٹا۔" وہ جلدی سے بولیں۔ "گھر بالکل اکیلا ہے اور زمانہ چوری چکاری کا ہے۔"

"آپ کے پاس جو سب سے قیمتی شے تھی' وہ تو آپ نے مجھے دے ڈالی آنٹی۔ اب کس چیز کی چوری کا اندیشہ ہے؟" طاہر نے دزدیدہ نگاہوں سے صفیہ کی جانب دیکھا۔

صفیہ کے رخ پر شرم نے سرخی بکھیر دی۔ اس نے حیا آلود مسکراہٹ کے ساتھ طاہر کے بازو پر چٹکی لی اور منہ پھیر لیا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔" وسیلہ خاتون کے لبوں سے نکلا۔ "لیکن میرا گھر پر رہنا ضروری ہے۔ ہاں اگر تم محسوس نہ کرو تو ایک آدھ دن کے لئے صفیہ کو میرے پاس چھوڑ دو۔"

"ایک آدھ دن کی بات ہے تو کوئی حرج نہیں آنٹی۔" طاہر نے گاڑی ان کے گھر کو جانے والی سڑک پر موڑ دی۔ "ابھی میں اسے آپ کے ہاں چھوڑ جاتا ہوں۔ رات کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا اور اس کے بعد ہم اپنے گھر چلے جائیں گے۔ رات کو رکنے سے معذرت۔"

"اللہ تم دونوں کو یونہی آباد اور خوش رکھے بیٹا۔" وسیلہ خاتون نے تشکر سے کہا۔ "یہ تمہاری محبت ہے اور میں اس میں دخل دینا پسند نہیں کروں گی۔ رات کو تم لوگ بیشک واپس چلے جانا۔"

"شکریہ آنٹی۔" طاہر نے گاڑی وسیلہ خاتون کے گھر کے سامنے روک دی۔

"آپ اندر تو آیئے۔ باہر ہی سے رخصت ہو جائیں گے کیا؟" صفیہ نے اترنے سے پہلے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ میں ذرا آفس کا چکر لگاؤں گا۔ شام کو آؤں گا تو تینوں گپ شپ کریں گے۔" طاہر نے مسکرا کر کہا۔ "اس وقت دس بجے ہیں۔ شام تک آنٹی سے جی بھر کر باتیں کر لو۔ رات کو ہمیں گھر لوٹ جانا ہے۔" وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرنے کے انداز میں یوں بولا' جیسے وعدہ لے رہا ہو۔

وسیلہ خاتون ''شام کو جلدی آ جانا بیٹے'' کہہ کر پچھلی سیٹ سے اتر گئیں۔ صفیہ اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتی ہوئی گاڑی سے نکلی اور گھر کے دروازے پر کھڑی تب تک اسے ہاتھ ہلاتی رہی جب تک اس کی گاڑی موڑ نہ مڑ گئی۔

☆

''ممانی۔'' صفیہ نے وسیلہ خاتون کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایک پل بھی صبر نہ کیا اور بول پڑی۔ ''کیا بات ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ سرمد کے فون نے آپ کو پریشان کر دیا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا؟ خیریت سے تو ہے ناں وہ؟''

''بتاتی ہوں بیٹی۔'' وسیلہ خاتون نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''تم ذرا مجھے پانی پلاؤ۔''

صفیہ اٹھی اور پانی کا گلاس لے آئی۔ وسیلہ خاتون نے پانی پیا۔ شال کے پلو سے ہونٹ خشک کئے اور گلاس تپائی پر رکھ دیا۔

''اب جلدی سے کہہ دیجئے ممانی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' صفیہ ان کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''صفیہ۔ پہلے مجھے ایک بات بتاؤ بیٹی۔'' وسیلہ خاتون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''حالانکہ مجھے یہ بات پوچھنا نہیں چاہئے کیونکہ مجھے تم نے کبھی ایسا کوئی اشارہ تک نہیں دیا پھر بھی اپنا وہم دور کرنے کو پوچھ رہی ہوں۔'' وہ رک گئیں۔

''پوچھئے ممانی۔ جھجکئے مت۔'' صفیہ نے ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے محبت سے کہا۔

''بیٹی۔ کیا سرمد تمہیں پسند کرتا تھا؟'' انہوں نے صفیہ کی طرف دیکھا۔

''مجھے؟'' صفیہ حیران سی ہو گئی۔ ''مگر یہ بات اب کیوں پوچھ رہی ہیں ممانی؟ جب پوچھنا چاہئے تھی تب تو آپ نے کسی کا نام لے کر نہ پوچھا۔ صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا میں کسی کو پسند کرتی ہوں؟ میں نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تھا اور آپ نے طاہر کے ساتھ میرے نام کی گرہ باندھ دی۔ اب اس سوال کا کیا موقع ہے؟''

''یہی بات تو مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے صفیہ بیٹی۔ تم اسے پسند نہیں کرتی تھیں مگر وہ تمہیں پسند کرتا تھا۔ یہی بات اس نے آج مجھے فون پر کہی۔''

''کیا؟'' صفیہ نے حیرت سے کہا اور اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''ممانی۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں صفیہ بیٹی۔ گاڑی میں اس سے کھل کر بات نہیں کی میں نے۔ وہاں طاہر بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شاید اسے بتایا نہیں کہ تمہاری اور طاہر کی شادی ہو چکی ہے۔''

''یہ اسے بتانے والی بات تھی بھی تو نہیں ممانی۔'' صفیہ حواس میں لوٹ آئی۔ ''لیکن وہ کہہ کیا رہا تھا؟''

’’یہ کہ اس کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا ہے۔ وہ پندرہ بیس دن میں پاکستان آ رہا ہے اور آتے ہی ڈاکٹر ہاشمی کو میرے پاس تمہارا ہاتھ مانگنے کے لئے بھیجے گا۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ صفیہ پوری جان سے لرز گئی۔ ’’ممانی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ اسے روکئے۔ میرا گھر۔۔۔ میرا گھر۔‘‘ اس کا گلا رندھ گیا۔ بات ادھوری رہ گئی۔

’’صفیہ۔‘‘ وسیلہ خاتون گھبرا گئیں۔ ’’بیٹی۔ اس میں ایسی پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اس وقت میں بازار میں ہوں۔ وہ مجھے آدھ گھنٹے بعد فون کرے۔ ابھی اس کا فون آئے گا تو میں اسے ساری بات کھل کر بتا دوں گی کہ تمہاری شادی طاہر سے ہو چکی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ اسے تمہاری اور طاہر کی شادی کے بارے میں علم نہیں ہے۔ جب اسے پتہ چلے گا تو وہ معاملے کو یہیں ختم کر دے گا۔ وہ ایک شریف زادہ ہے۔ مجھے اس سے کسی غلط رد عمل کی توقع نہیں ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ اگر بات کرنا پڑی تو میں ڈاکٹر صاحب سے بھی کروں گی۔‘‘

’’بات معمولی نہیں ہے ممانی۔‘‘ صفیہ نے آنکھیں خشک کیں اور وسیلہ خاتون کو اس ساری گفتگو کے لب لباب سے آگاہ کر دیا جس سے طاہر کے ساتھ سہاگ رات کی شروعات ہوئی تھی۔

’’اب بتایئے۔‘‘ اس نے آخر میں کہا۔ ’’اگر طاہر کو معلوم ہو گیا کہ سرمد مجھے پسند کرتا ہے تو۔۔۔؟‘‘ وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ بے بسی اور پریشانی نے اس کا رنگ روپ لمحوں میں کملا دیا تھا۔

’’تم حوصلے سے کام لو بیٹی۔‘‘ وسیلہ خاتون نے اس کی ہمت بندھائی۔ ’’اول تو یہ بات طاہر تک پہنچے گی نہیں۔ اسے کون بتائے گا؟ میں یا تم؟ اور سرمد بھی اس کے سامنے زبان کھولنے سے رہا۔ اور بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو طاہر کو یہ سوچنا ہو گا کہ سرمد تمہیں چاہتا ہے نہ کہ تم سرمد کو۔‘‘

’’یہ بات طاہر کو سمجھانا اتنا آسان نہیں ہے ممانی۔‘‘ صفیہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

’’اول تو ایسا موقع نہیں آئے گا بیٹی اور آ گیا تو میں خود طاہر سے بات کروں گی۔‘‘ وسیلہ خاتون نے اسے تسلی دی۔

’’نہیں ممانی۔ ہرگز نہیں۔‘‘ صفیہ نے گھبرا کر کہا۔ ’’یہ غضب نہ کیجئے گا۔ بات بگڑ جائے گی۔ میں خود ہی اس الجھن کو سلجھانے کی کوئی راہ نکالوں گی۔ آپ پلیز کبھی طاہر سے اس بارے میں کوئی بات نہ کیجئے گا۔‘‘

’’بیٹی۔‘‘ وسیلہ خاتون نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ’’یہ تم کس مصیبت میں آ گئیں؟‘‘ صفیہ نے ان کے سینے سے لگ کر آنکھیں موند لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

اسی وقت پاس تپائی پر پڑے فون کی بیل ہوئی۔ پٹ سے چونک کر صفیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وسیلہ

خاتون بھی ادھر متوجہ ہوئیں۔ سکرین پر سرمد کا موبائل نمبر ابھر چکا تھا۔ اس بار اس نے موبائل کے بجائے گھر کے نمبر پر رنگ کیا تھا۔

’’ممانی۔‘‘ گھبرا کر صفیہ نے وسیلہ خاتون کی جانب دیکھا۔

’’ششش۔‘‘ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے خود سے الگ کر دیا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ ’’صرف سننا۔ درمیان میں ہرگز بولنا نہیں۔‘‘ انہوں نے کہا اور چوتھی بیل پر وائس بٹن دبا کر ریسیور اٹھا لیا۔ اب سرمد کی ساری گفتگو صفیہ بھی سن سکتی تھی۔

’’ہیلو آنٹی۔‘‘ وسیلہ خاتون کے ریسیور اٹھاتے ہی سرمد کی بیتاب آواز ابھری۔

’’ہاں سرمد بیٹے۔ میں بول رہی ہوں۔‘‘ انہوں نے بیحد سنجیدگی سے کہا۔ کوئی اضطراب یا پریشانی لہجے سے ہویدا نہ تھی۔ البتہ پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن ضرور ابھر آئی تھی۔

’’جی آنٹی۔ میں آپ سے صفیہ کے بارے میں بات کر رہا تھا؟‘‘ سرمد کے لہجے میں اشتیاق کروٹیں لے رہا تھا۔

’’کہو بیٹے۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ وسیلہ خاتون نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

’’آنٹی۔ تفصیلی بات تو آپ سے ابو کریں گے۔ اس وقت تو میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ابو آپ کے پاس صفیہ کا میرے لئے ہاتھ مانگنے آئیں تو۔۔۔‘‘

وہ رکا تو وسیلہ خاتون کے ماتھے کی شکن ذرا گہری ہو گئی۔ انہوں نے صفیہ کی جانب دیکھا جو سرمد کی آواز صاف سن رہی تھی اور اس کا دل سینے میں یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے کوئی روڑی کوٹ رہا ہو۔

’’ہاں ہاں۔ رک کیوں گئے سرمد۔ بات مکمل کرو بیٹا۔‘‘ وسیلہ خاتون بولیں۔

’’بس آنٹی۔ یہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟‘‘

’’اس بات کا جواب تو میں بعد میں دوں گی بیٹے۔ پہلے یہ بتاؤ کیا صفیہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے؟‘‘ ان کا لہجہ بڑا ٹھہرا ہوا تھا۔

’’آنٹی۔‘‘ ایک دم سرمد کی آواز میں اضطراب امنڈ آیا۔ ’’یہ تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ صفیہ مجھے پسند کرتی ہے؟ تاہم یہ جانتا ہوں کہ وہ مجھے ناپسند نہیں کرتی۔‘‘

’’پسند یا ناپسند کرنا ایک الگ بات ہے بیٹے اور زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے کسی کو چن لینا اور بات۔ تم صفیہ کو اس نظر سے دیکھتے اور پسند کرتے ہو لیکن کیا اس نے بھی کبھی تمہیں اس نظر سے دیکھا ہے یا اس کی کسی بات سے

ایسا ظاہر ہوا ہے کہ وہ تم سے شادی کرنے میں انٹرسٹڈ ہے؟ ذرا سوچ کر جواب دینا بیٹے۔’’

‘‘نہیں آنٹی۔’’ سرمد نے صاف صاف کہا۔ ‘‘صفیہ نے کبھی کوئی اشارتاً بھی مجھے ایسا رسپانس نہیں دیا جس سے پتہ چلے کہ وہ مجھے اس حوالے سے پسند کرتی ہے۔’’

‘‘الحمدللہ۔’’ بے اختیار وسیلہ خاتون کے لبوں سے نکلا اور ان کے ماتھے کی شکن نے دم توڑ دیا۔

‘‘جی آنٹی۔’’ سرمد چونکا۔ ‘‘کیا کہا آپ نے؟’’

‘‘میں نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے بیٹے۔’’ انہوں نے کھینچ کر صفیہ کو اپنے ساتھ لگا لیا‘ جو کسی ننھی بچی کی طرح ان کے پہلو میں سمٹ کر یوں بیٹھ گئی جیسے اسے پناہ گاہ میسر آ گئی ہو۔

‘‘جی۔’’ وہ جیسے کچھ بھی نہ سمجھا۔

‘‘تو بیٹے۔ بات صاف ہو گئی کہ تم یک طرفہ طور پر صفیہ کو پسند کرتے ہو۔’’

‘‘جی آنٹی۔ ایسا ہی سمجھ لیں۔’’ وہ ادب سے بولا۔

‘‘اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے یہاں ہوتے ہوئے کیوں اس بات کو نہ چھیڑا بیٹے؟’’

‘‘ابو چاہتے تھے کہ میں ایم بی اے سے پہلے کسی ایسی بات میں نہ الجھوں جو میری تعلیم میں رکاوٹ بنے آنٹی۔ اسی لئے میں اب تک خاموش رہا۔’’

‘‘لیکن کیا تم نے ڈاکٹر صاحب پر اپنی پسند کا اظہار کیا؟ اشارتاً ہی سہی۔’’

‘‘جی نہیں آنٹی۔’’ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ‘‘میں اس سے پہلے آپ کا عندیہ چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ان سے بات کروں۔’’

‘‘اور اگر مجھے اس رشتے پر اعتراض ہو تو۔۔۔؟’’

‘‘جی۔’’ سرمد جیسے بھونچکا رہ گیا۔ ‘‘میں سمجھا نہیں آنٹی۔’’

‘‘تم نے بہت دیر کر دی بیٹے۔’’ وسیلہ خاتون کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔ ‘‘صفیہ کی شادی ہو چکی ہے۔’’

‘‘جی۔’’ سرمد چونک کر بولا۔ ‘‘کب آنٹی؟’’

‘‘اسی مہینے کے آغاز میں۔’’ انہوں نے دھیرے سے کہا۔

‘‘او۔۔۔ہ’’ سرمد کے لہجے میں تاریکی سی چھا گئی۔ ‘‘آنٹی۔۔۔’’ وہ اس سے زیادہ کہہ نہ سکا۔

‘‘تم نے خود دیر کر دی بیٹے۔ اگر تم جانے سے پہلے اپنے ابو سے بات کرتے تو شاید تمہاری آج کی مایوسی جنم نہ لیتی۔’’

جواب میں سپیکر پر سرمد کے گہرے گہرے سانسوں کی بازگشت کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ وسیلہ خاتون بھی خاموش رہیں۔ کتنی ہی دیر بعد دوسری جانب سے ایک شکستہ سی آواز ابھری۔

”مقدر آنٹی۔۔۔ مقدر۔۔۔ میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ کہئے صفیہ کی شادی کس سے ہوئی اور کیا اس میں اس کی پسند بھی شامل تھی؟“

”یہ ارینج میرج تھی سرمد۔ اور بیگم وجاہت کے بیٹے طاہر سے صفیہ کی شادی ہوئی ہے۔“

”کیا؟“ سرمد پر حیرت کا ایک اور حملہ ہوا۔ ”طاہر سے؟“

”ہاں۔ لیکن تم اس پر اتنے حیران کیوں ہو سرمد؟“ وسیلہ خاتون چونکیں۔

”کچھ نہیں آنٹی۔“ وہ سنبھل گیا۔ ”ایسے ہی بس۔۔۔“

”شاید دونوں خاندانوں کا سطحی فرق تمہیں حیران کر رہا ہے بیٹے۔“ وہ ہنسیں۔

”جی آنٹی۔“ سرمد خجل سا ہو گیا۔ ”شاید یہی بات ہے۔“

”شاید نہیں۔ یقیناً یہی بات ہے سرمد بیٹے۔ تاہم یہ بتا دوں کہ یہ شادی بیگم صاحبہ کی پسند اور اصرار پر ہوئی ہے۔ اور اب میری تم سے ایک درخواست ہے۔“

”آپ حکم دیجئے آنٹی۔“ سرمد نے دھیرے سے کہا۔

”بیٹا۔ عورت کی ازدواجی زندگی کانچ کا گھر ہوتی ہے جو شک کے سنگریزے کی ضرب بھی سہہ نہیں پاتا۔ میں چاہوں گی کہ صفیہ کے بارے میں تمہارے خیالات کبھی صفیہ یا طاہر تک نہ پہنچیں بیٹے۔ یہ ایک ماں کی التجا ہے۔“

”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آنٹی۔ آپ نے مجھ میں بازاری آدمیوں جیسی کیا بات دیکھی ہے جو آپ نے ایسا سوچا۔“

”یہ بات نہیں ہے بیٹے۔“ وسیلہ خاتون نے کہنا چاہا۔

”میں سمجھتا ہوں۔ آپ کے اندیشے درست ہیں مگر میں ڈاکٹر ہاشمی کا خون ہوں آنٹی۔ نجابت کیا ہوتی ہے اس کا پاس رکھنا ہو گا مجھے۔ آپ بے فکر رہئے۔ میرے لبوں پر کبھی ایسی کوئی بات نہیں آئے گی جو صفیہ کو دکھ دے یا اس کی زندگی میں گرداب پیدا کر دے۔“

”شکریہ سرمد۔“ وسیلہ خاتون کی آواز بھرا گئی۔ ”تم نے میرا مان رکھ لیا۔ میں تمہارے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔“

”اچھا آنٹی۔“ سرمد کے لبوں سے آہ نکلی۔ ”میری تمنا ہے صفیہ خوش رہے۔ آباد رہے۔۔۔ لیکن ایک پچھتاوا

زندگی بھر میری جان سے کھیلتا رہے گا آنٹی۔ کاش میں دیر نہ کرتا۔۔۔ کاش۔" اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

"سرمد۔" وسیلہ خاتون مضطرب سی ہو گئیں۔ "خود کو سنبھالو بیٹے۔ ابھی تو زندگی کا بڑا طویل راستہ طے کرنا ہے تمہیں۔ تم جوان ہو۔ خوبصورت ہو۔ پڑھے لکھے ہو۔ تمہیں بہت اچھی شریک حیات مل سکتی ہے۔۔۔"

"نہیں آنٹی۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔ "یہ باب تو اب بند ہو گیا۔"

"مگر کیوں سرمد۔ ایسی مایوسی کیوں؟"

"آنٹی۔ میں صفیہ کو پسند ہی نہیں کرتا' اس سے محبت کرتا تھا آنٹی۔ اور یہ حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا کہ میں آخری سانس تک اسے چاہتا رہوں۔" سرمد نے دل کا پھپھولا پھوڑ دیا۔ "اس کی جگہ کوئی اور لے لے' یہ تو میرے بس میں نہیں ہے آنٹی۔"

"سرمد۔" وسیلہ خاتون اس کے لہجے میں چھپے جذبے کو محسوس کر کے سو جان سے لرز گئیں۔ کچھ ایسا ہی حال صفیہ کا تھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟"

"بس آنٹی۔ جو کہنا تھا کہہ دیا۔ یہ آخری الفاظ تھے جو اس سانحے پر میری زبان سے نکلے۔ اب آج کے بعد اس بارے میں کبھی کوئی بات نہ ہو گی۔"

"سرمد۔" وسیلہ خاتون نے کہنا چاہا۔

"اللہ حافظ آنٹی۔ کبھی لوٹا تو آپ کی قدم بوسی کو ضرور حاضر ہوں گا۔ آپ نے دعا کا وعدہ کیا ہے۔ تو بس میرے لئے صرف یہ دعا کرتی رہیے گا کہ جس الاؤ نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے وہ کبھی سرد نہ ہونے پائے۔ مرنے کے بعد میری قبر کی مٹی سے بھی اس کی مہک آئے آنٹی۔ اللہ حافظ۔"

سرمد نے رابطہ کاٹ دیا۔

وسیلہ خاتون کے لبوں پر اس کا نام بکھر کر رہ گیا۔

صفیہ گم صُم ان کے پہلو سے لگی بیٹھی شاں شاں کی وہ آواز سن رہی تھی جو اس کے دماغ میں بگولے اڑا رہی تھی۔ آہستہ سے انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال کر وائس بٹن پش کیا اور سگنل کی ٹوں ٹوں نے دم توڑ دیا۔ صفیہ دھیرے سے سیدھی ہوئی۔ اپنے سُتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اٹھی۔ پلٹی اور سُن ہو کر رہ گئی۔

"آپ۔۔۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سرگوشی آزاد ہو گئی۔ اس کی آواز پر وسیلہ خاتون نے بھی پلٹ کر دیکھا اور ان کے چہرے پر بھی صفیہ کی طرح سرسوں پھیلتی چلی گئی۔ ان کی نگاہوں نے صفیہ کی نظروں کے مرکز کو اپنی گرفت میں لیا تو بت بن کر رہ گئیں۔

دروازے کے پٹ سے ٹیک لگائے طاہر کھڑا تھا۔ کب سے کھڑا تھا‘ کون جانے؟ اس کی آنکھیں بند تھیں اور لگتا تھا اس نے سب کچھ سُن لیا ہے۔

صفیہ نے گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح وسیلہ خاتون کی جانب دیکھا۔ وہ خود پریشانی کی انتہا سے گزر رہی تھیں‘ اسے کیا دلاسہ دیتیں۔ تاہم ذرا دیر بعد وہ سنبھلیں۔

’’ارے طاہر بیٹے۔ تم کب آئے؟‘‘ وہ اٹھ کر اس کی طرف بڑھیں۔ ’’آفس نہیں گئے کیا؟‘‘

دھیرے سے طاہر نے حرکت کی۔ رخ ان کی جانب کیا اور جیسے پورا زور لگا کر آنکھیں کھولیں۔ سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ دونوں ہی گھبرا گئیں۔

’’تم تو رات کو آنے والے تھے بیٹے۔‘‘ وسیلہ خاتون کے منہ سے بے تکی سی بات نکل گئی۔

’’رات۔۔۔‘‘ طاہر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور اس کی سپاٹ نظریں ان کے چہرے سے ہٹ کر صفیہ پر آ جمیں جو اسے وحشت زدگی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل سینے میں دھڑکنا بھول سا گیا۔ رنگ زرد سے اب بالکل سفید ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کسی نے اس کے بدن سے لہو کی ہر بوند نچوڑ لی ہے۔

’’رات تو کب کی آ چکی آنٹی۔ مجھے ہی پتہ نہیں چلا۔‘‘ وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ’’کیوں صفی؟‘‘ اس نے اسے صفو کے بجائے صفی کہہ کر پکارا تو صفیہ کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور صوفے پر گر پڑی۔

’’آپ۔۔۔ آپ۔۔۔‘‘ اس کے ہونٹ ہلے آواز نہ سنائی دی۔ اس کی سہمی ہوئی نظریں طاہر کے ویران ویران چہرے سے الجھ کر رہ گئیں۔

’’بیٹھو بیٹے۔‘‘ وسیلہ خاتون نے سنبھالا لیا۔

’’چلیں صفی۔‘‘ طاہر نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہ تھی۔ وہ صفیہ سے مخاطب تھا۔

صفیہ نے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے ساری جان سے حرکت کرنا چاہی اور بڑی مشکل سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

طاہر نے ہاتھ بڑھایا۔ صفیہ نے اپنا سرد اور بے جان ہاتھ اس کے تپتے ہوئے ہاتھ میں دے دیا اور کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ طاہر اسے لئے لئے زندگی سے محروم قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔

وسیلہ خاتون کمرے کے وسط میں اجڑی اجڑی کھڑی خالی دروازے کو تک رہی تھیں جہاں سے ابھی ابھی جیسے کوئی جنازہ باہر گیا تھا۔

☆

وسیلہ خاتون کے گھر سے سلطان والا تک کا سفر قبرستان جیسی خاموشی کے ساتھ طے ہوا تھا۔ صفیہ پر اس چپ نے ایک عجیب اثر کیا۔ اس کا دل دھیرے دھیرے قابو میں آ گیا۔ حواس میں ایک ٹھہراؤ نمودار ہوا اور گھر کے پورچ میں گاڑی رکی تو وہ کافی حد تک پُرسکون ہو چکی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ اس کا ضمیر صاف تھا۔ مطمئن تھا۔ موجودہ صورتحال میں اس کا دامن بالکل پاک تھا۔

طاہر سارا راستہ گم صم گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ اس نے صفیہ کے جانب دیکھا نہ زبان سے ایک لفظ کہا۔ گاڑی کا انجن بند کر کے وہ اپنی طرف کے دروازے سے باہر نکلا۔ صفیہ بھی تب تک گاڑی سے اتر چکی تھی۔ طاہر نے گاڑی کی چابیاں آٹھ دس قدم دور کھڑے ڈرائیور کی جانب اچھالیں اور تھکے تھکے قدموں سے گھوم کر صفیہ کی طرف آ گیا جو اسی کی منتظر کھڑی تھی۔ طاہر کا سُتا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کا دل ایک بار پھر ہول گیا تاہم اس نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے دیا۔ طاہر نے اس کے شانوں پر بازو دراز کرتے ہوئے جیسے اس کا سہارا لیا۔ صفیہ نے جلدی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اپنے دائیں شانے سے لٹکتا اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ تھامتے ہی وہ بری طرح گھبرا گئی۔ طاہر آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے متوحش نظروں سے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ طاہر کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور لگتا تھا اگلے چند لمحوں میں وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے طاہر کے بدن کا بوجھ صفیہ پر آ رہا تھا۔ اس نے سیف کو آواز دینے کا ارادہ کیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے خود ہی طاہر کو سنبھال لیا اور حتی الامکان سرعت سے اسے اندر لے آئی۔

سیڑھیاں چیونٹی کی رفتار سے طے کی گئیں۔ پھر خواب گاہ میں پہنچتے ہی طاہر بستر پر گرا اور بے سُرت ہو گیا۔

صفیہ نے اس کا جسم بستر پر ترتیب سے درست کیا اور ڈاکٹر ہاشمی کے ہاسپٹل فون کر دیا۔ پندرہ منٹ میں وہاں سے ڈاکٹر ہارون ایک نرس کے ساتھ آ پہنچے۔ صفیہ خاموش کھڑی ان کی کارروائی دیکھتی رہی۔ فوری طور پر بخار کا انجکشن دے کر گلوکوز ڈرپ لگا دی گئی۔ دوا کی تفصیل نرس کو سمجھا کر ڈاکٹر ہارون صفیہ کے قریب آئے۔

”مسز طاہر۔ اچانک بخار کا یہ اٹیک بڑا سیریس کنڈیشن کا حامل ہے۔ لگتا ہے مسٹر طاہر نے کوئی زبردست شاک برداشت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے۔ آپ چاہیں تو دوسرے کمرے میں آرام کر سکتی ہیں۔ جاگنے کے لئے نرس موجود ہے۔ وہ مسٹر طاہر کی تمام کیفیات سے مجھے باخبر رکھے گی۔ میری ضرورت ہوئی تو میں آپ کے بلانے سے پہلے یہاں موجود ہوں گا۔ اب آپ کچھ پوچھنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔“

”جی۔ کچھ نہیں۔“ ہولے سے صفیہ نے کہا اور بڑی گہری نظر سے طاہر کی جانب دیکھا جس کا زرد چہرہ اس کا

دل دہلا رہا تھا۔

''تو مجھے اجازت دیجئے۔'' ڈاکٹر ہارون نے نرس کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کمرے سے نکل گئے۔

صفیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے بستر کے قریب چلی آئی۔ نرس نے طاہر کی نبض چیک کی اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''بخار کم ہو رہا ہے۔'' وہ جیسے خود سے بولی۔

یہ سن کر صفیہ کے سینے سے بوجھ سا ہٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر دیکھا جیسے اللہ کا شکر ادا کر رہی ہو۔ پھر پاس پڑی کرسی کو بستر کے مزید قریب کیا اور بیٹھ گئی۔ اسی وقت اس کی نظر بوڑھے سیف پر پڑی جو دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔

''ارے بابا۔ آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟'' صفیہ کرسی سے اٹھی۔

''بیٹھی رہئے چھوٹی بی بی۔'' سیف قریب چلا آیا۔ اس نے کچھ پڑھ کر طاہر کے چہرے کی جانب پھونک ماری اور دعائیہ انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیر لئے۔ ''اللہ کرم کرے گا۔ آپ گھبرایئے نہیں چھوٹی بی بی۔'' سیف نے اسے اپنی بوڑھی آنکھوں سے تشفی کا پیغام دیتے ہوئے کہا۔ بے اختیار وہ مسکرا دی۔

''آپ دعا کر رہے ہیں تو میں کیوں گھبراؤں گی بابا۔''

''آپ کے لئے کھانا لگا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بابا۔ مجھے ابھی بھوک نہیں۔ ہاں ان سے پوچھ لو۔'' صفیہ نے نرس کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا نام شمیم ہے میڈم۔'' نرس نے صفیہ کو بتایا۔ پھر سیف کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''ابھی بارہ بجے ہیں بابا۔ میں ایک بجے کھانا کھاؤں گی۔''

''جی بہتر۔'' سیف کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

دوپہر سے شام ہوئی اور شام سے رات۔ اس دوران ڈاکٹر ہارون کو نرس شمیم نے دو تین بار طاہر کی کیفیت سے آگاہ کیا۔ بخار کا زور ختم ہو گیا تھا تاہم ابھی پوری طرح اترا نہیں تھا اور طاہر ہوش میں بھی نہ آیا تھا۔ صفیہ اس بات سے متفکر ہوئی تو نرس نے اسے بتایا کہ طاہر کو گلوکوز ڈرپ میں نیند کا انجکشن دیا گیا ہے۔ اب یہ غنودگی اسی کے باعث ہے۔

رات کے دس بجے تو شمیم نے ڈاکٹر ہارون کو ایک بار پھر طاہر کی حالت سے موبائل پر آگاہ کیا اور بتایا کہ بخار ٹوٹ گیا ہے۔ اب ٹمپریچر نارمل ہے۔ ڈاکٹر ہارون نے اسے ہدایت کی کہ دوسری گلوکوز ڈرپ مع انجکشنز لگا دی جائے۔ صبح تک اسے ابھی مزید نیند کی ضرورت ہے۔

''مسز طاہر سے میری بات کراؤ۔'' ڈاکٹر ہارون نے کہا تو شمیم نے موبائل صفیہ کو تھما دیا۔ ''ڈاکٹر صاحب بات کریں گے۔''

''مبارک ہو مسز طاہر۔ بخار ٹوٹ گیا۔''

''شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ یہ سب اللہ کے کرم اور آپ کی کوشش سے ہوا'' صفیہ نے ممنونیت سے کہا۔

''جی جی۔'' وہ ہولے سے ہنسے۔ ''میں دوسری نرس کو بھیج رہا ہوں۔ شمیم کی ڈیوٹی آف ہو رہی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ کیا یہ ضروری ہے؟ میرا مطلب ہے دوسری نرس کا ڈیوٹی پر آنا۔۔۔''

''جی ایسا ضروری بھی نہیں لیکن اگر مسٹر طاہر کے ہوش میں آنے تک کوئی نرس ان کے پاس رہے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔'' ڈاکٹر ہارون نے بتایا۔

''اگر یہ ضروری نہیں ہے ڈاکٹر صاحب تو آپ دوسری نرس کو مت بھیجئے۔ میں طاہر کی دیکھ بھال خود کر سکتی ہوں۔''

''آر یو شیور؟'' ڈاکٹر ہارون نے پوچھا۔

''ویری مچ شیور۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''تو ٹھیک ہے۔ تاہم ذرا سی بھی تشویش کی بات ہو تو فوراً مجھے فون کیجئے گا۔ یہ مت سوچئے گا کہ رات یا دن کا کون سا پہر چل رہا ہے۔ شمیم سے دوا کے بارے میں سمجھ لیجئے اور ایک تکلیف یہ کیجئے کہ اسے وہیں سے اس کے گھر بھجوا دیجئے۔''

''جی بہتر۔'' صفیہ نے موبائل شمیم کو تھما دیا' جو طاہر کو دوسری ڈرپ لگا کر اس کی سپیڈ چیک کر رہی تھی۔

''شمیم۔ تم ڈرپ ارینج کر کے وہیں سے گھر چلی جاؤ۔ دوا مسٹر طاہر کو کب کب اور کیسے دینا ہے' یہ مسز طاہر کو سمجھا دو۔''

''یس ڈاکٹر۔'' اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

''او کے۔ گڈ نائٹ۔''

''گڈ نائٹ سر۔'' شمیم نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈالا اور صفیہ کو دوا کے بارے میں بتانے لگی' جو چند گولیوں اور ایک سیرپ پر مشتمل تھی۔ صفیہ نے دواؤں کی ٹرے تپائی پر رکھ کر سیف کو آواز دی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو صفیہ نے کہا۔

''بابا۔ حمید سے کہئے' انہیں ان کے گھر ڈراپ کر آئے۔''

’’جی بہتر۔‘‘ سیف نے مختصر جواب دیا اور شمیم صفیہ کو سلام کر کے رخصت ہو گئی۔ شمیم کو ڈرائیور حمید کے ساتھ روانہ کر کے سیف واپس کمرے میں آیا۔

’’چھوٹی بی بی۔ آپ کے لئے کھانا لگاؤں۔ آپ نے صبح کا ناشتہ کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک آپ نے بالکل کچھ نہیں کھایا۔‘‘

’’بھوک نہیں ہے بابا۔‘‘ صفیہ نے طاہر کے جسم پر کمبل درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ’’جب بھوک محسوس ہو گی، میں بتا دوں گی۔‘‘

’’میں ضد تو نہیں کر سکتا چھوٹی بی بی مگر اس طرح مسلسل خالی پیٹ رہ کر آپ خود بیمار ہو جائیں گی۔ اللہ نے کرم کر دیا ہے۔ اب پریشانی کی کیا بات ہے جو آپ کو بھوک نہیں لگ رہی۔‘‘

’’بابا۔‘‘ صفیہ طاہر کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’طاہر نے کچھ کھایا ہے جو میں کھا لوں؟ جب یہ ہوش میں آ جائیں گے تو کھانا پینا بھی سوجھ جائے گا۔‘‘

سیف کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر اس کی نظروں میں عجیب سی چمک ابھری۔ ایسی چمک جو کسی بوڑھے باپ کی نگاہوں میں اس وقت جنم لیتی ہے جب وہ اپنی اولاد پر فخر محسوس کرتا ہے۔ اس نے طاہر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بیٹھتی ہوئی صفیہ کی جانب دیکھا اور ’’جیتی رہئے چھوٹی بی بی۔‘‘ کی سرگوشی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

* * *

کراہ کر طاہر نے پلکوں کو حرکت دی اور بستر کی پٹی پر سر رکھے بیٹھی صفیہ بجلی کی سرعت سے سیدھی ہو گئی۔ طاہر کا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا جسے اس نے اپنے رخسار سے لگا رکھا تھا۔

”طاہر۔“ اس کا ہاتھ چومتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر جھک گئی۔

”صفی۔“ طاہر کے لبوں سے نکلا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”جان صفو۔“ صفیہ وارفتگی سے بولی اور اس کی نگاہوں کے حلقے میں در آئی۔ ”یہ صفو سے صفی کیوں کر دیا مجھے آپ نے؟“ شکایت بھرے لہجے میں اس نے پوچھا۔

طاہر نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔

”طاہر۔“ صفیہ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ ”طاہر میری جان۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ اس طرح مجھے رگ رگ ذبح مت کیجئے۔ ایک ہی بار جان لے لیجئے۔ میں اُف نہ کروں گی مگر اس طرح خود کو اذیت دے کر مجھے پل پل ہلکان مت کیجئے طاہر۔ مت کیجئے۔“ وہ اس کے سینے پر مچل کر بلک پڑی۔

”میں کیا کروں صفی۔۔۔ کیا کروں؟“ طاہر سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ اس کی آواز زخم زخم ہو رہی تھی۔ ”مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔۔۔“

”آپ کیا کریں‘ یہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں طاہر۔ مجھ پر‘ اپنے آپ پر‘ اپنی محبت پر اعتماد کیجئے۔ اور رہی بات برداشت کرنے کی تو آپ کیا برداشت نہیں کر پا رہے‘ یہ میں جانتی ہوں لیکن اس میں میرا کتنا قصور ہے‘ آپ یہ بھی تو جانتے ہیں۔“

”ہاں۔“ طاہر کی آواز میں درد ابھرا۔ ”تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں صفی مگر میں اس دل کا کیا کروں جو یہ سوچ کر ہی ہلکان ہو گیا کہ کوئی اور بھی ہے جو کہیں دور رہ کر ہی سہی‘ مگر تمہیں چاہتا ہے۔ تم سے عشق کرتا ہے۔ تمہارے لئے جوگ لے چکا ہے۔“

’’تو اس سے آپ کو یا مجھے کیا فرق پڑتا ہے طاہر؟ ہمارا اس کے اس فعل سے کیا تعلق؟ کیا لینا دینا ہے ہمیں اس کے اس فیصلے سے؟‘‘ صفیہ نے سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ’’آپ میرے لئے ہیں اور میں آپ کے لئے۔ بس یہی ہماری دنیا ہے جس کے اندر ہمیں رہنا ہے۔ اس سے باہر کیا ہے‘ کیوں ہے‘ اس سے ہمیں کیا سروکار طاہر۔‘‘ اس نے طاہر کی آنکھوں سے بہتے اشکوں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔

’’یہ ایسا آسان نہیں ہے صفی۔‘‘ طاہر نے پلکیں موند لیں۔ ’’بڑا مشکل ہے یہ سہنا کہ کوئی اور بھی میری صفو کو چاہے اور میں اس سے باخبر ہو کر بھی چین سے جیتا رہوں۔‘‘

’’یہ پاگل پن ہے طاہر۔‘‘ صفیہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ’’خود کو سنبھالئے۔ بے بنیاد شک کی آگ میں خود کو مت جلایئے۔‘‘

’’شک نہیں صفی۔‘‘ طاہر نے آنکھیں کھول دیں۔ ’’شک تو میں تم پر کر ہی نہیں سکتا کہ تم اس معاملے میں کسی طور بھی انوالو نہیں ہو۔ شک نہیں‘ ایک خوف ہے جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔‘‘

’’خوف؟‘‘ صفیہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ ’’کیسا خوف طاہر؟ کھل کر کہئے۔‘‘

’’تمہارے چھن جانے کا خوف صفی۔‘‘ وہ کہتا چلا گیا اور صفیہ بُت بنی اسے تکتی رہی۔ سنتی رہی۔

’’خوف یہ ہے کہ وہ جو تمہارے لئے دنیا تیاگ رہا ہے‘ کسی دن سامنے آ گیا تو کیا ہو گا؟‘‘

’’کیا ہو گا؟‘‘ صفیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ’’آپ کا خیال ہے کہ وہ مجھے آپ سے چھین کر لے جائے گا۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ طاہر نے نفی میں ہولے سے سر ہلایا۔ ’’یہ نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا مگر جو ہو گا وہ اس سے بہت آگے کی بات ہے صفی۔‘‘

’’آپ کہہ ڈالئے طاہر۔ اندیشے اور خوف کا جو ناگ آپ کو اندر ہی اندر ڈس رہا ہے اسے الفاظ کے راستے باہر نکال دیجئے۔ یہ مت سوچئے کہ الفاظ کتنے زہریلے ہوں گے۔ بس کہہ جایئے جو آپ کو کہنا ہے۔‘‘

’’صفی۔‘‘ طاہر نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ’’پتھر پر پانی کی بوند مسلسل گرتی رہے تو اس میں چھید کر دیتی ہے۔ اس کا جوگ اگر تمہیں ایک پل کو بھی متاثر کر گیا تو وہ کنڈلی مار کر تمہارے دل میں آ بیٹھے گا اور اس کا یہ آ بیٹھنا میرے اور تمہارے درمیان ایک پل ہی کی سہی‘ جس دوری کو جنم دے گا وہ شیشے میں آ جانے والے اس بال کی مانند ہو گی جس کا کوئی علاج نہیں ہوا کرتا۔‘‘

’’طاہر۔۔۔‘‘ صفیہ اسے متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ’’یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟‘‘

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں صفی۔“ اس کی آواز لرز گئی۔ ”میں نے اب تک کی زندگی میں صرف اور صرف ناکامیوں کا منہ دیکھا ہے۔ چاہا کہ شادی سے پہلے کسی کی ان چھوئی محبت پالوں۔ نہ پا سکا۔ پھر چاہا کہ جس سے زندگی کے سفر کا سودا کروں، وہ ایسا ہو جسے کسی اور سے کوئی تعلق نہ ہو ایسا ہی ہوا۔ اب پتہ چلا کہ میرا ہمسفر تو ان چھوا بھی ہے اور کسی بھی غیر سے بے تعلق بھی، مگر کوئی ایک اور ایسا ہے جو کہیں دور بیٹھا اس کی پرستش کرتا ہے۔ اسے پوجتا ہے۔ اور ایسا دیوانہ پجاری کبھی سامنے آ جائے تو دیوی پر اس کی تپسیا کیا اثر کرے گی، یہ خوف میرے اندر ڈنک مار رہا ہے؟“

”طاہر۔“ صفیہ نے اسے والہانہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سرمد کی دیوانگی سے تو بے خبر ہوں کہ وہ جو کہہ رہا تھا اس میں کتنی حقیقت تھی اور کتنا فسانہ؟ مگر آپ کا پاگل پن ضرور میری جان لے لے گا۔ آپ ایک فرضی خوف کے سائے اپنی اور میری زندگی پر مسلط کر کے کیوں عذاب مول لے رہے ہیں؟ اس کا کوئی علاج بھی ہے؟ مجھے صرف یہ بتایئے کہ میں کیا کروں جو آپ کے دل سے یہ وہم نکل جائے اور آپ اور میں ایک نارمل زندگی گزار سکیں۔ بتایئے طاہر۔ اگر اس کے لئے میں اپنی جان دے کر بھی آپ کو اس خوف سے نجات دلا سکی تو مجھے کوئی عذر نہ ہو گا اور اگر اس کے لئے سرمد کی جان لینا لازم ہے تو میں اسے آپ کے وہم پر قربان کروں گی طاہر۔ مگر آپ کو اس اذیت سے چھڑا کر رہوں گی۔ بتایئے۔ کیا کروں میں؟ حکم دیجئے۔“ اس نے طاہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”کیا کہہ رہی ہو صفی؟“ طاہر تڑپ گیا۔ ”تم اپنی جان دینے کی بات کر رہی ہو؟ میری کس بات سے ظاہر ہوا کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ اور رہی بات سرمد کی تو اسے راستے سے ہٹا دینا اگر ضروری ہوا تو یہ کام میں خود کروں گا، تم ایسا کیوں کرو گی؟ لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ایسا کوئی فیصلہ کیا جائے۔“

”تو پھر خود کو سنبھالئے طاہر۔ خود پر نہیں، مجھ پر رحم کیجئے۔ آپ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔“ صفیہ نے سر اس کے سینے پر ڈال دیا۔ آہستہ سے طاہر کا ہاتھ حرکت میں آیا اور صفیہ کی زلفوں سے کھیلنے لگا۔

صفیہ سسک رہی تھی۔

طاہر کی آنکھوں میں بھی نمی چھلک رہی تھی۔

وقت کیا کھیل کھیلنے والا تھا، دونوں اس سے بے خبر اندیشوں اور خوف کی پرچھائیوں سے دل کا دامن چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دل۔۔۔ جو سمجھائے نہیں سمجھتا اور بہلائے نہیں بہلا کرتا۔

☆

دو ہی دن میں طاہر نچڑ کر رہ گیا۔ کہنے کو بخار تو اتر گیا مگر وہ کیسا بخار تھا کہ جس کی دی ہوئی بربادی نے طاہر کے جسم و جان میں ڈیرے ڈال لئے۔ وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گیا۔ صفیہ رات دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتی۔ اسے

بہلانے' ہنسانے' اس کے چہرے کی رونق بحال کرنے کے لئے سو سو جتن کرتی مگر طاہر سوائے پھیکے سے انداز میں مسکرا دینے اور اس کی ہر بات کا مختصر سا جواب دینے کے سوا کچھ بھی رسپانس نہ دیتا۔

وسیلہ خاتون نے دو تین بار فون پر صفیہ سے بات کی۔ اسے کریدنا چاہا کہ صورتحال کیا ہے؟ صفیہ نے انہیں سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور کہا کہ وہ اس معاملے میں بالکل پریشان ہوں نہ اس میں دخل دینے کی کوشش کریں۔ کسی بھی تیسرے فرد کا اس صورتحال میں در آنا مزید الجھن پیدا کر سکتا تھا' یہ صفیہ کی اپنی سوچ تھی اور شاید کسی حد تک یہ درست بھی تھا' اس لئے وسیلہ خاتون نے اس کے کہنے پر فون پر ہی طاہر کی خیر خبر پوچھ لی' خود آنے سے گریز کیا۔

ڈاکٹر ہاشمی اور بیگم صاحبہ کا صرف ایک فون آیا تھا۔ وہ خیریت سے تھے اور انہوں نے اپنا قیام دیارِ حبیب ﷺ میں بڑھا لیا تھا۔ ان کی جلد واپسی کا ابھی کوئی امکان نہ تھا۔ آفس کے معاملات امبر بخوبی کنٹرول کر رہی تھی۔ اسے طاہر کی بیماری کا قطعاً علم نہ تھا۔ صفیہ نے بھی اسے موجودہ صورتحال سے باخبر کرنا ضروری نہ سمجھا کہ اس سے سوائے بات پھیلنے کے اور کیا ہوتا؟ وہ جانتی تھی کہ یہ بات طاہر بھی پسند نہ کرے گا۔ گھر کے ملازموں میں بابا سیف اور ڈرائیور حمید کو صرف یہ پتہ تھا کہ صاحب کو بڑا شدید بخار ہے اور بس۔ جو ملازمہ صفائی اور باہر کے کاموں کے لئے تھی' اسے اس بات کی ہوا بھی نہ لگی کہ طاہر کی طبیعت خراب ہے۔ کچن کا کام ہوتا ہی کتنا تھا' سیف کو اس کے لئے کسی معاون کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اصل بات پردے ہی میں رہی۔

آج پانچواں دن تھا۔ طاہر نے شیو بنائی' غسل کیا اور دس بجے کے قریب سردیوں کی دھوپ کے لئے لان میں آ بیٹھا۔

صفیہ نے اس کے چہرے پر کچھ رونق دیکھی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے سیف سے چائے بنا کر لان ہی میں لے آنے کو کہا اور خود چھوٹا سا بیگ تھامے طاہر کے پاس چلی آئی۔

وہ بید کی کرسی پر سر سینے پر جھکائے نجانے کس سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ صفیہ اس کے قریب پہنچی تو اس کی آہٹ پر وہ چونکا۔

''کیا سوچ رہے ہیں میرے حضور؟'' صفیہ نے کرسی سے کشن اٹھا کر نیچے گھاس پر ڈالا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''ارے ارے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''یہ کیا۔ اوپر بیٹھوناں۔'' اس نے پاؤں کھینچ لئے۔

''خاموش۔'' صفیہ نے آنکھیں نکالیں۔ ''چائے آنے تک مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے۔'' کہہ کر اس نے طاہر کے پاؤں تھام کر اپنی گود میں رکھ لئے۔

”ارے۔ کیا کر رہی ہو بھئی۔ کسی ملازم نے دیکھ لیا تو۔۔۔؟“ اس نے پاؤں واپس کھینچنا چاہے۔

”تو کیا ہوگا جناب عالی؟ میں کون سا آپ کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت کرنے جا رہی ہوں۔ ذرا دیکھئے۔ کس قدر خشکی ہو رہی ہے جلد پر۔“ صفیہ نے اس کے پاؤں پھر گود میں ڈال لئے اور بائیں ہاتھ سے بیگ کھول کر اس میں سے نیل کٹر نکال لیا۔

”ارے بابا۔ یہ کام میں خود کر لوں گا۔ تم رہنے دو۔“ طاہر نے اسے روکنا چاہا۔

”اگر اب آپ نے پاؤں واپس کھینچا ناں تو میں یہ پیر میں چبھو دوں گی۔“ صفیہ نے اسے نیل کٹر میں لگا چھوٹا سا چاقو دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔ اس کے بچگانہ، معصوم اور محبت بھرے لہجے پر طاہر بے اختیار مسکرا دیا اور پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”یہ ہوئی ناں اچھے بچوں والی بات۔“ وہ خوش ہو گئی۔

پھر پہلے اس نے طاہر کے ہاتھ، پیروں کے ناخن کاٹے۔ اس کے بعد اس کے ہاتھوں، پیروں اور آخر میں پنڈلیوں پر وائٹ جیل مالش کی۔ طاہر خاموشی سے اسے یہ سب کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ یوں اپنے کام میں مگن تھی جیسے اس سے بڑا کام آج اسے اور کوئی نہ کرنا ہو۔ جب سیف چائے رکھ کر گیا تو وہ لان کے گوشے میں لگے نل پر ہاتھ دھو کر فارغ ہو چکی تھی۔

”یہ ملنگوں والی عادت چھوڑ دیجئے۔ اپنا خیال رکھا کیجئے۔ کل کو اگر میں نہ رہی تو آپ کو تو ہفتے بھر میں جوئیں پڑ جائیں گی۔“ واپس آ کر چائے بناتے ہوئے اس نے طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”کہاں جانا ہے تمہیں؟“ طاہر اب اسے نام لے کر بلانے سے احتراز کرتا تھا، یہ بات صفیہ نے محسوس کر لی تھی مگر اس نے کسی بھی بات پر بحث یا اعتراض کرنے کا خیال فی الحال ترک کر دیا تھا۔ اسے حالات اور خاص طور پر طاہر کے نارمل ہونے تک انتظار کرنا تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ انتظار سالوں پر بھی محیط ہو سکتا ہے، مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ طاہر کے دل میں اپنا مقام دوبارہ اجاگر ہونے تک وہ زبان سی رکھے گی۔ حق طلب نہ کرے گی اور فرض کو اوڑھنا بچھونا بنا لے گی۔ اب رات دن یہی کر رہی تھی وہ۔

”زندگی کا کیا بھروسہ ہے میرے حضور؟ جانے کب بلاوا آ جائے۔“ وہ چائے کا کپ اس کی طرف سرکاتے ہوئے بولی۔ ”اس لئے اس کنیز کی موجودگی میں اپنا آپ سنبھال لینا سیکھ لیجئے۔ ملازم بہرحال ملازم ہوتے ہیں، وہ وقت پر کھانا کپڑا تو مہیا کر سکتے ہیں، بے وقت خدمت سے اکتا جاتے ہیں۔“

”تم بھی کہیں اکتا تو نہیں گئیں؟“ طاہر نے اسے غور سے دیکھا۔

’’میں۔۔؟‘‘ صفیہ نے اسے شکوے بھرے انداز میں دیکھا مگر دوسرے ہی پل اس کی آنکھیں شفاف ہو گئیں۔ ’’میں بھلا کیوں اکتاؤں گی۔ میں ملازم نہیں آپ کی کنیز ہوں اور کنیز خریدا ہوا وہ مال ہوتا ہے میرے حضور جس کے دل سے اکتانے کی حس ختم کر کے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ محبت‘ خلوص اور ایثار کی دھک بھر دیتا ہے۔‘‘

’’تو میں نے تمہیں خریدا ہے؟‘‘ طاہر نے چسکی لے کر کپ واپس رکھ دیا۔

’’جی ہاں۔‘‘ صفیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’اپنی محبت‘ اپنی توجہ اور اپنے پیار کے عوض آپ اس کنیز‘ اس باندی کو کب سے خرید چکے ہیں۔‘‘

طاہر لاجواب ہو گیا۔ دل میں ایک کسک سی ابھری۔ اس کی محبت اور توجہ سے تو صفیہ کتنے ہی دنوں سے محروم تھی۔ اب شاید وہ اس پر طنز کر رہی تھی یا اسے اس کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے صفیہ کی جانب دیکھا۔ وہاں اسے طنز کی کوئی جھلک نہ ملی تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

صفیہ سے بخار کے اٹیک کی رات اس کی بڑی کھل کر بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسے نارمل ہو جانا چاہئے تھا مگر وہ اب تک دل و دماغ کی جنگ میں الجھا ہوا تھا۔ ابھی تک وہ خود کو واپس پہلی پوزیشن پر نہ لا سکا تھا‘ جہاں صرف وہ اور صفو تھے۔ جہاں ابھی صفی نے جنم نہ لیا تھا۔ اور اب تو صفی بھی پردے کے پیچھے چلی گئی تھی۔ وہ حتی الامکان اس کا نام لینے سے گریز کرتا تھا۔

چائے ختم ہو گئی۔ سیف برتن لے گیا۔

’’آج کہیں باہر چلیں۔‘‘ صفیہ نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

’’کہاں؟‘‘ طاہر کی نگاہیں اس سے ملیں۔

’’جہاں بھی آپ لے جائیں۔‘‘

’’جہاں تم جانا چاہو‘ چلے چلیں گے۔‘‘ طاہر نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا۔

’’دو چار دن کے لئے گاؤں نہ چلیں؟‘‘ صفیہ نے اشتیاق سے کہا۔

’’گاؤں؟‘‘ طاہر حیرت سے بولا۔ ’’وہاں جا کر کیا کرو گی۔ مٹی دھول پھانکنے کے سوا وہاں کیا ہے۔‘‘

’’چند دن کھلی آب و ہوا میں رہنے سے آپ کی طبیعت پر بڑا اچھا اثر پڑے گا اور میں بھی کبھی کسی گاؤں میں نہیں گئی‘ میری سیر ہو جائے گی۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ طاہر نے ہنکارا بھرا۔

’’اگر کوئی امر مانع ہے تو رہنے دیں۔‘‘ صفیہ نے اسے الجھن میں دیکھ کر کہا۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' طاہر نے اس کی جانب دیکھا۔ ''میں صرف یہ سوچ رہا تھا وہاں جا کر تم بور ہو جاؤ گی۔''

''سنا ہے آپ وہاں پندرہ پندرہ دن اور امی جان دو دو مہینے رہ کر آتی ہیں۔ آپ بور نہیں ہوتے کیا؟''

''میرا اور امی کا تو کام ہے۔ زمینوں کا حساب کتاب بڑے وقت طلب مسائل کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے بور ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا مگر تم۔۔۔''

''آپ ساتھ ہوں گے تو بوریت کیسی؟'' صفیہ نے اسے بڑی والہانہ نظروں سے دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ دو بجے نکل چلیں گے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ عصر تک پہنچ جائیں گے۔'' اس نے نظریں چرالیں۔

''ٹھیک ہے۔'' صفیہ بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔ ''میں پیکنگ کرلوں؟''

''کرلو۔'' طاہر بیساختہ ہنس دیا۔ ''مگر بہت زیادہ دنوں کا پروگرام نہ بنالینا۔ آج منگل ہے۔ بس جمعے تک لوٹ آئیں گے۔''

''جی نہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ وہاں جا کر سوچیں گے کہ کتنے دن رکنا ہے۔ ابھی آپ کے آفس جانے میں دس بارہ دن باقی ہیں اور امی کا تو ابھی واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں۔ اس لئے اطمینان سے لوٹیں گے۔'' وہ بیگ اٹھا کر چل دی۔ نجانے کیوں طاہر کا جی نہ چاہا کہ وہ اسے ٹوکے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور اسے اس کی خوشی میں رکاوٹ ڈالنا اچھا نہ لگا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ گاؤں کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ گاڑی کی ڈگی میں صفیہ نے دو بکس رکھوائے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ جلدی لوٹنے کا قطعاً نہیں ہے۔

☆

وجاہت آباد طاہر کے والد سر وجاہت سلطان کے نام پر آباد تھا۔

گاؤں کیا تھا' قدیم بودوباش کا ایک ماڈل تھا۔ آج بھی وہاں رہٹ چلتے تھے۔ کھیتوں میں نئے دور کی کوئی کھاد نہ ڈالی جاتی تھی۔ ٹیوب ویل بھی تھے مگر آب پاشی کے لئے پرانے کنوؤں کو قطعاً ختم نہ کیا گیا تھا۔ وجاہت سلطان کو اپنے کلچر سے بیحد پیار تھا' اس لئے انہوں نے وہاں جدید آلات کے آنے پر پابندی نہ لگائی تو پرانے نظام کو ختم کرنے کی اجازت بھی نہ دی۔ ان کے مزارعے ان کے ایسے فرمانبردار تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ورنہ یہ قوم کسی سے وفا کر جائے یہ ممکن ہی نہیں۔ نجانے وجاہت سلطان نے انہیں کیا سنگھایا تھا کہ وہ ان کے ہر حکم کو جی جان سے مان لیتے

تھے۔ ان کے بعد بیگم وجاہت سلطان نے بھی ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو ان کے شوہر کا خاصا تھا' اس لئے معاملات خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔

وجاہت سلطان کا زندگی بھر ایک ہی اصول رہا تھا:

''کسی کا حق مارو نہ اپنا حق چھوڑو۔ اور عزت سب کے لئے۔''

بیگم صاحبہ اور طاہر نے اس اصول میں کبھی لچک نہ آنے دی۔ ہر دکھ سکھ میں جب وہ گاؤں والوں کے ساجھی تھے تو انہیں کیا پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ وہ ایسے مالکوں کے خلاف سوچتے۔ طاہر کی شادی پر جیسے شہر سلطان والا میں بلا کر ان کی پذیرائی کی گئی تھی' اس بات نے انہیں اور بھی گرویدہ کر دیا تھا۔

گاؤں میں ''بیگم حویلی'' بیگم صاحبہ کے لئے طاہر کے والد نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ ابتدا سے اسی نام سے مشہور تھی۔ حویلی کا انتظام شروع سے مزارعوں کے نگران اور گاؤں کے معاملات کے منتظم بلال ملک کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی جوانی ڈھل رہی تھی مگر آج بھی اس کی کڑک اور پھڑک ویسی ہی تھی۔ کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ گاؤں میں بیگم صاحبہ اور طاہر کے بعد وہ سب سے بااختیار سمجھا جاتا تھا۔

حویلی کے باہر ہی بلال ملک چیدہ چیدہ افراد کے ساتھ طاہر اور اپنی چھوٹی مالکن کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ طاہر نے گاڑی روکی اور صفیہ اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ حویلی کیا تھی' چھوٹا موٹا محل تھا جو بڑے پُرشکوہ انداز میں سر اٹھائے انہیں فخر سے دیکھ رہا تھا۔ صفیہ اس کی خوبصورتی سے بیحد متاثر ہوئی۔

بلال ملک اور اس کے بعد دوسرے لوگوں نے ان دونوں کے گلے میں ہار ڈالے اور انہیں چھوٹے سے جلوس کی شکل میں حویلی کے اندر لایا گیا۔

ہال کمرے میں وہ دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ سب لوگ جیسے کسی بادشاہ کے دربار میں حاضر تھے۔ کچھ دور پڑی کرسیوں پر بیٹھ کر انہوں نے ادب سے سر جھکا لئے۔ بلال ملک ان دونوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''چھوٹی مالکن۔ اگر چاہیں تو اندر زنان خانے میں تشریف لے چلیں۔ گاؤں کی لڑکیاں بالیاں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' اس نے کہا۔

صفیہ نے طاہر کی جانب دیکھا۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ صفیہ نے گلے سے ہار اتار کر صوفے ہی پر ڈالے اور ایک ملازمہ کے عقب میں چلتی ہوئی ہال کمرے کے اندرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی جو زنان خانے کے کاریڈور میں کھلتا تھا۔

''اور سناؤ ملک۔ کیا حالات ہیں؟'' طاہر نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

’’اللہ کا کرم ہے چھوٹے مالک۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔‘‘ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

اسی وقت ایک ملازم دودھ کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھے آ گیا۔ طاہر نے دودھ پیا اور ملازم برتن واپس لے گیا۔

’’پچھلے دنوں جو باڑھ آئی تھی اس سے کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟‘‘ طاہر نے رومال سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں جی۔ ہمارا علاقہ تو محفوظ ہی رہا۔ ہاں اردگرد کافی نقصان ہوا۔ دریا ابل پڑا تھا جی۔ بڑی مشکل میں رہے ہمسایہ دیہات کے لوگ۔۔۔‘‘

’’تم نے ان کی کوئی مدد بھی کی یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے؟‘‘

’’مدد کیوں نہ کرتے جی۔ یہ تو ہم پر قرض ہوتا ہے جو ادا کئے بنا رات کو نیند نہیں آتی۔‘‘ بلال ملک نے ادب سے جواب دیا۔

’’اب میں تھوڑا آرام کروں گا ملک۔ اپنی مالکن کو بھی جلدی فارغ کر دینا۔ وہ پہلی بار گاؤں آئی ہے۔ پہلے ہی دن تھک کر لمبی نہ لیٹ جائے۔‘‘ وہ ہنستا ہوا اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’ان کی آپ فکر کریں نہ ان کے بارے میں سوچیں۔ اب وہ جانیں اور گاؤں والیاں۔ انہیں تو اگر وقت پر سونا بھی مل جائے تو غنیمت ہو گا۔‘‘ ملک بھی ہنسا۔

’’چلو ٹھیک ہے۔ اسے بھی گاؤں آنے کا بڑا شوق تھا۔ بھگتے اب۔‘‘ طاہر کہہ کر ہال سے باہر نکل گیا۔ ملک باقی لوگوں کے ساتھ دوبارہ نشستوں پر براجمان ہو گیا اور ہلکی آواز میں باتیں ہونے لگیں۔

صفیہ کو گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے پیار کر کر کے اور سوغاتیں پیش کر کر کے نڈھال کر دیا۔ پھر لڑکیوں اور جواں سال عورتوں نے اس کے کمرے میں ایسا ڈیرہ ڈالا کہ اسے آرام کرنا بھول ہی گیا۔ شام کے قریب وہ اسے گاؤں کے کھیتوں کی سیر کو لے گئیں۔ ہر کوئی اسے دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔ وہ ساری کلفتیں بھول کر ان کے ساتھ یوں گھل مل گئی جیسے یہ سارا ماحول اس کا صدیوں سے دیکھا بھالا ہو۔

☆

سیلاب دریا کی حدود میں داخل ہوا تو دریا بپھر گیا۔ اس انجان پانی کو اس کی اجازت کے بغیر اچانک اس کے گھر میں داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی؟ شاید یہی غصہ تھا جو دریا نے نکالا اور سینکڑوں دیہات اس کے غضب کا نشانہ بن گئے۔

وجاہت آباد دریا سے ذرا ہٹ کر واقع تھا اس لئے محفوظ رہا تاہم سب سے زیادہ نقصان جس گاؤں میں ہوا وہ عزیز کوٹ تھا۔ گاؤں کا گاؤں پانی میں ڈوب کر رہ گیا۔ درجنوں لوگ سیلاب کے ریلے میں بہہ گئے۔ کچے مکانوں کا وجود یوں مٹ گیا جیسے وہ کبھی موجود ہی نہ تھے۔ سیلاب رات کے پچھلے پہر اچانک ہی عزیز کوٹ والوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ نیند میں گم لوگ جب تک ہوش میں آتے، غرقابی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ بچے، عورتیں، بوڑھے درجنوں لوگ سیلاب کی نذر ہو گئے۔ لاشوں کی تلاش اور گھرے ہوئے زندہ افراد کو بچانے کا کام اب بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر جاری تھا۔

وجاہت آباد والوں نے دن رات عزیز کوٹ والوں کے لئے وقف کر دیے۔ لوگوں کو ان کے پانی میں گھرے مکانوں سے نکالنے سے لے کر ان کے لئے رہائش اور خورد و نوش کا وافر انتظام کرنے تک وجاہت پور والوں نے حکومتی مشینری کا ایسا بے مثال ساتھ دیا کہ ہر طرف واہ واہ ہو گئی۔

عزیز کوٹ اور وجاہت آباد کا درمیانی فاصلہ تقریباً چھ کلومیٹر تھا مگر وجاہت آباد والوں نے اپنے تعاون اور محبت سے اس فاصلے کو چھ فٹ میں بدل دیا۔ پانی اترنے تک انہوں نے بچے کھچے عزیز کوٹ والوں کو اپنے ہاں سنبھالے رکھا۔ پھر جب حکومت نے امدادی کیمپ تشکیل دے لئے تب ان لوگوں کو وہاں سے جانے دیا۔ عزیز کوٹ کے باشندے دھیرے دھیرے اپنے گاؤں کو لوٹ رہے تھے۔ مکانوں کو دوبارہ تعمیر کر رہے تھے۔ سیلاب جو کیچڑ اور گارا اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا، اس کی صفائی کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔ اب بھی وجاہت آباد کے درجنوں لوگ امدادی سرگرمیوں میں فوج اور سول انتظامیہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے متاثرہ علاقے میں موجود تھے۔

عزیز کوٹ کو ڈبو کر سیلابی پانی نے جب اپنا راستہ بدلا تو نور پور کے قریب سے یوں گزر گیا جیسے اس علاقے میں اسے سر اٹھا کر چلنے کی بھی اجازت نہ ہو۔ نور پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے نفوس کی تعداد بمشکل تین ہزار تھی۔

سیلاب، گاؤں کے باہر باہر سے اپنا راستہ بنا کر خوش خرامی کے ساتھ بہتا ہوا نکل گیا تاہم ابھی تک اس پانی کا زور کم نہ ہوا تھا۔

حافظ عبداللہ چھوٹے موٹے دریا کا منظر پیش کرتے ہوئے سیلابی کٹاؤ کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھا نجانے کس سوچ میں گم تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ دنیا بھر میں اکیلا اور اس وقت زندگی کے پچیسویں سال میں تھا۔ نور کوٹ گاؤں کی ایک بے آباد چھوٹی سی مسجد کو آج سے سات سال پہلے آ کر اس نے آباد کیا تو گاؤں والوں نے اس کی دو وقت کی روٹی اور ضروری اخراجات کو ہنس کر اپنے ذمے لے لیا۔ اس نے اس سے زیادہ کا مطالبہ بھی نہ کیا۔ گاؤں کے بچوں کو نماز فجر کے بعد قرآن پڑھانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ گاؤں کے چوہدری حسن دین کے گھر سے اسے خاص تعلق تھا۔ اس نے چوہدری حسن دین کے تین بیٹوں رفاقت، عنایت، لطافت اور ایک بیٹی نادرہ کو قرآن پاک پڑھایا تھا۔ اس نسبت سے یہ گھرانا اس کی بڑی عزت کرتا اور اسے اپنے گھر ہی کا ایک فرد خیال کرتا تھا۔ اس کا ماہانہ خرچہ بھی چوہدری حسن دین کی حویلی سے آتا جس کے لئے اسے خود کبھی حویلی نہ جانا پڑا تھا۔ ادھر مہینے کی پہلی تاریخ آئی، ادھر اس کا پہلوٹھی کا شاگرد رفاقت اس کا مشاہرہ اور دوسرا ضروری سامان لے کر مسجد میں اس کے حجرے کے دروازے پر آ دستک دیتا۔ گاؤں والے اس کے علاوہ اس کی جو خدمت کرنا چاہتے، وہ اکثر اس سے انکار کر دیتا۔ اکیلی جان تھی، اس کی ضروریات محدود سی تھیں۔ لالچ اور جمع کرنا اس کی فطرت ہی میں نہ تھا، اس لئے بھی گاؤں والے اس کے کردار سے بیحد متاثر تھے۔ تاہم وہ جو لے آتے، اسے واپس لے جانا انہیں اپنی توہین لگتا، اس لئے اصرار کرتے تو حافظ عبداللہ کو ان کا نذرانہ قبول کرنا پڑتا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ اجناس اور روپوں کی آمد اس کی ضرورت سے زیادہ ہے تو اس نے مسجد کے صحن میں بائیں ہاتھ بنے، اپنے حجرے کے دو کمروں کے اوپر چوہدری حسن دین سے کہہ کر ایک بڑا ہال کمرہ ڈلوا لیا۔ اس مہمان خانے کا راستہ مسجد کے باہر ہی سے رکھا گیا تاکہ اسے اور نمازیوں کو دقت نہ ہو۔ یہ کمرہ اجنبی مسافروں اور بے آسرا مہمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا گیا۔ یوں اس کی زائد آمدنی کے خرچ کا ایک راستہ نکل آیا۔ اب وہ بھی خوش تھا اور گاؤں والے بھی۔

اس کا ایک عرصے سے معمول تھا کہ روزانہ عصر کے بعد نور پور سے چار فرلانگ دور مشرق میں واقع ایک خانقاہ سے تقریباً ڈیڑھ سو گز دور ایک اونچے ٹیلے پر اُگے پیپل کے درخت کے نیچے آ بیٹھتا اور قرآن حکیم کی دہرائی شروع کر دیتا۔ جب سورج، شفق کی لالی سے دامن چھڑانے لگتا، تب وہ قرآن پاک کو چوم کر سینے سے لگاتا۔ اٹھتا۔ درخت کو تھپکی دیتا، جیسے اس سے رخصت ہو رہا ہو اور مسجد کو چل دیتا جہاں اسے پانچ وقت اذان بھی خود ہی دینا ہوتی تھی۔

یہ خانقاہ کسی بابا شاہ مقیم نامی بزرگ کے مزار اور دو شکستہ سے کمروں پر مشتمل تھی۔ مزار کے وسیع صحن میں ایک

طرف چھوٹا سا سٹور نما کمرہ تھا جس میں لوگوں کے نذرانوں کی اشیا، اجناس، دری چادریں اور دوسرا سامان بھرا رہتا تھا۔ یہاں ابھی تک بجلی کا کنکشن نہ پہنچا تھا۔ نور پور والوں نے واپڈا کو درخواست دے رکھی تھی اور امید تھی کہ جلد ہی وہاں بجلی لگ جائے گی۔ مزار سے تھوڑی دور دریا بہتا تھا جس کے پار مظفر آباد کی آبادی کا اختتام ہوتا تھا۔

مزار کی دیکھ بھال ایک ایسا شخص کرتا تھا، جس کے بارے میں کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ ملگجے کپڑوں میں ملبوس وہ حال مست درویش خانقاہ کی صفائی کرتا۔ ادھر اُدھر سے خودرو پھول اکٹھے کر کے بابا شاہ مقیم کے مزار پر لا ڈالتا۔ وہاں موجود چھوٹی سی کھوئی سے پانی نکالتا۔ خانقاہ اور اس سے ملحقہ کمروں کو دھوتا اور اگربتیاں سلگا کر پھر اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اسے گاؤں والوں نے نہ کبھی کسی سے عام طور پر بات چیت کرتے سنا، نہ وہ کسی سے کوئی چیز لیتا۔ اگر کسی نے زیادہ نیازمندی دکھانے کی کوشش کی تو وہ اسے یوں گھورتا کہ نیازمند کو بھاگتے ہی بنتی۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوتا تھا؟ یہ بات کسی کے علم میں تھی نہ کسی نے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔ اس کا سبب درویش کا رویہ تھا، جس کے باعث مزار پر فاتحہ کے لئے آنے والے افراد بھی اس سے کتراتے تھے۔ اس کا حال پوچھ کر وہ ایسے ایسے جواب بھگت چکے تھے جن کے بعد اب کسی کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ وہ اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کی سوچے۔ ہاں، حافظ عبداللہ کا معاملہ الگ تھا۔ وہ جب بھی مزار پر فاتحہ کے لئے جاتا، درویش اپنے کمرے سے نکل آتا۔ اس کے جانے تک مزار کے باہر کھڑا رہتا۔ جاتے ہوئے اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتا۔ چمکدار نظروں سے اسے دیکھتا۔ ہولے سے مسکراتا اور واپس اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ حافظ عبداللہ نے بھی اس سے زیادہ اسے کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ ہاں، اگر کبھی وہ اسے نہ ملتا، تو وہ اس کے کمرے میں ضرور جھانک لیتا مگر اسے وہاں موجود نہ پاتا۔ اس سے حافظ عبداللہ نے سمجھ لیا کہ درویش سے اس کی ملاقات تبھی نہیں ہوتی، جب وہ وہاں نہیں ہوتا۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کب لوٹتا ہے؟ حافظ عبداللہ نے کبھی ان سوالوں کا جواب جاننے کی سعی نہ کی۔

آج اس کا دل کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ منزل کرنے کو جی مائل نہ تھا۔ اس کے دادا قاری بشیر احمد مرحوم کا کہنا تھا کہ زبردستی قرآن پاک پڑھنا چاہئے نہ اس پر غور کرنا چاہئے، بلکہ جب قرآن خود اجازت دے تب اسے کھولا جائے۔ اور اس کی طرف سے اجازت کی نشانی یہ تھی کہ بندے کا دل خود قرآن پڑھنے کو چاہے۔ سو آج بڑی مدت کے بعد جب حافظ عبداللہ کا دل دہرائی کو نہ چاہا تو وہ سمجھ گیا کہ آج قرآن پاک کی طرف سے اسے منزل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے وہ قرآن حکیم کا نسخہ اپنے ساتھ ہی نہ لایا۔ مقررہ وقت پر ٹبے پر پہنچا اور سیلاب کی دھیرے دھیرے بہتی لہروں پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سوچوں کے گرداب میں ایسا گم ہوا کہ خود سے بے خبر ہو گیا۔ وقت

گزرنے کا احساس ناپید ہو گیا۔ پھر جب سورج کی ٹکیا اپنے آخری مقام کو چھونے لگی تو اسے ہوش آیا۔

ایک طویل سانس لے کر اس نے حدِ نظر تک پھیلی سیلابی چادر پر ایک نگاہ ڈالی اور اٹھ گیا۔ پھر ایک دم چونک پڑا۔

اس کی نظریں پانی میں بہتے آ رہے درخت کے ایک تنے پر جم گئیں جس کے ساتھ کوئی انسانی جسم چمٹا ہوا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ کوئی عورت تھی' کیونکہ دور سے بھی اس کے پھولدار کپڑوں کی جھلک نمایاں تھی۔

حافظ عبداللہ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ خانقاہ کی جانب نظر دوڑائی مگر درویش کو آواز دینے کا اسے حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ گاؤں سے کسی کو مدد کے لئے بلائے مگر اتنا وقت نہ تھا۔ جب تک وہ کسی کو مدد کے لئے بلاتا' اندھیرا مزید بڑھ جاتا۔ پھر وہ دریا میں بہتی اس عورت کو بچا پاتا' اس کا اسے یقین نہ تھا۔ اس نے زیادہ تردد میں پڑنے کے بجائے کندھوں سے گرم چادر اور سر سے ٹوپی اتار کر درخت کے نیچے رکھتے ہوئے پاؤں سے چپل بھی نکال دی۔ پھر آستینیں اُڑستے ہوئے ٹھنڈے یخ پانی میں چھلانگ لگا دی۔

اس کا خیال درست تھا۔ درخت کے تنے کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ اس سے چمٹی ہوئی وہ ایک جواں سال لڑکی ہی تھی جو بیچاری نجانے کہاں سے سیلاب کے ریلے میں بہتی چلی آ رہی تھی۔ اس نے بڑی مضبوطی سے درخت کی چھوٹی چھوٹی شاخوں کو اپنے ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور بیہوش تھی۔ سردی اور سرد پانی کے باعث اس کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔

حافظ عبداللہ نے اس کے جسم سے چپکے ہوئے کپڑوں سے بری طرح جھانکتے اس کے پُرشباب جسم سے نظریں چراتے ہوئے درخت کے تنے کو پیروں کی جانب سے کنارے کی طرف دھکیلنا شروع کیا اور بڑی مشقت سے تقریباً پندرہ منٹ بعد ٹیلے کے قریب لانے میں کامیاب ہو گیا۔

کنارے کی کچی زمین پر ایک چوتھائی درخت کو کھینچ لینے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر کے جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے کپڑوں سے جھانکتے لڑکی کے نیم برہنہ اکڑے ہوئے جسم کو اس پر سے اتارا۔ اس کی مدھم سی چلتی ہوئی سانس کو محسوس کیا۔ ٹیلے سے اپنی چادر اٹھائی۔ اس میں لڑکی کو لپیٹا۔ ٹوپی سر پر رکھی۔ پاؤں میں چپل ڈالی۔ درخت کو حسبِ معمول تھپکی دی اور ٹیلے سے اتر آیا۔ پھر لاحول پڑھ کر شیطانی خیالات کو دور بھگاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے لڑکی کا چادر میں لپٹا جسم کندھے پر ڈالا۔ اس کے اپنے گیلے کپڑے جسم سے چپکے ہونے کی وجہ سے سردی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔

اسی وقت خانقاہ سے ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی۔ وہ ایک پل کو حیران ہوا۔ درویش خانقاہ کے باہر ایک اونچی

جگہ کھڑا اذان دے رہا تھا۔ وہ لڑکی کا جسم کندھے پر لئے حتی الامکان تیز قدموں سے خانقاہ کی جانب چل دیا۔

☆

جب تک وہ خانقاہ کے قریب پہنچا' درویش اذان دے کر اندر جا چکا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو خانقاہ سے باہر کھڑے رہ کر کچھ سوچا' پھر اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہو گیا۔

پہلے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ ایک پل کو اس کے باہر رکا۔ اندر سے کسی کے ہلکی آواز میں قرات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید درویش نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے دوسرے کمرے کا رخ کیا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی سے آتی ہوئی ملگجی سی روشنی کمرے کا اندھیرا دور کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کے ماحول کو محسوس کیا۔ چند لمحے بُت بنا کھڑا رہا۔ پھر جب اس کی آنکھیں نیم اندھیرے میں دیکھنے لگیں تو وہ قدم قدم آگے بڑھا۔ کمرے کی بائیں دیوار کے ساتھ بچھی بان کی چارپائی پر لڑکی کو ڈالا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانس اعتدال پر آتے آتے دو تین منٹ گزر گئے۔ لڑکی پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ آہستہ سے پلٹا۔ اس کا ارادہ تھا کہ درویش سے جا کر ملے اور اسے ساری بات بتا کر اس صورتحال میں اس سے مدد مانگے۔

ابھی وہ دو ہی قدم چلا تھا کہ رک گیا۔ کمرے میں اچانک ہی روشنی کی ایک لہر در آئی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ درویش کمرے کے دروازے میں جلتا ہوا چراغ ہاتھ پر رکھے کھڑا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''بابا۔ آپ۔۔۔'' حافظ عبداللہ نے اسے دیکھ کر کہنا چاہا۔

''شش۔۔۔'' درویش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے روک دیا اور آگے بڑھ آیا۔ ''خاموش۔'' وہ دبی آواز سے بولا۔ ''کمرہ امتحان میں بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔''

''کمرہ امتحان؟'' حافظ عبداللہ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔'' درویش نے چراغ اسے تھما دیا۔ ''یہ لے۔ اسے طاق میں رکھ دے۔''

''بابا۔'' حافظ عبداللہ نے چراغ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ اب بھی حیرت زدہ تھا۔ ''کیسا امتحان؟''

''یہ۔۔۔'' درویش نے چارپائی بے سدھ پر پڑی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ امتحان ہی تو ہے جس میں تو نے خود کو ڈال لیا ہے۔''

''یہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔ سیلاب کے پانی میں بہتی چلی آ رہی تھی۔۔۔ میں تو اسے بچا کر یہاں اٹھا لایا ہوں۔'' حافظ عبداللہ نے اسے بتایا۔

”اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔“ درویش نے ایک کونے میں پڑا کمبل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا کہ لڑکی کو اوڑھا دے۔ ”نیکی کی ہے ناں۔ اب بھگت۔ نیکی کرنا اتنا آسان ہوتا تو ساری دنیا کرتی پھرتی۔ نیکی کرنا اس کی مشیت کے تابع ہونا ہے حافظ۔ تابعدار ہونا چاہا ہے ناں تو نے؟ ایک بار سوچ لے۔ اچھی طرح۔ ابھی وقت ہے کہ تو آزمائش میں پڑے بغیر نکر کی گلی سے نکل جائے۔ کچھ دیر اور گزر گئی تو یہ راستہ بند ہو جائے گا۔ پھر تو چاہے نہ چاہے تجھے امتحان دینا پڑے گا۔ نتیجہ کیا نکلے گا؟ نہ تو جانتا ہے نہ میں۔ بس وہ جانتا ہے۔“ درویش نے چھت کی جانب انگلی اٹھا دی۔ ”وہ۔۔۔ جو سب جانتا ہے اور کچھ نہیں بتاتا۔ جسے بتاتا ہے اسے گونگا بہرہ کر دیتا ہے۔ اندھا بنا دیتا ہے۔ ابھی وقت ہے۔ سوچ لے۔ سوچ لے۔“ درویش نے اپنی بے پناہ چمک دیتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”بابا۔“ حافظ نے چراغ طاق میں پڑے قرآن پاک کے چند بوسیدہ نسخوں کے پاس رکھا اور کمبل میں لڑکی کا بدن خوب اچھی طرح لپیٹ کر درویش کی جانب پلٹا۔ ”میں کچھ نہیں سمجھا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”کھل کر سمجھاؤں تجھے؟“ اچانک درویش کا لہجہ جھڑکی دینے کا سا ہو گیا۔ ”تو سن۔ جا۔ اس کو وہیں سیلاب کے پانی میں پھینک آ۔ نیکی ہے ناں۔ اسے اسی دریا میں ڈال آ‘ جہاں سے نکال کر لایا ہے۔ نیک نہ بن۔ خطا کار بنا رہ۔ جان بچی رہے گی۔ نیک بنے گا تو امتحان میں ڈال دے گا تجھے۔۔۔“ اس نے سسکی لی۔ ”بڑا ڈاہڈا ہے وہ۔ رعایتی نمبر آسانی سے نہیں دیتا۔۔۔“ پھر جیسے وہ جھلا گیا۔ ”مگر میں تجھے یہ سب کیوں سمجھا رہا ہوں؟ کیوں تیرا اور اپنا وقت خراب کر رہا ہوں؟ جو تیرے جی میں آئے کر میاں۔“ اس نے حافظ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”کل کو تو اس کے سامنے میرے خلاف گواہی دے دے گا کہ میں نے تجھے نیکی کرنے سے روکا تھا۔ نہ بابا نہ۔ تو اپنی مرضی کر۔ تو جانے اور وہ۔ مجھے معاف رکھ۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا جانے کے لئے پلٹا۔

”بابا۔“ حافظ عبداللہ لپک کر اس کے راستے میں آ گیا۔ ”مجھے کس الجھن میں ڈال کر جا رہے ہیں آپ؟ میں۔۔۔ میں۔۔۔ اس کا کیا کروں؟“ اس نے بازو دراز کر کے لڑکی کی جانب اشارہ کیا جو ہولے سے کسمسائی تھی۔

درویش ایک بار ساری جان سے لرز گیا۔ پھر اس نے بڑی اجنبی نظروں سے حافظ عبداللہ کی جانب دیکھا۔ حافظ ان نظروں سے گھبرا کر رہ گیا۔ عجیب سی سرد مہری تھی ان میں۔

”میں نے کہا تھا کہ وقت گزر گیا تو امتحان شروع ہو جائے گا تیرا۔“ درویش نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”گھنٹی بج چکی۔ پرچہ حل کرنے کا وقت شروع ہو گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو نے باتوں میں وہ سارا وقت گزار دیا جو تجھے بھاگ جانے کے لئے دیا گیا تھا۔ نکر کی گلی بند ہو گئی۔ اب تو جس دروازے سے کمرہ امتحان میں داخل ہوا تھا اسی سے باہر جائے گا مگر اس وقت جب پرچہ حل کر لے گا۔ خالی کاغذ دے کر جانا چاہے گا تو میں نہیں جانے دوں گا۔“ درویش

نے کسمسا کر کراہتی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ’’یہ پرچہ تجھے ہی حل کرنا ہے۔ میں دعا کروں گا کہ تجھے اس میں زیادہ سے زیادہ رعایت دی جائے۔ اب وہ مانے یا نہ مانے' یہ اس کی مرضی۔‘‘ وہ چل دیا۔

’’بابا۔‘‘ حافظ اس کے پیچھے لپکا۔ ’’مجھے مسجد جانا ہے۔ وہاں کسی کو پتہ نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کس کام میں الجھ گیا ہوں۔۔۔ اس کے وارثوں کا بھی کوئی پتہ نہیں۔ یہ کون ہے؟ کہاں سے بہتی آئی ہے؟ اسے یوں کیسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں ہم؟‘‘

’’ہم نہیں۔‘‘ درویش نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ ’’تم۔۔۔ صرف تم۔ میرا اس سے کیا تعلق؟‘‘ وہ بدلحاظی سے بولا۔

’’مگر بابا۔ رات بھر میں اس کے ساتھ کیسے۔۔۔ یہاں۔۔۔ اکیلا۔‘‘ حافظ ہکلا کر رہ گیا۔

’’یہی تو میں تجھے سمجھا رہا تھا اس وقت۔‘‘ درویش ملامت کے سے انداز میں بولا۔ ’’اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ اسے جہاں سے لایا ہے وہیں ڈال آ۔ خواہ مخواہ مصیبت میں نہ پڑ۔۔۔ مگر۔۔۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے بابا۔ میں اسے واپس سیلاب کے پانی میں پھینک آتا؟‘‘ حافظ عبداللہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

’’ہاں۔‘‘ درویش سر جھٹک کر بولا۔ ’’یہی مطلب تھا میرا۔ مگر تو نے کج بحثی میں سارا وقت گنوا دیا۔ اب بھگت۔‘‘

’’بابا۔ تم جانتے ہو اس سے کیا ہوتا؟‘‘ حافظ عبداللہ اب بھی حیران تھا۔

’’کیا ہوتا؟‘‘ درویش نے لاپرواہی سے پوچھا۔

’’یہ مر جاتی۔‘‘

’’بچانے والے کی کیا مرضی ہے' یہ تو کیسے جانتا ہے؟ اگر اسے بچانا ہوتا تو وہ اسے تیرے واپس پانی میں پھینکنے پر بھی بچا لیتا۔‘‘

’’بالکل ٹھیک۔‘‘ حافظ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ ’’مگر بابا۔ پھر میں اسے کیا منہ دکھاتا۔ اپنے اس ظلم کا کیا جواز پیش کرتا اس کے سامنے' جو میں اس مظلوم کی جان پر کرتا۔‘‘

’’تو نہ پیش کر جواز۔ اب بھگت۔ اس اندھیری رات میں' اس کے ساتھ اکیلا رہ اور اس کی دیکھ بھال کر۔ اس کی خدمت کر۔ اسے زندہ رکھنے کی کوشش کر۔ آزمائش کے کمرے میں بیٹھ کر پرچہ حل کر۔ اگر صبح تک تو اپنے آپ سے بچ گیا تو میں تجھ سے آن ملوں گا ورنہ۔۔۔‘‘ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں بابا؟'' حافظ نے گھبرا کر پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ مگر یہاں بہرحال نہیں رہوں گا۔'' درویش اس کی جانب دیکھ کر عجیب سے انداز میں بولا۔ ''یہاں رہا تو تجھے میرا آسرا رہے گا۔ حوصلہ رہے گا کہ تو اکیلا نہیں ہے۔ میں تیرے آس پاس ہوں۔ تجھے میرے یہاں ہونے کی شرم مارے گی۔ تو جو کرنا چاہے گا اس میں میرے یہاں ہونے کا خیال رکاوٹ بن جائے گا۔ پھر تو موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ اور میں تیرے کسی بھی فعل میں اگر مدد نہیں کرنا چاہتا تو تیرے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں حائل ہونے کا بھی مجھے کیا حق ہے؟''

''بابا۔'' حافظ نے کہا اور چراغ کی مدھم سی روشنی میں گردن گھما کر لڑکی کی جانب دیکھا جو ایک بار پھر بالکل بے سدھ ہو گئی تھی۔ شاید کمبل کی گرمی نے اسے سکون پہنچایا تھا۔ پھر وہ درویش کی جانب متوجہ ہوا۔ ''اب جو ہو سو ہو۔ اب مجھے مجبوراً یہاں رکنا پڑے گا۔''

''تو رک۔ میں کب نکال رہا ہوں تجھے۔ ہاں ایک پل ٹھہر۔'' درویش کمرے سے نکل گیا۔ ذرا دیر بعد وہ لوٹا تو اس کے ایک ہاتھ میں چنگیر اور دوسرے ہاتھ میں ایک کھیس اور تکیہ دبا ہوا تھا۔ ''یہ لے۔ اس میں تیرے اور اس کے لئے کھانا ہے اور یہ تیرا رات گزارنے کا سامان ہے۔ اکڑ کر مر گیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا؟''

حافظ عبداللہ نے اس کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے لیں۔

''جا رہا ہوں۔ اب تیرے اور اس کے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہے۔''

''ہے بابا۔'' حافظ عبداللہ مسکرایا اور کھیس اور تکیہ دیوار کے ساتھ فرش پر ڈال دیا۔

''جس کی تو بات کر رہا ہے میں اس کی بات نہیں کر رہا۔ وہ تو ہر کہیں ہے۔ بس ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔'' درویش پلٹ گیا۔ ''صبح ملاقات ہو گی۔''

''انشاءاللہ۔'' حافظ کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ درویش نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

''انشاءاللہ۔'' ہولے سے اس نے کہا اور دروازے سے نکل گیا۔

خالی دروازے کو چند لمحوں تک دیکھتے رہنے کے بعد حافظ عبداللہ آہستہ سے لڑکی کی جانب پلٹا۔ چراغ کی زرد اور تھرتھراتی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر بالکل چت پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی سرخی لوٹ رہی تھی۔ گیلے بالوں کی لٹیں چہرے پر بکھری ہوئی تھیں اور کمبل میں مستور سینے کا زیر و بم طوفان اٹھا رہا تھا۔

حافظ عبداللہ نے گھبرا کر اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ شیطانی خیالات سے نجات پانے کے لئے تین

بار لاحول پڑھ کر سینے پر پھونک ماری اور آگے بڑھ کر چنگیر اس الماری نما کھڈے میں رکھ دی جو طاق کے ساتھ بنا ہوا تھا۔

کھیس اور تکیہ اٹھاتے ہوئے اچانک ہی اسے سردی کا احساس ہوا۔ اس نے کچھ سوچا۔ پھر دونوں چیزیں اینٹوں کے فرش پر ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ دونوں کمرے خالی تھے۔ درویش واقعی کہیں جا چکا تھا۔ مزار سے باہر ایک طرف لگے ہینڈ پمپ کی طرف جاتے ہوئے اس نے آسمان پر نگاہ دوڑائی۔ تارے نکل رہے تھے۔ دل ہی دل میں اس نے چاند کی تاریخ کا حساب لگایا۔ گزشتہ دن میں ربیع الاول کی گیارہ تاریخ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بارہ ربیع الاول کی شب شروع ہو چکی تھی۔ آسمان صاف تھا اور چاند ابھرنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

انہی خیالات میں ڈوبا وہ ہینڈ پمپ پر پہنچا۔ گیلا کرتا اور بنیان اتار کر اچھی طرح نچوڑ کر دوبارہ پہننے کے بعد اس نے ایک نظر مزار کے اندرونی دروازے پر ڈالی۔ پھر وہاں سے ہٹ گیا۔ مزار کے پیچھے جا کر اس نے جلدی سے شلوار اتاری۔ خوب اچھی طرح نچوڑ کر پانی نکالا اور جھاڑ کر پہن لی۔ ہولے ہولے چلتا ہوا ہینڈ پمپ پر آیا۔ ہتھی کو چھوا تو جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ تاہم اس نے حوصلے سے کام لیا اور ہتھی پر زور ڈال دیا۔ تھوڑی دیر تک پانی نکلنے دیا۔ پھر دوسرا ہاتھ نکلتے ہوئے پانی کے نیچے کیا تو پانی کم ٹھنڈا محسوس ہوا۔ تھوڑا پانی اور نکالنے کے بعد اس نے ’’بسم اللہ الرحمن الرحیم‘‘ کہہ کر وضو شروع کر دیا۔ فارغ ہوا تو اس کے دانت بج رہے تھے۔ گیلی ٹوپی کو سر پر جماتے ہوئے وہ کانپتا ہوا اندر کو چلا۔ کمرے میں داخل ہوا تو لڑکی بدستور اسی حالت میں چت پڑی سو رہی تھی جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور جوتی دروازے میں اتار کر کونے میں کھڑی کھجور کی چٹائی کی طرف بڑھا۔ اسے کھولا۔ جھاڑا اور چارپائی کے مقابل دیوار کے ساتھ فرش پر بچھا دیا۔ پھر کھیس اٹھایا اور کس کر اس کی بکل مار لی۔ اسی وقت کھلے دروازے سے ہوا کا ہلکا سا جھونکا اندر داخل ہوا۔ ٹھنڈک کو کمرے کے ماحول کے سپرد کیا اور ناپید ہو گیا۔ پلٹ کر حافظ عبداللہ نے دروازہ بھیڑ دیا۔ فوراً ہی اسے کمرے کی یخ بستگی میں کمی کا احساس ہوا۔ یہ شاید اس کے محسوس کرنے کا اعجاز تھا ورنہ اتنی جلدی سردی کا کم ہو جانا ممکن نہ تھا۔

وہ پاؤں جھاڑ کر صف پر کھڑا ہوا۔ ایک بار نظر گھما کر سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر قبلہ رخ ہو کر اس نے نماز کی نیت کی اور ہاتھ بلند کر دیے۔

’’اللہ اکبر۔‘‘ حافظ عبداللہ کے ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی اور سارا ماحول عجیب سے سکون میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے ہاتھ ناف پر باندھے اور آنکھیں سجدے کی جگہ پر جما کر اتنی آہستہ آواز میں قرات شروع کر دی جسے وہ خود سن سکتا تھا یا پھر اس کا معبود جو پہاڑ کی چوٹی پر چیونٹی کے رینگنے کی آواز سننے پر بھی قادر تھا۔ چراغ کی لو نے تھرتھرانا

بند کر دیا۔ شاید وہ بھی حافظ عبداللہ کی قرأت سننے میں محو ہو گئی تھی۔

☆

رات کا کھانا عشاء کے فوراً بعد کھا لیا گیا۔ پھر دوبارہ سے صفیہ کو تو عورتوں نے گھیر لیا اور طاہر ملک کے ساتھ چوپال میں چلا گیا۔

چوپال گاؤں کے مغربی کنارے پر قبرستان کے ساتھ ایک ایسی بے در و دیوار کی چھت کے نیچے نشست کی جگہ تھی جو آٹھ مدور ستونوں پر قائم تھی اور اس کے نیچے تقریباً پانچ سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس کے مشرقی گوشے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے باہر چولہا بنا ہوا تھا۔ اس پر وہاں خدمت گار بابا شمسو روزانہ شام ہوتے ہی چائے کا بڑا سا پتیلا چڑھا دیتا جو گاؤں والوں اور اجنبی مہمانوں کی سیوا کے لئے لذتِ کام و دہن کا سبب بنتا۔ بید کے موڑھے اور بڑی بڑی چارپائیاں چوپال میں پڑی رہتیں جن پر رات کو گاؤں والوں کی بلا ناغہ محفل جمتی۔

سفید شلوار قمیض اور سیاہ گرم واسکٹ میں ملبوس' پاؤں میں زرتار کھسہ پہنے طاہر' بلال ملک کی معیت میں وہاں پہنچا تو گاؤں کے پچیس تیس بڑے بوڑھے اور جوان آدمی بیٹھے حقے گڑگڑاتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

طاہر کی آمد پر سب لوگ ایک بار کھڑے ہوئے' پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ وہ ان کے نیم دائرے میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا اور فرداً فرداً سب کا حال چال پوچھنے لگا۔ ہوتے ہوتے باتوں کا موضوع گاؤں کے سکول ماسٹر شیخ محسن کی بیٹی پر آ کر رک سا گیا۔

‘‘ماسٹر کی بیٹی زبیدہ نے اپنے لئے آیا ہوا اپنی برادری کے ایک چالیس سالہ شخص نثار شیخ کا رشتہ صاف ٹھکرا دیا جی۔’’ ملک کہہ رہا تھا۔

‘‘زبیدہ کی اپنی عمر کتنی ہے؟’’ طاہر نے دلچسپی سے پوچھا۔

‘‘بیس اکیس سال ہو گی جی۔’’

‘‘پھر تو اس نے ٹھیک کیا۔’’ طاہر نے تائید کی۔ ‘‘دگنی عمر کے بندے سے وہ کیوں شادی کرے؟’’

‘‘وہ تو ٹھیک ہے جی مگر۔۔۔’’ ملک نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔ کسی نے بھی اس کی نظر کا ساتھ نہ دیا اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ سب اس بات سے ناواقف ہوں۔

‘‘مگر کیا ملک۔ بات پوری کیا کرو۔ ادھار کی رقم کی آدھی واپسی کی طرح درمیان میں وقفہ نہ ڈالا کرو۔’’

‘‘ایسی بات نہیں ہے چھوٹے مالک۔’’ ملک کھسیانا سا ہو گیا۔ ‘‘میں یہ کہہ رہا تھا کہ بات اس آدمی کی زیادہ عمر ہی کی نہیں تھی۔ بات کچھ اور بھی تھی۔’’

’’وہ کیا؟‘‘

’’زبیدہ کسی اور کو پسند کرتی تھی جی۔‘‘ ملک نے کہا اور اس کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

’’تو۔۔۔؟‘‘ طاہر نے اس کے چہرے پر جمادیں۔

’’ماسٹر محسن نے اس بات کا علم ہونے پر زبیدہ کی وہ دھنائی کی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ طاہر بری طرح چونکا۔

’’ظاہر ہے جی۔ جوان بیٹی جب منہ سے بر مانگ لے تو غیرت مند باپ تو اسے جان سے ہی مار دے گا۔‘‘ ملک نے گردن اکڑا کر کہا۔ ’’وہ تو شکر ہے کہ زبیدہ کی ماں نے اسے بچالیا ورنہ ماسٹر محسن تو شاید اس کی گردن اتار دیتا۔‘‘

’’اس کے بعد کیا ہوا؟‘‘ طاہر نے اضطراب سے پوچھا۔

’’ہونا کیا تھا چھوٹے مالک۔‘‘ ملک بلال نے لاپروائی سے کہا۔ ’’یہ پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔ زبیدہ کا رشتہ ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ ماسٹر نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اب وہ چارپائی پر پڑی ہے۔‘‘

’’اور جس سے وہ خود شادی کرنا چاہتی تھی۔۔۔‘‘

’’وہ۔۔۔ وہ بے غیرت کا بچہ گھر میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔‘‘

’’کون ہے وہ؟‘‘ طاہر کا اضطراب اب بھی باقی تھا۔

’’لالو تیلی کا بیٹا عادل۔‘‘

’’عادل۔‘‘ طاہر پھر چونکا۔ ’’وہی عادل، جس نے پچھلے سال وظیفے کے امتحان میں ٹاپ کیا تھا اور جو آج کل محکمہ زراعت میں نوکری کر رہا ہے۔‘‘

’’وہی جی۔ وہی بے غیرت عادل۔‘‘ ملک نے نفرت سے کہا۔

’’اس نے اس معاملے میں کچھ نہیں کیا؟‘‘ طاہر نے سر جھکائے، پاؤں سے زمین کریدتے اور غیر محسوس آواز میں حقے گڑگڑاتے ان مٹی کے مادھوؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جن کی غیرت اور بے غیرتی کا اپنا ہی معیار تھا۔

’’کیا تھا جی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو ماسٹر کے ہاں زبیدہ کے رشتے کے لئے بھیجا تھا۔ جواب میں ماسٹر نے انہیں بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا اور ایک بار پھر بیٹی کی خوب دھلائی کی۔‘‘

’’لاحول ولاقوۃ۔‘‘ بے اختیار طاہر کے لبوں سے نکلا۔ پھر اس نے بڑی کڑی نظروں سے ملک کو دیکھا۔ ’’میرا خیال تھا کہ تعلیم اور بدلتے ماحول نے وجاہت آباد کے لوگوں کو فراخ دل اور وسیع النظر بنا دیا ہے مگر لگتا ہے اس کے

لئے ابھی وقت لگے گا۔‘‘

’’کیا مطلب چھوٹے مالک۔‘‘ بلال ملک نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ باقی سب لوگوں نے بھی چونک کر سر اٹھائے اور طاہر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

’’اس کا جواب میں تھوڑی دیر بعد دوں گا۔ تم فوری طور پر ماسٹر محسن، لالو اور عادل کو یہاں بلاؤ۔‘‘

’’آپ کیا کرنا چاہتے ہیں چھوٹے مالک؟‘‘ ملک باقاعدہ گھبرا گیا۔

’’جو کروں گا تم سب دیکھ ہی لو گے۔ فی الحال جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ان تینوں کو بلاؤ یہاں۔ ابھی۔‘‘ طاہر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

’’جی چھوٹے مالک۔‘‘ ملک نے بیچارگی سے یوں کہا جیسے خود کو ماں بہن کی گالی دے رہا ہو کہ اس نے طاہر کے سامنے یہ بات کی ہی کیوں؟ پھر اس نے بائیں ہاتھ چارپائی پر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر آدمی کو ہاتھ کے اشارے سے اٹھ جانے کو کہا۔

’’اوئے شکورے۔ جا۔ لالو ماسٹر محسن اور عادل کو بلا کر لا۔ کہنا چھوٹے مالک نے بلایا ہے۔‘‘

’’جی ملک صاحب۔‘‘ شکورا اٹھا اور چل پڑا۔

’’اور سن۔‘‘ ملک نے اسے روکا۔ ’’تینوں کو اکٹھا نہ کر لینا۔ کہیں یہاں پہنچنے سے پہلے خون خرابہ کر بیٹھیں۔ لالو کا گھر پہلے ہے۔ اسے جاتے ہوئے پیغام دے جا۔ پھر ماسٹر کے گھر جانا۔ اور دونوں میں سے کسی کو نہ بتانا کہ دونوں کو یہاں اکٹھے بلایا گیا ہے۔‘‘

’’جی ملک صاحب۔‘‘ شکورا سر ہلا کر چل دیا۔

’’تم اچھے بھلے عقلمند آدمی ہو ملک۔‘‘ طاہر نے اس کی بات سے متاثر ہو کر کہا۔ ’’مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ روایتی معاملوں میں تمہاری عقل کس جنگل میں گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔‘‘

’’یہ غیرت کے معاملے میں کسی کے قابو نہیں آتے چھوٹے مالک۔‘‘ ملک خجل ہو گیا۔ ’’میں نے ان دونوں خاندانوں کو بہت سمجھایا مگر سب بے سود۔‘‘

’’آئندہ یاد رکھنا۔ ایسا کوئی بھی معاملہ ہو اگر تمہارے قابو میں نہ آئے تو مجھے فوراً خبر کرنا۔ میں گاؤں میں کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتا۔‘‘

’’جی چھوٹے مالک۔‘‘ ملک نے سر جھکا لیا۔

اسی وقت موبائل گنگنا اٹھا۔ طاہر نے سائڈ کی جیب سے سیٹ نکالا۔ سکرین پر صفیہ کا نام دیکھ کر اس نے لیس کا

بٹن دبا دیا۔

’’ہیلو۔‘‘ اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘

’’آپ کب تک لوٹیں گے؟‘‘ صفیہ نے پوچھا۔

’’خیریت؟‘‘

’’جی ہاں۔ بالکل خیریت ہے۔ ایک ضروری معاملہ آپ کے گوش گزار کرنا تھا۔‘‘

’’کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟‘‘ طاہر نے چونک کر پوچھا۔

’’ایسی ایمرجنسی بھی نہیں مگر میں چاہتی تھی کہ یہ بات آپ کے علم میں جتنی جلدی آ جائے اس کا کوئی حل نکل آئے گا۔‘‘

’’میں بھی یہاں ایک خاص معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔ اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ نو بجے تک لوٹوں گا۔ کیا اتنی دیر۔۔۔‘‘

’’یہ کوئی دیر نہیں۔‘‘ صفیہ نے جلدی سے کہا۔ ’’میں نے بتایا ناں کہ بہت زیادہ ایمرجنسی کی بات نہیں ہے۔ آپ نو بجے تک آ جایئے گا۔ پھر بات کریں گے۔‘‘

’’اگر معاملہ زیادہ سیریس ہے تو۔۔۔‘‘

’’جی نہیں۔ موبائل پر کرنے کی بات نہیں ہے۔ آپ گھر آ جایئے۔ تسلی سے بات کریں گے۔‘‘

’’او کے۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ حافظ۔‘‘

’’اللہ حافظ۔‘‘ صفیہ نے رابطہ کاٹ دیا۔

’’خیریت ہے چھوٹے مالک۔‘‘ ملک ہونے والی گفتگو سے کچھ اندازہ نہ لگا پایا تو پوچھا۔

’’ہاں۔ حویلی جاؤں گا تو پتہ چلے گا۔ ویسے خیریت ہی ہو گی۔ ورنہ تمہاری مالکن مجھے فوراً آنے کو کہتی۔‘‘

ملک جواب میں محض سر ہلا کر رہ گیا۔ چوپال میں خاموشی چھا گئی۔ کبھی کبھی حقے کی گڑ گڑ اس میں ارتعاش پیدا کر دیتی اور بس۔

نماز سے فارغ ہو کر حافظ عبداللہ کچھ دیر چٹائی پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اب تک کی صورتحال پر غور کر رہا تھا۔ درویش کی باتیں اس کے دل و دماغ میں بھونچال سا پیدا کر رہی تھیں۔ اس کی کئی باتوں کا مفہوم اسے اب سمجھ آ رہا تھا۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب لڑکی کے ادھ کھلے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی کراہ خارج ہوئی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور چارپائی کے پاس چلا آیا۔ لڑکی غنودگی ہی کے عالم میں کراہی تھی۔ ابھی تک اس کے ہوش میں آنے کے آثار واضح نہیں تھے۔ اس نے تو اب تک کروٹ بھی نہ لی تھی۔ چت پڑی تھی۔

حافظ عبداللہ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ اچھی خاصی قبول صورت تھی۔ عمر بیس بائیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ شادی شدہ بھی نہ لگتی تھی۔ کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں۔ ناک میں لونگ نے اس کی کشش کو بڑھا دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی نیلاہٹ اب تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ کمبل میں مستور اس کے بدن کا گداز حافظ عبداللہ کو یاد آیا تو وہ تھرا کر رہ گیا۔ ”استغفر اللہ“ کہہ کر اس نے لڑکی کی چہرے سے نظریں ہٹانا چاہیں' مگر چونک کر رک گیا۔ نجانے کیوں اسے لگا کہ لڑکی بڑا کھینچ کر سانس لے رہی ہے اور اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی ہوئی تمتماہٹ کمرے کے ماحول یا کمبل کی گرمی کی وجہ سے نہیں ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ لڑکی کے صبیح ماتھے پر رکھا اور گھبرا کر واپس کھینچ لیا۔ ماتھا تو آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ اپنے اندیشے کی تصدیق کیلئے اس نے ذرا سا کمبل سرکایا اور لڑکی کا پہلو میں پڑا ہاتھ چھو کر دیکھا۔ ہاتھ بھی انگارہ بنا ہوا تھا۔

”کہیں اس پر نمونیہ کا حملہ تو نہیں ہو گیا؟“ اس کے ذہن میں ایک خیال سرسرایا۔

یہ نا ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ نجانے کب سے سیلاب کے یخ پانی میں بہہ رہی تھی۔ پانی سرد اوپر سے سردی کا موسم۔ اس کا اکڑا ہوا بدن تو اب نرمی پکڑ رہا تھا مگر سردی یقیناً اس پر اپنا اثر دکھا چکی تھی۔

لڑکی کا ہاتھ کمبل کے اندر کر کے وہ سیدھا ہو گیا۔ اس وقت اس جگہ وہ اس کی کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ دوا کے نام پر وہاں پھانکنے کو دھول تک نہ تھی۔ اور اس صورتحال میں وہ اس کے لئے کیا احتیاطی اور طبی تدبیر کرتا' اس سے وہ

نابلد تھا۔

کچھ سوچ کر وہ باہر نکلا' دروازہ بھیڑ دیا اور ساتھ والے کمرے میں چلا آیا۔ یہ وہ کمرہ تھا جس کے اندر سے اسے درویش کے نماز میں قرات کرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ کمرے کے قبلہ رخ طاق میں چراغ جل رہا تھا۔ مغربی دیوار کے پاس آگے پیچھے دو چٹائیاں بچھی تھیں۔ آگے والی چٹائی پر عین درمیان میں رحل پر سبز جزدان میں ملفوف قرآن حکیم دھرا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کوئی سامان نہ تھا۔

وہ چاروں طرف نظر دوڑا کر باہر نکل آیا۔ اب اس کا رخ مزار کی جانب تھا۔ مزار کے باہر چپل اتار کر اس نے سبز دروازہ وا کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ صحن کے پار سامنے سبز منقش چادروں اور پھولوں سے ڈھکی بابا شاہ مقیم کی قبر پر چند اگربتیاں سلگ رہی تھیں' جن کی بھینی بھینی خوشبو سے وہاں کا ماحول اس اکیلی رات میں عجیب پُراسرار سا ہو گیا تھا۔ صحن کے بائیں ہاتھ بنے کمرے کو دیکھتا ہوا وہ بابا شاہ مقیم کے گنبد میں داخل ہو گیا۔

گنبد کے اندر شمالی جانب ایک لکڑی کی الماری میں ان گنت قرآن پاک کے نسخے' سیپارے اور دوسری وظائف کی کتب پڑی تھیں۔ چھت کے درمیان کسی چاہنے والے نے قندیل لٹکا دی تھی۔ دیواروں پر پھولدار ٹائلیں جڑی تھیں۔ قبر کے اردگرد دیواروں تک کی تقریباً چار چار فٹ کی جگہ پر کھجور کی صفیں ترتیب سے بچھی تھیں۔ مشرقی سمت میں ایک بڑی کھڑکی تھی جو اس وقت بند تھی۔ قبلہ رخ محراب بنی تھی تاکہ اگر کوئی وہاں نوافل وغیرہ پڑھنا چاہتا تو اسے دقت نہ ہوتی۔

حافظ عبداللہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا بابا شاہ مقیم کے چہرے کی جانب آیا اور دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ سر جھک گیا اور ہاتھ گود میں آ پڑے۔ کچھ دیر اسی عالم میں گزری تو غیر محسوس انداز میں اس کے دل کی دھڑکن مدھم سی ہو گئی اور وہ اردگرد سے بے خبر ہو گیا۔

بڑی آہستگی سے ایک انجانی سی مہک کا ایک جھونکا جاگا اور حافظ عبداللہ کے گرد ہالہ سا تن گیا۔ مہک نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اسے لگا' اس کے بالوں میں بڑی نرمی سے کوئی اپنی انگلیاں پھیر رہا ہے۔ اسے دلاسہ دے رہا ہے۔ تشفی دے رہا ہے۔ پیار کر رہا ہے۔ ہمت بندھا رہا ہے اس کی۔ حوصلہ دے رہا ہے۔

کتنی دیر گزری' اسے پتہ نہ چلا۔ جب یہ احساس مدھم پڑا تو دھیرے سے اس نے سر اٹھایا' تب اسے علم ہوا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ شبنم' اس کے گود میں دھرے ہاتھوں پر قطرہ قطرہ گر رہی تھی۔ گریبان بھیگا ہوا تھا اور اندر جیسے ڈھل سا گیا تھا۔

آہستہ سے اس نے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ اشک سارے چہرے پر ملتے ہوئے لگا جیسے اس نے وضو کر لیا

ہو۔

"بابا۔" اس کے نہاں خانہ دل سے بے اختیار ایک سرگوشی ایک بار پھر آنسوؤں کی برسات لئے نکلی اور ماحول میں رچی مہک کے ساتھ ہولی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے قبر کے تعویذ پر سر ٹیک دیا۔

وہ کیوں رو رہا تھا؟ اسے خود معلوم نہ تھا لیکن اسے تو سب معلوم تھا جو اسے رُلا رہا تھا۔ نہیں۔ رُلا نہیں رہا تھا' اسے پاکیزگی کا غسل دے رہا تھا۔ اس پانی سے وضو کرا رہا تھا جو ہر ایک کے اندر تو ہوتا ہے' باہر نصیب والوں ہی کے آتا ہے۔

* * *

ماسٹر محسن' لالو تیلی اور اس کا بیٹا عادل تینوں آ چکے تھے۔

ماسٹر محسن ان دونوں کو بار بار بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ باپ بیٹا سر جھکائے بیٹھے تھے۔

ماحول پر ایک تناؤ سا طاری تھا۔ طاہر نے ملک کی جانب دیکھا۔ اس نے اس کا عندیہ جان کر چاچا شمسو کو ہاتھ اٹھا کر دور ہی سے اشارہ کیا۔ اسی وقت دو تین آدمی اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی چاچا شمسو کے ساتھ سب لوگوں کو چائے کے پیالے تھما رہے تھے۔

ملک نے طاہر کے بائیں ہاتھ موڑھے پر بیٹھے لالو اور عادل اور دائیں ہاتھ بیٹھے ماسٹر محسن کو خود چائے کے پیالے پیش کئے جو خاموشی سے لے لئے گئے۔ طاہر اور ملک نے سب سے آخر میں چائے لی اور ہولے ہولے چسکیاں لینے لگے۔

پھر جب لالو اور ماسٹر محسن نے خالی پیالے زمین پر رکھے تو طاہر نے بھی اپنا پیالہ ملک کے حوالے کر دیا۔ پہلو بدلا۔ سنبھل کر بیٹھا اور ماسٹر محسن کی طرف متوجہ ہوا۔

"ماسٹر صاحب۔ میں نے آپ کو جس مقصد سے یہاں بلایا ہے' وہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔" اس نے بڑے ناپ تول کر الفاظ زبان سے نکالے۔

"جی۔" ماسٹر محسن نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں۔ "پھر بھی میں آپ کی زبان سے سننا چاہوں گا۔" اس کی آواز بالکل سپاٹ تھی۔

"میں آپ سے عمر میں بھی چھوٹا ہوں اور منصب میں بھی ماسٹر صاحب۔ آپ خیر بانٹتے ہیں۔ علم کی آبیاری کرتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ میری کسی بات سے آپ کی دل آزاری نہ ہو اور اگر ایسا ہو جائے تو وہ سہواً ہو گا۔ پھر بھی اس کے لئے میں پیشگی آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔" طاہر کے لہجے میں جو ادب تھا اس نے ماسٹر محسن کی

پیشانی پر ٹوٹی ٹھیکریوں میں نمایاں کمی کر دی۔ کچھ دیر رک کر اس نے پھر زبان کھولی۔

’’میں اس جھگڑے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا جو ہو چکا ہے۔ صرف یہ چاہوں گا کہ اس جھگڑے کے اثرات مٹ جائیں۔‘‘

’’کیسے؟‘‘ ماسٹر محسن کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔

’’اس کا حل تو موجود ہے ماسٹر صاحب مگر اس کے لئے آپ کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔‘‘ طاہر نے اس کڑواہٹ کو نظر انداز کر دیا۔

’’اور اگر میں اس پر راضی نہ ہوں تو؟‘‘ ماسٹر نے بڑے ضبط سے کہا۔

’’میں پھر بھی کوشش ضرور کروں گا ماسٹر صاحب۔ یہ میرا حق ہے اور مجھ پر فرض بھی۔ اپنے والد کے بعد گاؤں کے دکھ سکھ کی ذمہ داری مجھ پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔‘‘

’’کیا مجھے کھل کر کچھ کہنے کی اجازت ہے چھوٹے مالک؟‘‘ اچانک ماسٹر محسن کا پیمانہ صبر جیسے لبریز ہو گیا۔ اس کے لہجے میں ٹیس سی محسوس کر کے طاہر کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

’’آپ جو کہنا چاہیں' جیسے کہنا چاہیں' آپ کو اس کے لئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے ماسٹر صاحب۔ یہاں آپ کی کسی بات کا برا ماننے والا میرے سمیت کوئی ایک فرد بھی موجود نہیں ہے۔‘‘

’’تو مجھے صرف یہ بتایئے کہ اگر میری جگہ۔۔۔‘‘ ماسٹر محسن ایک ثانئے کو رکا' طاہر کی جانب دیکھا اور انگلی اس کی طرف اٹھا دی۔ ’’آپ ہوتے تو۔۔۔‘‘

’’ماسٹر۔۔۔‘‘ بلال ملک نے تیزی سے کہنا چاہا۔ باقی کے سب لوگ بھی ہکا بکا رہ گئے۔ ماسٹر سے اتنی بڑی بات کی توقع کسی کو بھی نہ تھی۔ لالو اور عادل بھی پہلو بدل کر رہ گئے۔

’’ملک۔‘‘ طاہر نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی اور مزید کچھ کہنے سے تحکمانہ اشارے سے روک بھی دیا۔ ملک بادل نخواستہ واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ تاہم اس کے انداز سے ناراضگی واضح تھی۔

’’آپ گھبرایئے نہیں ماسٹر صاحب۔‘‘ طاہر کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔ ’’میں نے کہا ناں' آپ کو جو کہنا ہے اور جس طرح کہنا ہے' کہیے۔ میں نے آپ کا دکھ سننے ہی کے لئے آپ کو یہاں بلایا ہے۔‘‘

’’مجھے زیادہ نہیں کہنا۔‘‘ ماسٹر محسن کا لہجہ شکستگی سے کٹ گیا۔ ہاتھ نیچے ہو گیا۔ ’’صرف یہ پوچھنا ہے کہ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے؟‘‘ اس کا سر جھک گیا۔

’’ماسٹر صاحب۔‘‘ طاہر نے اس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ ’’آپ کے سوال کا جواب میرے ان چند

چھوٹے چھوٹے سوالوں میں پوشیدہ ہے جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں' اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔۔۔‘‘

’’جی۔ پوچھئے۔‘‘ ماسٹر محسن نے دونوں بازو سینے پر باندھ لئے اور خاک آلود اینٹوں کے فرش کو گھورنے لگا۔

’’اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں ماسٹر صاحب کہ ہمارے مذہب نے شادی میں پسند اور ناپسند کے جو حقوق مرد کو دیے ہیں وہی عورت کو بھی حاصل ہیں۔‘‘

’’جی۔‘‘ ماسٹر نے مختصر سا جواب دیا۔

’’زبیدہ نے نثار کے رشتے سے کیوں انکار کیا؟‘‘ طاہر نے ہولے سے پوچھا۔

’’وہ۔۔۔وہ۔۔۔‘‘ ماسٹر محسن مضطرب سا ہوا۔

’’مجھے معلوم ہے کہ اس نے انکار کیوں کیا ماسٹر صاحب اور یہی بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب ہم بیٹے کو اس کی پسند کے بارے میں پوچھ کر' کبھی کبھار اسے لڑکی دکھا کر بھی شادی کے بارے میں اس کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو زندگی کے اس سب سے بڑے فیصلے کے بارے میں بیٹی کو زبان کھولنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے' جبکہ ہمارا دین اس کے لئے بیٹی کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی پسند سے آگاہ کر سکتی ہے۔ جس سے اس کا نکاح کیا جا رہا ہے اسے نکاح سے پہلے دیکھ سکتی ہے اور ہاں یا نہ کا حق محفوظ رکھتی ہے۔ جب زبیدہ نے آپ کے مجوزہ رشتے سے انکار کرتے ہوئے آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کیا تو آپ نے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے اس کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا۔ اسے مارا پیٹا۔ کیوں؟‘‘ طاہر کی آواز بلند ہو گئی۔ ’’آپ کو یہ حق تو ہے کہ اگر اس کے لئے عادل کا رشتہ موزوں نہ تھا تو اس کی اونچ نیچ سے زبیدہ کو آگاہ کرتے۔ اسے سمجھاتے۔ مگر اس پر ہاتھ اٹھانا کیا مناسب تھا؟ دوسرے جب عادل کے گھر والے اس کا رشتہ لے کر آپ کے دروازے پر پہنچے تو آپ کو پورا حق تھا کہ آپ اس رشتے سے انکار کر دیتے' جیسا کہ آپ نے کیا بھی لیکن اس کے بعد آپ نے ایک بار پھر زبیدہ ہی کو کیوں پیٹا؟‘‘

’’باتیں کرنا بہت آسان ہیں چھوٹے مالک۔‘‘ ایک دم ماسٹر محسن کی زبان کا تالا کھلا۔ ’’سمجھانے کے نام پر نصیحتیں کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ مجھے علم کی روشنی تقسیم کرنے والا خیال کر کے میری اس جاہلانہ حرکت پر مجھ سے جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے لیکن خاندان اور گاؤں والوں کی باتوں کے زہریلے نشتر' ان کے طعنوں کا پگھلا ہوا سیسہ قطرہ قطرہ کانوں میں اتارنا کتنا مشکل ہے' اس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ اس کیفیت سے گزر کر دیکھئے چھوٹے مالک' جس سے قسمت نے مجھے دوچار کر دیا ہے۔ پھر آپ کو احساس ہوگا کہ جس پھول سی بیٹی کو میں نے کبھی جھڑکی نہیں دی' اس پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے میرے دل کے کتنے ٹکڑے ہوئے ہوں گے۔‘‘ ماسٹر محسن کی آواز بھرا گئی۔ ’’میں ایک عام سا کمزور آدمی ہوں چھوٹے مالک' جس کے سر پر استاد ہونے کا تاج ہے تو دامن میں صرف عزت کے چند ٹکڑے' جن

کے چھن جانے کے احساس نے مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ قصائیوں کا سا سلوک کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں دین کے بارے میں وہ بھی جانتا ہوں جو اس چوپال میں بیٹھے سب لوگوں کے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے مگر مجھے انہی کے درمیان رہنا ہے۔ انہی کے ساتھ رشتے اور تعلقات نبھانے ہیں۔ نثار کا رشتہ میں نے کیوں قبول کیا؟ اس کے پیچھے میری صرف ایک مجبوری تھی۔ میرے پورے خاندان میں زبیدہ کے لئے ایسا کوئی لڑکا موجود نہیں ہے جس کے ساتھ میں اس کی شادی کر سکوں۔ لڑکے ان پڑھ ہیں یا زبیدہ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ میری بیٹی ایف اے پاس ہے۔ میں دل کا مریض ہوں چھوٹے مالک۔ کب زندگی کی شام ہو جائے' نہیں جانتا۔ مجھے دور دور تک اس کے لئے جب مناسب رشتہ نظر نہ آیا تو دل پر جبر کر کے میں نے نثار کے رشتے کے لئے ہاں کہہ دی۔''

''ایک منٹ ماسٹر صاحب۔'' طاہر نے اس کی بات روک دی۔ ''یہاں تک میں آپ کی ہر بات سے پوری طرح متفق ہوں۔ آپ نے جو کیا' درست کیا لیکن جب زبیدہ نے انکار کیا اور اس کے بعد عادل کا رشتہ بھی اس کے لئے آیا تب آپ نے خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے انکار اور مار پیٹ کا راستہ کیوں اختیار کیا؟ میرا خیال ہے عادل' ہر طرح سے زبیدہ کے لئے موزوں ہے۔''

''مگر وہ ہماری برادری سے نہیں ہے چھوٹے مالک۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' بے اختیار طاہر کی زبان سے نکلا۔ ''ماسٹر صاحب۔ اب آپ کی سوچ پر مجھے افسوس نہ ہو تو یہ میری اپنے ساتھ زیادتی ہو گی۔ آپ پڑھے لکھے ہو کر بھی ذات برادری کے چکر میں غوطے کھا رہے ہیں؟''

''یہ معمولی بات نہیں ہے چھوٹے مالک۔'' ماسٹر محسن نے سر اٹھایا۔ ''میں نے شروع میں پوچھا تھا کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ اس سوال کا جواب دینے کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔ آپ نے بھی تو ابھی شادی کی ہے۔ آپ نے خاندان' ذات برادری دیکھ کر ہی تو نکاح کیا ہو گا؟''

طاہر کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ نے ہلکورا لیا۔

''ماسٹر صاحب۔ اگر میرے جواب نے ذات برادری کی نفی کر دی تو؟'' اس نے ماسٹر محسن کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

''تو میں وعدہ کرتا ہوں چھوٹے مالک کہ مجھے آپ کا۔۔۔'' ماسٹر صاحب نے پورے عزم سے کہا۔ ''ہر فیصلہ منظور ہو گا۔''

''سوچنے کی مہلت نہیں دوں گا میں آپ کو۔'' طاہر نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''میں ایک سیکنڈ کا وقت نہیں مانگوں گا۔'' وہ بھی آخری داؤ کھیلنے کے سے انداز میں بولے۔

”تو سنئے ماسٹر صاحب۔ میری بیوی اور آپ کی چھوٹی مالکن نہ تو میرے خاندان سے ہے نہ میری ذات برادری سے اور نہ ہی کسی کروڑ پتی گھرانے سے۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک یتیم لڑکی ہے جس کی شرافت اور خوب سیرتی نے مجھے اسیر کر لیا اور اس اسیری کی بھی وضاحت کر دوں۔ میں نے اسے شادی سے پہلے دیکھا تک نہ تھا۔ آپ کی بڑی مالکن نے اسے پسند کیا اور ہم دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا۔ اب کہئے کیا کہتے ہیں آپ؟“

ماسٹر محسن منہ کھولے طاہر کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہاں موجود گاؤں والوں کو بھی اس حقیقت کا شاید آج ہی علم ہوا تھا اس لئے وہ بھی حیران سے تھے۔

”میں آپ کی حیرت ختم ہونے کا منتظر ہوں ماسٹر صاحب۔“ کتنی ہی دیر بعد طاہر نے ماسٹر محسن کو مخاطب کیا تو وہ دھیرے سے چونکے۔

”جی۔۔۔“ ماسٹر صاحب نے پلکیں جھپکیں تو نمی رخساروں پر ڈھلک آئی۔ ”میں حیران کم اور شرمندہ زیادہ ہوں چھوٹے مالک۔“ انہوں نے چشمہ اتار کر آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

”آپ کو شرمندہ کرنا میرا مقصد نہیں تھا ماسٹر صاحب۔“ طاہر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا۔ ”میں تو اس مسئلے کا حل چاہتا ہوں جس نے آپ جیسے ذی علم انسان کو کانٹوں کے بستر پر لا پھینکا۔“

”اب کوئی چبھن نہیں چھوٹے مالک۔“ ماسٹر محسن نے چشمہ دوبارہ آنکھوں پر چڑھا لیا۔ ”میرا دل مطمئن ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہے۔“

”نہیں ماسٹر صاحب۔“ طاہر نے اس کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ”فیصلہ اب بھی آپ ہی کا ہے۔ میں تو صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔“

”میرے لئے وہ بھی حکم ہو گا چھوٹے مالک۔ آپ فرمائیے۔“ ماسٹر محسن کا لہجہ بیحد پُرسکون تھا۔

”عادل بہت اچھا لڑکا ہے ماسٹر صاحب۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔“ طاہر نے آہستہ سے کہا اور ہونٹ کاٹتے لالو کی جانب دیکھا جو کسی بھی لمحے رو دینے کو تھا۔ عادل سر جھکائے فرش کو گھور رہا تھا۔

”آپ تاریخ مقرر کر دیجئے چھوٹے مالک۔ میری طرف سے کوئی دیر نہیں ہے۔“ ماسٹر محسن سب کچھ نبٹا دینے پر تلے بیٹھے تھے۔

”کیوں لالو چاچا؟“ طاہر نے اس کی جانب دیکھا اور ایک دم لالو کندھے پر پڑے رومال کے کونے میں منہ چھپا کر بلک پڑا۔ اس کی ہچکی ہی بندھ گئی۔ وہ بچوں کی طرح روئے جا رہا تھا۔

ملک نے ایک دم اٹھ کر اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر طاہر نے اسے روک دیا اور ماسٹر محسن کی جانب دیکھا۔ ایک دم ماسٹر صاحب اٹھے اور دو قدم بڑھ کر لالو کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''لالو۔'' ان کے ہونٹوں سے نکلا اور لالو نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر برستی آنکھوں سے لگا لئے۔ ماسٹر صاحب نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔

کتنی ہی آنکھیں نم نظر آ رہی تھیں۔ ملک ہنسا تو اس کے ہونٹوں کے گوشے لرز رہے تھے۔ رہا طاہر۔۔۔ تو وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ان دونوں کو ایسی فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا جس میں گاؤں کا بڑا ہونے کا غرور چھلکا پڑ رہا تھا۔

☆

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔

حافظ عبداللہ چٹائی پر بیٹھا تھا۔ جو قرآن پاک رحل پر اس کے سامنے کھلا رکھا تھا' یہ وہی تھا جو اسے دوسرے کمرے میں ملا تھا۔ مزار سے نکل کر جب وہ لڑکی والے کمرے میں آیا تو لڑکی ابھی تک بے سدھ تھی۔ تاہم مزار سے واپسی پر جب اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر حرارت کی شدت جاننا چاہی تو حیرت انگیز طور پر اس میں نمایاں کمی آ چکی تھی۔ اس کا دل تشکر اور ممنونیت سے لبالب ہو گیا۔ یہ صاحبِ مزار کی کرامت ہی تو تھی جو اللہ کے فضل سے ظاہر ہوئی تھی۔

اس نے لڑکی کو ہوش میں لانے کا خیال ترک کر دیا۔ ساتھ والے کمرے میں گیا اور وہاں سے قرآن پاک اور رحل اٹھا لایا۔ کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ کھیس کی بکل ماری۔ طاق میں رکھے چراغ کے قریب' چٹائی پر دوزانو بیٹھ کر قرآن پاک کو بوسہ دیا۔ کھولا اور منزل کرنے میں لگ گیا۔

کبھی کبھی وہ آہستہ سے گردن گھما کر لڑکی کا طائرانہ سا جائزہ لے لیتا اور دوبارہ دہرائی میں محو ہو جاتا۔

وقت گزرنے کا اسے احساس تو ہو رہا تھا مگر کتنا گزر گیا' یہ اسے علم نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد صبح ہو جائے تاکہ وہ گاؤں جا سکے۔ گاؤں کا خیال آیا تو اس کا دھیان مسجد کی جانب چلا گیا۔ مغرب اور عشاء کے وقت وہ وہاں موجود نہ تھا۔ نمازیوں کو بڑی دقت ہوئی ہو گی اور ساتھ ہی وہ فکر مند بھی ہوئے ہوں گے کہ آج حافظ کہاں چلا گیا؟ کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ وہ عصر کے بعد روزانہ کہاں جاتا ہے؟ ورنہ اب تک اسے کوئی نہ کوئی تلاش کرتا یہاں تک آ ہی چکا ہوتا۔

قرآن پاک کے الفاظ زبان سے ادا ہو رہے تھے اور دماغ ایسی ہی ادھر ادھر کی سوچوں میں بار بار الجھ رہا تھا۔ ایک آیت ختم کرتے ہوئے اس نے لڑکی کا جائزہ لینے کے لئے آہستہ سے گردن گھمائی اور الفاظ لڑکھڑا گئے۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ شاید اسے پیاس لگی تھی۔

لڑکی کی پیاس کا خیال جب تک حافظ عبداللہ کے دل میں آتا' تب تک برانگیختہ کر دینے والی کتنے ہی سوچیں اس پر یلغار کر چکی تھیں۔ لڑکی کا لبوں پر زبان پھیرنے کا انداز اتنا دلفریب تھا کہ حافظ عبداللہ کا دل بے قابو ہو گیا۔

’’پانی۔۔۔‘‘ اسی وقت لڑکی کے لبوں سے بڑی مہین سی آواز نکلی۔

حافظ عبداللہ چونک کر اپنی دگرگوں کیفیت سے باہر آیا۔ قمیص کو بدن سے الگ کیا۔ چنگیر کے پاس پڑا مٹی کا پیالہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحے بعد لوٹا تو پیالے میں پانی تھا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر وضو کے اثرات نمایاں تھے۔ سرد پانی نے اسے اپنی غیر ہوتی ہوئی حالت کو سنبھالنے میں بڑی مدد دی تھی۔

وہ چارپائی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ لڑکی کے پپوٹے لرز رہے تھے۔ اب بھی وہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی اور ’’پانی۔۔۔ پانی‘‘ کے الفاظ وقفے وقفے سے ادا کرتے ہوئے آہستہ آہستہ سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہی تھی۔

’’لیجئے۔ پانی پی لیجئے۔‘‘ حافظ عبداللہ نے اسے پکارا۔

لڑکی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ حافظ عبداللہ نے اسے چار پانچ بار پکارا مگر وہ تو نیم بیہوشی کے عالم میں پانی مانگ اور سر دائیں بائیں مار رہی تھی۔

حافظ عبداللہ تھوڑی دیر پیالہ ہاتھ میں لئے کچھ سوچتا رہا پھر اس نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا۔ پانی کا پیالہ دائیں ہاتھ میں لے کر اس نے دل کڑا کیا اور بایاں ہاتھ لڑکی کی گردن میں ڈال دیا۔ پھر اسے اوپر اٹھاتے ہوئے ذرا سا جھکا اور جگہ بنتے ہی چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا۔ اب لڑکی کے جسم کا سارا بوجھ اس کے سینے پر آ رہا۔ جسم کی کپکپی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پیالہ لڑکی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چھوٹے چھوٹے تین چار گھونٹ بھرنے کے بعد لڑکی نے منہ ہٹا لیا تو حافظ عبداللہ نے اٹھتے ہوئے اسے واپس چارپائی پر لٹا دیا اور خود پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پرے ہٹ گیا۔

سردی کی رات میں ابھی چند منٹ پہلے وہ یخ پانی سے وضو کر کے آیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی پیشانی پسینے کے گرم قطروں سے یوں بھیگ چکی تھی جیسے وہ اب تک دہکتے تنور پر جھکا رہا ہو۔ لڑکی اب اتنی بے سدھ نہ تھی۔ حافظ عبداللہ کو لگا' تھوڑی دیر میں وہ ہوش میں آ جائے گی کیونکہ اس کی آنکھوں پر جھکے پپوٹے ہولے ہولے پھڑک رہے تھے اور وہ بار بار گلا تر کرنے کے انداز میں تھوک بھی نگل رہی تھی۔

حافظ عبداللہ کی حالت بڑی مشکل سے سنبھلی۔ ایک خوبصورت' جوان اور مدافعت کے ناقابل لڑکی کے جسم کا اس کے ساتھ لگنا ایک ایسی کیفیت کا حامل عمل تھا' جس کے اثرات سے اس کا جسم اب تک جھنجھنا رہا تھا۔

پیالے میں ابھی کچھ پانی باقی تھا۔ حافظ عبداللہ نے چاہا کہ پانی پی لے تاکہ اس کے حواس میں بھڑکتی آگ میں کچھ تو کمی آئے۔ پھر نجانے کیا سوچ کر رک گیا۔ اس نے پیالہ چارپائی کے سرہانے فرش پر رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ ہینڈ پمپ پر جا کر اس نے ایک بار پھر چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے۔ اوک میں لے کر حلق تک پانی پیا۔ پھر کرتے کے دامن سے چہرہ اور ہاتھ خشک کرتا ہوا واپس لوٹ آیا۔

کمرے میں داخل ہوا تو چونک پڑا۔

لڑکی ہوش میں آ چکی تھی۔ اس نے کمبل ایک طرف ڈال دیا تھا اور لرزتی کانپتی چارپائی سے اتر چکی تھی۔ حافظ عبداللہ پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹکی۔ گھبرا کر اس نے کمبل سے اپنے نیم برہنہ جسم کو چھپایا اور دیوار کی طرف الٹے پاؤں سرکتے ہوئے متوحش ہرنی کی طرح اسے دیکھنے لگی۔

''گھبرائیے نہیں۔'' حافظ عبداللہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید پیچھے ہٹنے سے روک دیا۔ ''مجھ سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔'' اس نے دروازے کے اندر آتے ہی اپنے قدم روک لئے۔ اتنی دیر میں وہ دیوار کے بالکل ساتھ جا لگی۔

''میں اس وقت کہاں ہوں؟'' کچھ دیر تک حافظ کو بغور گھورتے رہنے کے بعد اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''نورپور گاؤں یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔'' حافظ عبداللہ نے جواب دیا اور ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

''نورپور؟'' حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

''جی ہاں۔'' حافظ عبداللہ نے چٹائی پر پڑا کھیس اٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نورپور کی اکلوتی مسجد کا امام ہوں۔ یہ جگہ بھی نورپور ہی کی حد میں آتی ہے۔ بابا شاہ مقیم کے مزار کا ایک کمرہ ہے جہاں آپ اس وقت موجود ہیں۔''

''بابا شاہ مقیم۔'' لڑکی بڑبڑائی۔ ''مگر میں اتنی دور۔۔۔''

''آپ ایک درخت کے ساتھ چمٹی ہوئی سیلابی ریلے میں بہتی جا رہی تھیں۔ میں اتفاق سے وہاں ٹبے پر موجود تھا۔ اللہ نے ہمت دی اور میں آپ کو پانی سے نکال لایا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' لڑکی اب بھی پریشان تھی۔

''آج شام کے قریب کا وقت تھا۔ تب سے آپ بیہوش پڑی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے پانی مانگا تو میں نے چند گھونٹ آپ کو پلائے۔ پھر میں۔۔۔'' حافظ عبداللہ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک پل کو اس کے بدن میں

جھرجھری سی دوڑ گئی۔ پھر وہ نظر اس کے سراپے سے ہٹا کر بولا۔ ”وضو کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو آپ شاید بھاگنے کی تیاری میں تھیں۔“ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

”ن۔۔۔ نہیں۔ بھاگنے کی نہیں۔“ وہ گڑبڑا گئی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر حافظ عبداللہ کی طرف دیکھا۔

”میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔“ حافظ عبداللہ نے کہا۔ ”اس صورتحال میں آپ کا کوئی بھی اقدام اپنی حفاظت اور مجھ پر بدگمانی کے لئے جائز ہے۔“ اس نے دروازہ آدھا بھیڑ دیا۔

”یہ دروازہ کیوں بند کر دیا آپ نے؟“ وہ جلدی سے دو قدم آگے آ گئی۔

”ہوا بہت سرد ہے۔“ حافظ عبداللہ نے نرمی سے کہا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”آپ کا بخار شاید اب کم ہو گیا ہے۔ تاہم جب میں آپ کو پانی سے نکال کر لایا تھا تو آپ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ ابھی ٹھنڈی ہوا آپ کے لئے نقصان دہ ہے۔ پھر میں نے دروازہ بند نہیں کیا‘ صرف بھیڑ دیا ہے۔ آپ خود کو سنبھالئے۔ شک اور اندیشہ اس وقت آپ کا حق ہے مگر ہم دونوں کے علاوہ بھی ایک ہستی یہاں موجود ہے‘ جس کے ہوتے ہوئے آپ کو ہر اندیشے سے بے نیاز ہو جانا چاہئے۔“

”کون۔۔۔ کون ہے تیسرا یہاں؟“ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

”وہ۔۔۔“ حافظ عبداللہ نے چھت کی جانب انگلی اٹھا دی۔ ”وہ‘ جو ہر جگہ موجود ہے۔ صرف آپ کو اس کا یقین ہونا چاہئے‘ جیسے مجھے ہے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”اوہ۔۔۔“ لڑکی خجل سی ہو گئی۔ اس نے شرمندہ شرمندہ سی نظروں سے حافظ عبداللہ کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر پاؤں کے ناخن سے زمین کریدنے لگی۔

”صبح تک آپ کو یہیں ٹھہرنا ہوگا۔“ حافظ عبداللہ نے پھر کہا۔ ”کل کی بارش نے کیچڑ بہت کر دیا ہے۔ سواری کوئی موجود نہیں ہے اور گاؤں تک اس اندھیرے میں پیدل جانا نری مصیبت ہے۔ آپ نے نجانے کب سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ طاق میں چنگیر رکھی ہے۔ کھانے کو اس وقت یہی میسر ہے۔ کھا لیجئے۔ پیالے میں پانی بھی ہے۔“ اس نے چارپائی کے سرہانے زمین پر پڑے مٹی کے پیالے کی جانب اشارہ کیا۔ پھر چٹائی کے پاس آ گیا۔

قرآن پاک کو چوم کر سینے سے لگایا۔ رحل اٹھائی اور لڑکی کی جانب دیکھا جو دیوار سے لگی کھڑی اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ حافظ عبداللہ کو لگا‘ اس کی نظروں میں عجب سحر سا کروٹیں لے رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے‘ گالوں پر بکھری دو تین لٹیں اور سینے کا زیروبم‘ کسی بھی خیال‘ کسی بھی سوچ کو گمراہی کا راستہ دکھانے کے لئے کافی تھے۔

”اگر آپ کو اپنے اور میرے اللہ پر بھروسہ ہے تو بے فکر ہو جایئے۔ کھانا کھایئے اور چارپائی پر آرام کیجئے۔“ اچانک حافظ عبداللہ کی آواز نے کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ”میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آپ اندر سے کنڈی لگا لیجئے۔ صبح ہوتے ہی میں آپ کو نور پور لے چلوں گا۔ وہاں چوہدری حسن دین آپ کو آپ کے گھر بھجوانے کا انتظام کر دیں گے۔“

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ پلٹ کر لڑکی کی جانب دیکھا جو ابھی تک اپنی سابقہ حالت میں تھی۔

”اگر کوئی کام ہو تو اس کھڑکی پر دستک دے دیجئے گا۔“ اس نے دونوں کمروں کی درمیانی دیوار میں بنی چار ضرب چار کی بند کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور دروازے سے نکل گیا۔

لڑکی خاموش کھڑی کتنی ہی دیر تک خالی دروازے کو گھورتی رہی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی جاری تھی۔ حافظ عبداللہ کی باتیں اور اب تک کا رویہ اسے قائل کر رہا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کر لے جبکہ ایک جوان مرد کے ساتھ اس جگہ رات بھر رہنے کا فیصلہ کرنا اس کے لئے بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جہاں دو جوان جسم موجود ہوں وہاں شیطان کو آتے دیر نہیں لگتی۔ اور وہ ایسی طاقتور بھی نہیں تھی کہ شیطان اور حافظ عبداللہ کا تنہا مقابلہ کر سکتی۔

اس نے سر جھکا لیا اور ایک ایک کر کے حافظ عبداللہ کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اس کی کسی بات میں کوئی ول چھل نہ تھا۔ اس کی نگاہوں میں اسے اپنے لئے کوئی ایسا تاثر نہ ملا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اس کے لئے خطرہ ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنا چاہتا تو وہ بقول حافظ عبداللہ کے شام سے اس کے پاس اس کمرے میں بیہوش پڑی تھی۔ اس دوران اسے روکنے والا کون تھا مگر وہ محفوظ رہی۔ اور اب تو وہ جاگ رہی تھی۔ پورے ہوش و حواس میں تھی۔ اب وہ کم از کم اس کے کسی اقدام کے خلاف مدافعت تو کر ہی سکتی تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا دماغ درد کرنے لگا۔ بدن میں تھکاوٹ سی در آئی تو اس نے خود کو اللہ کے آسرے پر موجودہ صورتحال کے سپرد کرنے کا ارادہ کر لیا۔

سر اٹھا کر اس نے کھلے دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر اندر سے کنڈی لگانے کے خیال سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی۔ چراغ کے قریب سے گزرنے پر اس کی لو تھرتھرائی۔

وہ دروازے کے قریب پہنچی تو ایک خیال کے تحت ایک پل کو رکی۔ پھر دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے کے دروازے کے پاس ٹھہر کر اس نے ذرا سی گردن آگے نکالی اور بھڑے ہوئے دروازے میں سے اندر جھانکا۔

حافظ عبداللہ کی پشت کمرے کے دروازے کی جانب تھی اور وہ کھیس کی بکل مارے چٹائی پر بیٹھا تھا۔ قرآن

پاک اس کے آگے رحل پر کھلا دھرا تھا۔ چراغ اس نے اپنے دائیں ہاتھ اینٹوں کی ایک ڈھیری پر رکھ چھوڑا تھا تا کہ اس کی روشنی قرآن پاک پر پڑتی رہے۔ وہ سر جھکائے ہولے ہولے آگے پیچھے ہل رہا تھا۔

غور سے سنا تو لڑکی کے کانوں میں قرآن پاک پڑھنے کی ہلکی سی آواز کسی خوشخبری کی طرح اترتی چلی گئی۔ سکون اور اطمینان نے اس کے حواس پر تسلی کی چادر تان دی۔

چند لمحے وہاں کھڑا رہنے کے بعد اس نے گردن پیچھے کھینچ لی۔ خاموش قدموں سے کمرے میں لوٹی۔ دروازہ بند کیا تو اس کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا۔ یہ دیکھ کر کہ دروازے کے اندر کی جانب کنڈی کا نام ونشان ہی نہ تھا۔ لگتا تھا بہت دیر پہلے وہ ٹوٹی اور دوبارہ کسی نے اسے لگانے کی کوشش ہی نہ کی۔

خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کیا مگر جب کنڈی ہی نہ تھی تو وہ بند رہتا یا کھلا ایک برابر تھا۔

کچھ سوچ کر وہ کھڑکی کے قریب آئی۔ کھڑکی بند ضرور تھی مگر اس میں بھی کوئی کنڈی یا چٹخنی موجود نہ تھی۔ شاید دوسرے کمرے کی طرف ہو گی۔ ایک بار پھر غیر محفوظ ہونے کا خیال اندھیرے کی دبیز چادر کی طرح اس کے دماغ پر پھیلا۔ بے اختیار اس کا سر کھڑکی سے جا لگا۔ اسے چکر سا آ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے سارے اندیشے بند کھڑکی کی دوسری طرف سے آتی حافظ عبداللہ کی تلاوت کی آواز پر قربان ہو گئے۔ اس کا جی چاہا وہ اس آواز کو سنتی رہے جو اس کے جسم و جان میں عجب سکون بھری سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اسے اپنے اللہ پر بھروسے کا سبق دے رہی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہے۔ بقول حافظ عبداللہ کے، وہاں اس کا خالق و مالک موجود ہے۔ اور وہ تو ہر جگہ موجود ہے، بس ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔

اس خیال کا آنا تھا کہ اس کے جسم میں ایک طاقت عود کر آئی۔ یقین، بھروسے اور اعتبار کی طاقت۔ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ چند لمحوں تک بند کھڑکی کو گھورتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چارپائی کے پاس آ گئی۔

چنگیر پر نظر پڑی تو بھوک جاگ اٹھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کمبل کے پلو کھولے۔ اسے اپنے شانوں پر دائیں بائیں پھیلایا۔ چنگیر اٹھا کر گود میں رکھی۔ رومال کی تہہ کھولی تو اندر مکئی کی دو روٹیوں پر سرسوں کا ساگ دیکھ کر پیٹ میں اینٹھن سی ہوئی۔ ایک نظر بند دروازے اور کھڑکی پر ڈالی، پھر اس کا ہاتھ بے اختیار روٹی کی طرف بڑھ گیا۔

☆

طاہر حویلی واپس آیا تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

حویلی کے اندر اور باہر سکوت طاری تھا۔ ملازموں میں سے کچھ جاگ رہے تھے، زیادہ تر سونے کے لئے جا

چکے تھے۔ ملک اس سے رخصت ہوا تو طاہر اندر چلا۔ اس کا رخ لیڈیز ڈرائنگ روم کی جانب تھا۔

’’چھوٹے مالک۔‘‘ اچانک ایک آواز نے اسے کاریڈور میں روک لیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ حویلی کی ایک ملازمہ فہمیدہ اس کی طرف سر جھکائے چلی آ رہی تھی۔

’’مالکن آپ کے کمرے میں ہیں۔‘‘ فہمیدہ نے اس کے قریب آ کر ادب سے کہا۔

’’اچھا۔‘‘ اس نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ کاریڈور سے بائیں مڑتے ہی پہلا کمرہ اس کا تھا‘ جو اس کی عدم موجودگی میں شاذ ہی کھلتا تھا۔ فہمیدہ دروازے پر رک گئی۔

’’کھانا لگا دوں چھوٹے مالک؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’تمہاری مالکن نے کھا لیا؟‘‘ اس نے کھلے دروازے میں قدم رکھا۔

’’جی نہیں۔ آپ کے انتظار میں تھیں۔‘‘

’’تو کھانا یہیں لے آؤ۔‘‘

’’جی بہتر۔‘‘ وہ لوٹ گئی۔

طاہر اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہ ہوئی کہ ابھی تک صفیہ کو چند عورتیں گھیرے بیٹھی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر وہ کپڑے سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر اسے باری باری سلام کر کے وہ کمرے سے نکل گئیں۔ آخر میں ایک نوجوان لڑکی اٹھی تو صفیہ نے اسے روک لیا۔

’’تم رکو۔‘‘

’’جی۔‘‘ لڑکی نے گھبرا کر طاہر کی جانب دیکھا۔

’’بیٹھ جاؤ۔‘‘ صفیہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر دوبارہ قالین پر رکھے کشن پر بٹھا دیا۔ خود بھی وہ بیڈ سے ٹیک لگائے ایک کشن پر شال اوڑھے بیٹھی تھی۔ کمرہ ایر کنڈیشنڈ ہونے کے باعث سردی کے اثرات سے مبرا تھا۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ طاہر نے ایک نظر سر جھکائے بیٹھی لڑکی کی جانب اور پھر سوالیہ انداز میں صفیہ کو دیکھا۔

’’آپ نے کھانا کھا لیا؟‘‘ اس کا سوال گول کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’نہیں۔ فہمیدہ یہیں لا رہی ہے۔‘‘ وہ گرم واسکٹ اتارتے ہوئے بولا۔

صفیہ نے اس کی واسکٹ تھام ایک طرف ڈال دی۔ وہ بیڈ کی پٹی پر ٹک گیا۔ صفیہ نے ہاتھ بڑھائے کہ اس کے پاؤں سے زرتار کھسہ نکال دے۔

’’کیا کر رہی ہو؟‘‘ طاہر نے اس کا ہاتھ تھام لئے۔

''اوں ہوں۔'' صفیہ نے آنکھ کے اشارے سے اسے لڑکی کے کمرے میں ہونے کا احساس دلایا اور ہاتھ اس کے کھسے پر ڈال دیے۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ صفیہ اس کی کسی بات کا برا نہ مانتی تھی مگر کرتی وہی تھی جو اسے طاہر کے بارے میں اچھا لگتا تھا۔ کھسے کے بعد اس نے طاہر کی جرابیں اتاریں اور چپل آگے کر دی۔

''آپ منہ ہاتھ دھولیں۔ اتنی دیر میں کھانا لگ جائے گا۔''

''تم نے تو کھا لیا ہوتا۔ خواہ مخواہ آدھی رات تک بھوکی بیٹھی ہو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''پہلے کبھی کھایا ہے جو آج آپ سے پہلے کھا لیتی۔'' صفیہ نے مسکرا کر ہولے سے کہا۔ وہ خاموشی سے اٹیچ باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

''چھوٹی بی بی۔'' لڑکی نے اٹھنا چاہا۔ ''مجھے جانے دیجئے۔ چھوٹے مالک کے سامنے میں۔۔۔''

''خاموشی سے بیٹھی رہو۔'' صفیہ نے آنکھیں نکالیں۔

''بی بی۔ دس بجنے کو ہیں۔'' اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ''گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''انہیں میں نے فہمیدہ کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا تھا کہ تم میرے پاس ہو۔ دیر سے لوٹو گی۔''

اب شاید اس کے پاس کوئی بہانہ نہ رہا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ واپس کشن پر ٹک گئی مگر انداز ایسا تھا کہ بس صفیہ کی نظر چوکتے ہی بھاگ لے گی۔

جتنی دیر میں طاہر ہاتھ منہ دھو کر نکلا فہمیدہ نے کمرے کے ایک گوشے میں موجود ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔

''کھانا کھاؤ گی؟'' صفیہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی تو صفیہ بے اختیار مسکرا دی۔ اس نے اصرار نہ کیا اور طاہر کے ساتھ کھانے کی میز پر جا بیٹھی۔ صفیہ سمجھ گئی کہ طاہر سے حجاب اور شرم نے اس کا برا حال کر رکھا ہے۔

''کیا بات ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟'' طاہر نے نیپکن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''کھانا خاموشی سے کھانا چاہئے۔'' صفیہ نے اس کی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہا۔

طاہر نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ فہمیدہ برتن لے گئی۔ وہ طاہر کو ساتھ لئے واپس اس جگہ آ گئی جہاں وہ لڑکی ابھی تک سر جھکائے کسی سوچ میں گم بیٹھی اپنے ناخنوں سے قالین کرید رہی تھی۔ سر پر اس نے دوپٹہ اس طرح لے رکھا تھا کہ طاہر اس کے چہرے کے خدوخال بمشکل دیکھ پایا۔ وہ بیحد سادہ سے نقوش کی مالک تھی مگر چہرے سے شرافت نمایاں تھی۔

''ہاں۔ اب بولو۔'' طاہر نے ان دونوں سے کچھ پرے ایک کشن پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کو جو فون کیا تھا وہ اسی کے معاملے میں تھا۔'' صفیہ نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کا سر یہ سن کر کچھ اور جھک گیا۔ اضطراب کی حالت میں وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ ''یہ آپ کے گاؤں کے ایک عزت دار شخص ماسٹر محسن کی بیٹی زبیدہ ہے۔''

''زبیدہ۔'' ایک دم طاہر چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیا ہوا؟'' صفیہ اس کے انداز پر حیران سی ہوئی۔

''کچھ نہیں۔ تم کہو کیا کہہ رہی تھیں۔'' وہ زبیدہ کو غور سے دیکھ کر بولا۔

''میں بتا رہی تھی کہ۔۔۔'' صفیہ نے اس کی حالت پر غور کرتے ہوئے کہنا شروع کیا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے وہ ساری بات بتائی جو طاہر چوپال میں سن چکا تھا۔ اس دوران زبیدہ مسلسل اضطراب کے عالم میں ہونٹ کاٹتی رہی۔ انگلیاں مروڑتی رہی اور پہلو بدلتی رہی۔ اس کا سر ایک بار بھی نہ اٹھا۔ طاہر کبھی کبھار اس پر نظر ڈال لیتا اور بس۔ اس نے ساری توجہ صفیہ کی آواز پر مرکوز رکھی۔

''اب صورتحال یہ ہے کہ زبیدہ کو اس کے والد ماسٹر محسن مستقل طور پر اس کے ننھیال بھجوانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ شادی تک یہ وہیں رہے گی اور شادی اگر نثار سے نہیں ہو گی تو عادل سے بھی نہیں ہو گی۔ کس سے ہو گی؟ یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔''

صفیہ نے جیسے بات ختم کر دی۔

''ہوں۔'' طاہر نے ایک طویل ہنکارا بھرا۔ ایک بار زبیدہ کی جانب دیکھا جو شاید رو رہی تھی۔

''ارے۔'' صفیہ نے اس کی طرف توجہ کی اور اسے کھینچ کر ساتھ لگا لیا۔ ''پگلی۔ رو کیوں رہی ہے؟ طاہر ہیں ناں۔ سب ٹھیک کر لیں گے۔''

زبیدہ سسک پڑی۔ اس کے آنسو ہچکیوں میں ڈوب گئے۔ صفیہ اس کا شانہ تھپک رہی تھی مگر اس کی تسلی زبیدہ کو اور بے کل کر رہی تھی۔

''چھوٹی بی بی۔'' اس کی سرگوشی کراہ سی بن گئی۔ ''میرے ابو نے مجھے کبھی سخت نگاہ سے نہیں دیکھا مگر اس بات پر انہوں نے مجھے اس طرح مارا کہ۔۔۔'' وہ بات پوری نہ کر سکی اور دوپٹے میں منہ چھپا کر بلکنے لگی۔

''ماں باپ اگر سختی کریں تو اس پر دل برا نہیں کیا کرتے زبیدہ۔'' طاہر کی آواز میں سرزنش تھی۔ زبیدہ اس کی آواز پر ایک دم سُن سی ہو گئی۔ ''جس باپ نے آج سے پہلے تمہیں پھول نہیں مارا ذرا سوچو کہ اسے کتنی تکلیف ہوئی ہو

گی تمہاری کسی بات سے جو وہ تم پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔“

صفیہ نے طاہر کی بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ بس زبیدہ کو بازو کے حلقے میں لئے اس کا شانہ تھپکتی رہی جو بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ لگتا تھا اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ آنسو' سسکیاں' ہچکیاں سب تھم گئی تھیں۔

”میں بزرگوں کے لئے بھی گاؤں کا بڑا صرف اس لئے ہوں کہ اپنے والد کے بعد میں نے ان کی جگہ بیٹھ کر یہاں کے لوگوں کو کبھی چھوٹا نہیں سمجھا۔ میں ان کے دُکھ سُکھ کا ساجھی ہوں۔ میں وہاں چوپال میں ابھی تمہارا ہی قضیہ نمٹا کر آ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ صفیہ چونکی تو زبیدہ بھی سیدھی ہو بیٹھی۔ اس نے پلو سے آنکھیں خشک کیں اور دوپٹہ سر پر ٹھیک طرح سے لے لیا۔ طاہر نے دیکھا' رونے سے اس کا چہرہ نکھر سا آیا تھا۔ متورم آنکھوں نے اس کی سادگی کو سجا دیا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر پھڑکتے ہونٹوں سے آواز نہ نکل رہی تھی۔

”کیا ہوا وہاں؟ مجھے بھی تو بتایئے۔“ صفیہ پوری طرح طاہر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یوں اس نے زبیدہ کی مشکل آسان کر دی۔ اس کے کان طاہر کی آواز پر لگ گئے۔

”پہلے زبیدہ سے یہ پوچھو کیا واقعی یہ عادل کو پسند کرتی ہے؟“ طاہر نے دھیرے سے کہا۔

”نہیں۔ ان دونوں کی آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔“ صفیہ نے جواب دیا۔ ”زبیدہ مجھے سب بتا چکی ہے۔“

”تو پھر اس نے کیسے عادل کے لئے ماسٹر صاحب کے سامنے زبان کھول دی؟“ طاہر حیرت سے بولا۔

”یہ ایک اتفاق ہے طاہر جس سے زبیدہ نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ہوا یہ کہ جب نثار کے رشتے سے زبیدہ نے انکار کیا تو اسی وقفے میں اسے اپنی ایک سہیلی سے پتہ چلا کہ عادل کے ماں باپ اس کے لئے زبیدہ کا رشتہ مانگنے ان کے گھر آنے والے ہیں۔ زبیدہ نے نثار سے جان چھڑانے کے لئے ماسٹر صاحب سے کہہ دیا کہ وہ عادل کو پسند کرتی ہے۔ ماسٹر صاحب سہہ نہ سکے کہ ان کی بیٹی اس معاملے میں ایسی بات زبان پر لائے۔ انہوں نے زبیدہ کو پیٹ ڈالا۔ غضب یہ ہوا کہ اس سے دو ہی دن بعد عادل کے والدین زبیدہ کے رشتے کے لئے آن پہنچے۔ بس' یہ اتفاق ماسٹر صاحب کو یقین دلانے کے لئے کافی تھا کہ زبیدہ اور عادل ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک عزت دار باپ کے لئے یہ بات کسی گالی سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنا ذاتی علم ہونا تو بھول گئے۔ صرف یہ یاد رہا کہ بیٹی نے ان کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔ اور یہ بات ایسی ناقابل برداشت تھی کہ وہ زبیدہ پر ہاتھ اٹھا بیٹھے۔“

”بس بس۔ میں سمجھ گیا۔“ طاہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”اس ماتو بلی نے اپنی جان تو چھڑا لی مگر باپ کو جو اذیت دی اس کا کیا؟“

ماتو بلی کا خطاب پا کر جہاں زبیدہ شرمائی وہیں ماسٹر صاحب کی تکلیف کا خیال آنے پر آبدیدہ ہو گئی۔

’’میں۔۔۔ میں۔۔۔ ابو سے معافی مانگ لوں گی۔‘‘ اس کے ہونٹ پھڑکے اور بے اختیار وہ سسک پڑی۔

میں نثار سے شادی کروں گی۔ نہیں چاہئے مجھے ایسا سکھ جو ابو کو دُکھ دے کر ملے۔‘‘

’’یہ بات تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھی زبیدہ۔ اب تو ایسا نہیں ہو سکتا۔‘‘ طاہر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

’’کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا ابو مجھ سے اتنے ناراض ہیں کہ معاف بھی نہیں کریں گے۔‘‘ وہ بلک کر بولی۔

’’نہیں۔ اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔‘‘ طاہر لاپروائی سے بولا اور صفیہ نے صاف دیکھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ دبا رہا ہے۔ ایک پل میں ساری بات اس پر روشن ہو گئی۔ اسے لگا کہ طاہر کو روتی ہوئی زبیدہ پر لاڈ آ رہا ہے۔ وہ بلکتی ہوئی اسے اچھی لگ رہی ہے اور وہ اسے محض تنگ کر رہا ہے۔

’’طاہر۔‘‘ زبیدہ کو ایک بار پھر ساتھ لگاتے ہوئے صفیہ نے طاہر کی جانب نگاہ کی۔ ’’کیا بات ہے؟ سچ سچ بتائیے۔‘‘

’’کیا سچ سچ بتاؤں؟‘‘ طاہر بھولپن سے منہ بنا کر بولا۔ ’’کیا یہ بتاؤں کہ ماسٹر صاحب نے زبیدہ کی شادی۔۔۔‘‘ ایک پل کو وہ رکا۔ سر جھکائے آنسو بہاتی زبیدہ کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ’’عادل کے ساتھ طے کر دی ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ ایک جھٹکے سے زبیدہ نے سر اٹھایا اور بے یقینی سے طاہر کی جانب دیکھنے لگی۔

’’ہوں۔۔۔‘‘ صفیہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ’’تو میرا شک درست تھا۔‘‘ اس نے طاہر کو گھور کر دیکھا۔ ’’آپ خواہ مخواہ بچی کو اب تک رلا رہے تھے۔‘‘

’’چھوٹی بی بی۔‘‘ زبیدہ نے اس کی جانب بے اعتباری سے دیکھا۔ ’’کیا۔۔۔ کیا یہ سچ ہے؟‘‘

’’سولہ آنے سچ ہے زبیدہ۔‘‘ طاہر کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے یقین سے سرشار لہجے میں صفیہ نے کہا۔ ’’تمہارے چھوٹے مالک کو جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ ورنہ میں اتنی آسانی سے انہیں نہ پکڑ پاتی۔ میں تو ان کے بات کرنے کے انداز سے سمجھ گئی تھی کہ یہ تمہارے رونے کا مزہ لے رہے ہیں۔‘‘

اور زبیدہ نے صفیہ کی بغل میں چہرہ چھپا لیا۔ وہ ایک بار پھر رو دی مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔ تشکر کے تھے۔

’’کیا ہوا چوپال میں؟ مجھے سب کچھ تفصیل سے بتائیے۔‘‘ صفیہ نے زبیدہ کا شانہ تھپک کر اسے خود سے الگ کیا۔

جواب میں طاہر نے انہیں چوپال میں ہونے والی ساری بات سنا دی۔ وہ خاموش ہوا تو زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

’’چھوٹی بی بی۔ اب مجھے جانے دیجئے۔ بہت دیر ہو گئی۔‘‘ اس نے کلاک پر نظر دوڑائی جس پر رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔

’’ارے۔‘‘ صفیہ نے وقت دیکھا تو حیرت سے بولی۔ ’’پتہ ہی نہ چلا وقت گزرنے کا۔ واقعی اب تمہیں جانا چاہئے۔‘‘ وہ بھی اٹھ گئی۔ ’’فہمیدہ کو بلاؤ۔‘‘

’’بیل دے دو۔‘‘ طاہر نے بیڈ سوئچ کی طرف اشارہ کیا۔

صفیہ سر ہلا کر آگے بڑھی اور وہ بیڈ سوئچ دبا دیا‘ جس کے نیچے بیل کا نشان بنا تھا۔ دور کہیں گھنٹی کی آواز ابھری۔ چند لمحوں کے بعد فہمیدہ کمرے میں آ پہنچی۔

’’فہمیدہ۔ کسی ملازم سے کہو زبیدہ کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔‘‘ صفیہ نے کہا۔

’’اس کا بھائی کتنی دیر سے آیا بیٹھا ہے جی۔ اسے لے جانے کے لئے۔‘‘

’’ارے۔ تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟‘‘ صفیہ نے تیزی سے کہا۔ طاہر کو بھی یہ بات اچھی نہ لگی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

’’اس نے منع کر دیا تھا جی۔‘‘ فہمیدہ بولی۔ ’’اس کا کہنا تھا کہ جب چھوٹی بی بی اجازت دیں گی تب وہ زبیدہ کو لے جائے گا۔ اتنی دیر وہ مردانے میں انتظار کرے گا۔‘‘

’’پھر بھی۔‘‘ صفیہ کو پشیمانی سی ہو رہی تھی۔

’’محسوس نہ کرو۔‘‘ طاہر نے نام لئے بغیر صفیہ کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ’’یہ ان لوگوں کی محبت کی ایک جھلک ہے جو یہ ہم سے کرتے ہیں۔ اس کا مزہ لو۔ پشیمان ہو کر اس کی لذت کو گرہن نہ لگاؤ۔‘‘

صفیہ نے نظر اٹھا کر طاہر کی جانب دیکھا۔ اس کی نظر میں کچھ ایسا تھا کہ طاہر نے اس سے نظریں چرا لیں۔ مسکرا کر صفیہ نے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ پھر اسے سر کے اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔

زبیدہ نے آہستہ سے صفیہ کا دایاں ہاتھ تھاما اور سر جھکا کر پہلے چوما۔ پھر ماتھے سے لگا لیا۔ صفیہ نے اس کا سر تھپکا۔ وہ صفیہ کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی طاہر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سر جھکائے۔ پلو سر پر ڈالے۔

طاہر چند لمحے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔

’’جاؤ۔‘‘ آہستہ سے اس نے کہا۔ ’’بس یہ یاد رکھنا کہ ماں باپ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے ماسٹر صاحب کے بھروسے میں نقب نہیں لگائی۔ اچھی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔‘‘ طاہر کا ہاتھ اس کے سر پر آ گیا۔ ’’

خوش رہنا۔ اور اسے بھی خوش رکھنا جس نے تمہارے جھوٹ پر اپنی خاموشی کا پردہ ڈال کر اتنی ہی بدنامی سہی' جتنی تمہارے حصے میں آئی۔ نصیبوں والی ہو کہ ایسا بَر خدا نے تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ جاؤ۔''

طاہر نے تھپکی دے کر ہاتھ اس کے سر سے ہٹا لیا۔ زبیدہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا تھا۔ نمی اس کی آنکھوں سے ابلنے کو تھی مگر اس نے خود پر قابو پائے رکھا۔ پھر ایک دم جھکی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا اس نے طاہر کے دونوں پاؤں ہاتھوں کی انگلیوں سے چھوئے اور انگلیاں چومتی ہوئی سیدھی ہو گئی۔ طاہر محض ''ارے ارے'' کر کے رہ گیا' تب تک زبیدہ کمرے سے جا چکی تھی۔

''اوں ہوں۔۔۔'' صفیہ نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''یہ احترام اور محبت کا اظہار ہے طاہر۔ اس کا مزہ لیجئے۔'' مسکرا کر صفیہ نے کہا۔

طاہر کی آنکھوں میں اس کے لئے ایک رنگ سا لہرایا' جسے صفیہ کی نظروں نے اپنے دامن میں لپک لیا۔ اس نے انگلی طاہر کے ہونٹوں سے ہٹا کر چوم لی۔ آہستہ سے پلٹی اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سانس ایک دم بوجھل سا ہو گیا۔ نظر سے وہ رنگ دل میں اتر رہا تھا' جو اس نے طاہر کی آنکھوں میں اپنے نام کھلتا ہوا پایا تھا۔ یہ کیسا احساس تھا؟ کیسی لذت تھی؟ کیسی سرشاری تھی جس نے اس کی روح کو ہلکا اور جسم کو ایسا وزنی کر دیا تھا کہ اس سے قدم اٹھائے نہ اٹھ رہے تھے۔ بمشکل وہ دو قدم چلی اور یوں بستر پر گر پڑی جیسے پھولوں سے لدی ڈال اپنی ہی خوشبو کا بوجھ نہ سہار سکی ہو۔

☆

حافظ عبداللہ پوری طرح محو ہو کر منزل کر رہا تھا۔

قرآن پاک اس کے سامنے رحل پر کھلا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہولے ہولے جھومتا ہوا بڑی نرمی' آہستگی اور جذب کے ساتھ تلاوت کر رہا تھا۔ چودہ سطری قرآن پاک کا ایک ایک صفحہ سطر بہ سطر اپنے آغاز و اختتام کے الفاظ کے ساتھ اس کے ذہن پر نقش اور دل میں محفوظ تھا۔ جونہی صفحے کا آخری لفظ اس کی زبان سے ادا ہوتا' غیر ارادی طور پر اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آتا' ورق الٹ جاتا اور زبان اگلے صفحے کی عبارت کو چومنے لگتی۔

دوسرا پارہ اختتام کو پہنچا تو اس نے آنکھیں وا کیں۔ سر جھکا کر قرآن پاک کو بوسہ دیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر قرآن پاک بند کر کے اٹھ گیا۔ کھیس اتار کر وہیں رکھا۔ دروازے میں پڑی چپل پہنی۔ باہر نکلا۔ چار قدم چلا اور ساتھ والے کمرے پر آ رکا۔ آہستہ سے ہاتھ دروازے پر رکھ کر دبایا۔ دروازہ ہلکی سی چرر کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اس نے قدم اندر رکھا۔ چراغ کی لو تھرتھرائی۔ اس نے وہیں رک کر چارپائی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کمبل میں سمٹی پڑی تھی۔ اس کا چہرہ دروازے ہی کی جانب تھا اور وہ سو رہی تھی۔

وہ چند لمحوں تک اس کے صبیح چہرے کو تکتا رہا۔ سوچوں کی پرچھائیاں اس کی آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ بالآخر آہستہ سے پلٹ کر وہ باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوا اور اس کے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

آواز ختم ہوتے ہی ایک دم لڑکی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو چکا تھا۔ ایک طویل سانس سینے سے خارج کرتے ہوئے وہ چارپائی سے اتر آئی۔ اب اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے اسی وقت سانس روک لیا تھا جب حافظ عبداللہ نے دروازہ کھولا تھا۔ پلکوں کی درز سے وہ اسے اس وقت تک بے حس و حرکت پڑی دیکھتی رہی جب تک وہ واپس نہ لوٹ گیا۔ حافظ عبداللہ کا اس وقت کمرے میں آنا' اسے خاموش کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا' آگے بڑھتے قدم کو روک لینا اور پھر جیسے مجبوراً لوٹ جانا۔ پھر حافظ عبداللہ کا باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دینا۔ ان سب باتوں نے اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔

بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی وہ دروازے تک آئی۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔

کمبل میں لپٹی وہ کھڑکی کے پاس آئی اور اس کے پٹ سے کان لگا دیے۔ دوسری طرف سے کتنی ہی دیر تک جب کوئی آواز نہ سنائی دی تو اس کا حلق خشک ہو گیا۔ لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی ایسی شے موجود نہ تھی جسے وہ کسی بھی خطرے کے وقت اپنی حفاظت اور مدافعت کے لئے استعمال کر سکتی۔

اضطراب کے عالم میں اس نے لکڑی کی کھڑکی کی ایک درز سے آنکھ لگا دی۔ دوسرے کمرے کا منظر اس کی آنکھ میں اترا اور وہ سُن ہو کر رہ گئی۔ حافظ عبداللہ کمرے میں شمالاً جنوباً بیتابی سے اس طرح چٹائی پر ٹہل رہا تھا کہ اس کے قدموں کی آواز نہ ابھر رہی تھی۔ کھڑکی سے دو فٹ دور سے وہ واپس لوٹ جاتا۔ اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال تنا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ کسی گہری سوچ میں ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ اس نے آنکھ درز سے ہٹا لی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

”وہ کیا سوچ رہا ہے؟“ اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ فوراً ہی جواب اس کے ذہن میں اتر آیا۔ ظاہر ہے وہ بدنیتی سے اور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس کی نیت ٹھیک ہوتی تو وہ چوروں کی طرح اس کے کمرے میں نہ آتا۔ اس کا خاموشی سے واپس لوٹ جانا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا مگر اسے اس طرح بے چینی سے ٹہلتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی حالت سے دوچار ہے۔ شاید وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا جس پر عمل کر کے وہ اس پر قابو پا لے اور۔۔۔۔

اس سے آگے کی بات کا خیال آتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے پُرنم آنکھوں سے کمرے کی چھت کی جانب دیکھا۔ ”یا اللہ۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا اور ماتھا جڑے ہوئے ہاتھوں پر ٹکا کر وہ سسک پڑی۔ اس وقت وہ بھاگ کر جاتی بھی کیسے اور کہاں؟

حافظ عبداللہ بیتابی سے چٹائی پر ٹہل رہا تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں یہ دیکھنے گیا تھا کہ لڑکی کا حال کیا ہے؟ دوبارہ بخار نے تو اسے نہیں آ لیا؟ اسے پیاس نہ لگی ہو۔ لڑکی کا خیال رکھنا لازم تھا۔ وہ اسے اپنی ذمے داری لگنے لگی تھی مگر جس طرح وہ بے سدھ سو رہی تھی' اس کے پُرکشش چہرے کو دیکھ کر اس کے جذبات میں آگ سی لگ گئی۔ اکیلی لڑکی' رات کی تنہائی' کسی تیسرے کا وہاں نہ ہونا۔ ان سب نے مل کر اس کے دل و دماغ پر یلغار کر دی۔ جتنی دیر وہ وہاں کھڑا رہا' بڑے ضبط سے کھڑا رہا تھا۔ پھر خدا کے خوف سے دل کو تھپکتا ہوا وہ بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ دروازے کی کنڈی لگائی تو اس خیال سے کہ اس کے کھٹکے سے لڑکی جاگ جائے اور وہ اپنے شہوانی خیالات کو لڑکی کے جاگ جانے کی لگام دے سکے۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے منزل کرنے کی بڑی سعی کی مگر دل تو کسی اور ادھیڑبن میں لگ گیا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ حیوانی جبلت اسے شیطان کے ہاتھوں بک جانے پر اکسا رہی تھی مگر اس کے اندر چھپا بیٹھا حافظِ قرآن خود کو مسلسل کمزور پڑتا دیکھ کر باقاعدہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا۔ کشمکش تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ الاؤ تھا کہ اس کی تپش اسے جھلسائے دے رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک دم وہ رک گیا۔ قدم قدم چلتا ہوا ننگے پاؤں باہر نکلا۔ گھور اندھیرے میں اسے سوائے مزار، دور دور تک پھیلی خاموشی، اکیلے پن اور سناٹے کے کچھ بھی نہ ملا۔ وہ چند لمحے کھڑا سرد ہوا کو گھونٹ گھونٹ جذبات کے حلق سے نیچے اتارتا رہا۔ تپتا ہوا جسم باہر سے سرد ہونے لگا تو اسے اپنی کنپٹیوں میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ ایسی سنسناہٹ، جس میں بے چینی کے بگولے ریت اڑا رہے تھے۔ بیتابی کا غبار سانسوں کو بوجھل کر رہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تو اس نے تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی۔ درد بھری ایک ٹیس ابھری اور اس کے جبڑے اکڑ سے گئے۔ منہ کھول کر اس نے فضا میں رچی ٹھنڈک کو پی لینا چاہا۔ ایک دم اسے جھرجھری سی آ گئی۔ ایک نظر مزار پر ڈال کر وہ واپس جانے کے لئے پلٹا۔ اسی وقت پھر کسی نے اسے پکارا۔ اس نے آواز کی سمت کا اندازہ لگانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ سر جھٹک کر اس نے خود کو قائل کرنا چاہا کہ یہ اس کا وہم تھا۔ پھر وہ کمرے کی جانب چل دیا۔

”حافظ“ ایک دم اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر گردن اکڑ گئی تھی۔ آواز کس کی تھی، اسے صاف پتہ چل گیا۔ اس کی آنکھیں یوں مند گئیں جیسے کسی نے زبردستی انہیں بند کر دیا ہو۔ ان پر کس کر پٹی باندھ دی ہو۔

”حافظ“ درویش نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ”بُوٹی لینے باہر آیا ہے۔ نقل مارنا چاہتا ہے۔ فیل ہو جائے گا۔ یہ امتحان تجھے بغیر کسی کی معاونت کے دینا ہے۔ میں تجھے ایک موقع لے کر دینے میں بڑی مشکل سے کامیاب ہوا ہوں۔ دوبارہ اس کی امید نہ رکھنا۔ اندر جا اور پرچہ حل کر۔ جا۔ تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ ہمت سے گزار لے۔ جا۔“

اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ سارا بوجھ سارا وزن ختم ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اکیلا کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ درویش وہاں کہاں تھا؟ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا ہے۔ کوئی تپش اب اسے جھلسا رہی تھی نہ کوئی الاؤ اس کے اندر دہک رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے درویش کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا۔ پھر مزار کی جانب نگاہ کی۔ دل میں تشکر دھڑکا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ آہستگی سے کنڈی کھولی اور لوٹ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ اپنے پیچھے بھیڑ کر وہ سر جھکائے چٹائی پر آ بیٹھا۔ کھیس کی بُکل

ماری اور چراغ کی جانب دیکھا۔ اس کی ہلکی ہلکی زرد روشنی اسے بڑی بھلی لگی۔ چند لمحے وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے قرآن پاک کو بوسہ دے کر کھولا۔ تیسرے پارے کی پہلی سطر پر نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند لیں۔

''اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔'' اس کے لبوں سے نکلا اور آواز بھرا گئی۔

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔'' زبان پر خوشبو پھیلی اور آنسو رخساروں پر آ گئے۔

''تلک الرسل۔۔۔'' ایک ہچکی تھی جو اس کے حلق سے آزاد ہوئی اور وہ اپنے آپ سے جدا ہو گیا۔

آنسو وضو کراتے رہے۔ زبان، آیتوں کو بوسے دیتی رہی۔ حواس میں پاکیزگی اترتی چلی گئی اور وہ اس بات سے بے خبر ہلکورے لیتا اپنے معبود کی ثنا کرتا رہا کہ کوئی اسے کھڑکی کی درز سے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ اس کی کیفیت پر انگشت بدنداں ہے۔ اس کی کیفیت کو سمجھنے کی ناکام سعی کر رہا ہے اور روح کو سیراب کرتی ہوئی نمی۔۔۔ وہ تو اس جھانکنے والے کی آنکھوں میں بھی ہے۔

''لن تنالوا البر'' کے الفاظ اس کی زبان پر تھے کہ اسے لگا جیسے دونوں کمروں کی درمیانی کھڑکی پر ''ٹھک'' کی آواز ابھری ہو۔ ایک لمحے کو وہ رکا۔ پھر تلاوت کرتی اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ''ٹھک'' کی آواز پھر ابھری۔ اس نے کان بند کرنے کے لئے ان پر ہاتھ رکھ لئے۔ تیسری بار آواز ابھری تو اس نے آنکھوں کو اور زور سے بند کر لیا۔ آنکھوں پر زور پڑنے کی دیر تھی کہ چارپائی پر بے سدھ پڑا وہ جوان سراپا اس کے سامنے نمایاں ہو گیا جو تنہائی اور موقع سے مزین تھا۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ قرآن پاک کے الفاظ پر دھیان جماتے ہوئے اس نے صفحہ پلٹا تو لگا جیسے الفاظ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہوں۔ صفحہ اسے بالکل کورا دکھائی دیا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ نظروں میں دھند سی پھیلی اور زبان مروڑا کھا گئی۔ دماغ ایک دم سکرین بن گیا جس پر ایک جوان بدن پڑا اسے صدائیں دے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا مگر اس کے سامنے کھلے پڑے قرآن پاک کا سامنے کا صفحہ بالکل کورا، بالکل صاف تھا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا نہ تھا۔ اس نے حافظے پر زور دے کر یاد کرنا چاہا مگر کچھ یاد نہ آیا کہ وہ کیا اور کہاں سے تلاوت کر رہا تھا؟

خوف کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ کیا ہوا؟ مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا کہ میں قرآن پاک کہاں سے دہرا رہا تھا؟ یہ۔۔۔ یہ صفحات کورے کیوں ہو گئے؟ قرآن پاک کے الفاظ کہاں غائب ہو گئے؟ سنا اور پڑھا تھا کہ قیامت کے قریب قرآن پاک کے الفاظ خود بخود صفحات سے اڑ جائیں گے۔ غائب ہو جائیں گے۔ تو کیا قیامت آ گئی؟ کیا۔۔۔؟

اور اس ''کیا'' کے آگے سوچنا اس کے لئے محال تھا۔ سوچ پر تو وہ جوان جسم قابض تھا جو چار پائی پر پڑا اسے پکار رہا تھا۔

''میرے مالک۔'' اس کے پھڑکتے لبوں سے ایک سرگوشی آزاد ہوئی۔ ''میرے معبود۔ میری مدد فرما۔ اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے میں میری آزمائش نہ لے۔ میں تیری کسی آزمائش' کسی امتحان کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے معاف فرما دے۔ مجھے معاف فرما دے۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھا ان پر رکھ دیا۔ سرگوشی مدھم ہوتے ہوتے ناپید ہو گئی۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ اس نے سر اٹھایا۔ لڑکی کا سراپا ابھی تک اس کے ذہن میں رقصاں تھا۔ اس کی بھویں تن گئیں۔ دانت بھینچ کر اس نے ایک پل کو کچھ سوچا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔ آہستہ سے اس نے گردن کو حرکت دی اور دایاں ہاتھ چراغ کی لو پر سائبان کر دیا۔ لو بھڑکی اور اس کی ہتھیلی چاٹنے لگی۔ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اپنے ہاتھ پر جم گئیں جو چراغ کی لو پر ساکت ہو چکا تھا۔

گوشت جلنے کی چراند کمرے میں پھیلی۔ درد کی ایک لہر اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی مگر اس درد میں کیا لذت چھپی تھی کہ اسے نشہ سا ہونے لگا۔ اسے لگا جیسے ایک دم آنکھوں کے سامنے سے ساری دھند چھٹ گئی ہو۔ نظر جھکائی تو کورے کاغذ کا دامن گلاب رنگوں سے پُر دکھائی دیا۔ قرآن پاک کے الفاظ اس کی جانب سر اٹھائے مسکرا رہے تھے۔ قیامت ٹل گئی تھی۔ اسے توبہ کا وقت مل گیا تھا۔ زبان کی اینٹھن روانی میں بدل گئی۔ حافظ اسی مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں پر وہ آیت سے جدا ہوا تھا۔

ہاتھ لو پر جلتا رہا۔ مگر اس جلن میں درد نہ تھا' ایک سرور تھا جو اسے لوریاں دے رہا تھا۔ زخم نہ تھا' گلاب تھا جو کھلتا ہی جا رہا تھا۔ منزل ہو رہی تھی یا منزل اس کی جانب خود چل پڑی تھی؟ کون جانے۔ جانے تو بس وہ جانے جو اوپر بیٹھا اپنے آدم کی آزمائش لے رہا تھا۔ فرشتوں کو دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''کیا میں نے کہا نہ تھا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ وہ دیکھو۔ میرا آدم میری طرف چل کر آ رہا ہے اور مجھے دوڑ کر اس کی طرف جانا ہے۔ اسے گرنے سے پہلے تھام لینا ہے۔ جاؤ۔ اس کے ہاتھ کا' اس کے جسم کا سارا درد سمیٹ کر اس میں وہ مستی بھر دو جس میں صرف میرا ذکر' میرا شکر اور میرا امر لو دے رہا ہو۔''

کھڑکی کے دوسری جانب دم بخود کھڑی لڑکی کے حواس مختل ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر سما ہی نہ رہا تھا۔ حافظ عبداللہ کا ہاتھ جل رہا تھا۔ گوشت پگھل کر قطرہ قطرہ گر رہا تھا مگر اسے جیسے اپنا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ جھوم جھوم کر تلاوت کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ اور اب جسم بھی پسینے میں یوں بھیگا جا رہا تھا جیسے کسی نے اس پر جگ بھر

پانی انڈیل دیا ہو مگر وہ ہر احساس سے بے نیاز منزل کر رہا تھا۔ منزل اس کی جانب بھاگی چلی آ رہی تھی۔

اسی وقت باہر سے ”اللہ اکبر“ کی صدا ابھری۔

درویش لوٹ آیا تھا۔ وہ فجر کی اذان دے رہا تھا۔

امتحان کا وقت ختم ہو گیا تھا اور شاید امتحان بھی۔

یہ صدا اعلان تھی اس بات کا کہ حافظ عبداللہ کامیاب ہو گیا۔

لڑکی کے کانوں میں اللہ اکبر کی صدا پڑی تو وہ چونکی۔ گھبرا کر درز سے پیچھے ہٹی اور دروازے کی طرف لپکی۔ ایک پُرشور آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی۔ کمبل اس کے شانے پر لٹکا ہوا ساتھ ساتھ گھسٹتا آ رہا تھا۔ تقریباً بھاگتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ دیوانہ وار آگے بڑھی اور نیم بیہوش مگر تلاوت میں محو حافظ عبداللہ کے پاس جا رکی۔

”حافظ صاحب۔“ ایک چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور اس نے اس کا جلتا ہوا ہاتھ کھینچ کر چراغ کی لو سے پرے ہٹا دیا۔

ایک دم حافظ عبداللہ نے آنکھیں کھول دیں اور جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر لڑکی ایک پل کو دہشت زدہ ہوئی پھر اس کی طرف سے نگاہ ہٹا کر اس نے کمبل کے پلو میں حافظ عبداللہ کا چرمر ہاتھ لپیٹ لیا۔

”یہ آپ نے کیا کیا؟“ اس کی آواز میں درد ہی درد تھا۔

”کیا کیا؟“ حافظ عبداللہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ حواس میں آتے ہی درد اس پر پوری شدت سے حملہ آور ہو گیا۔

”حی علی الفلاح۔“

اچانک وہ باہر سے آتی ہوئی درویش کی آواز پر چونکا۔ ”بابا۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”بابا لوٹ آئے۔“

”کون بابا؟“ لڑکی کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔ وہ کمبل میں لپٹا اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی آنسو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

مگر حافظ عبداللہ اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے ہی غش کھا گیا۔ اب درد کی اذیت اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔

”حافظ صاحب۔۔۔ حافظ صاحب۔“ لڑکی اسے باہوں میں سنبھالتی ہوئی بے اختیار پکارے جا رہی تھی۔

”بس۔“ اچانک ایک آواز سن کر وہ چونکی۔ ایک جھٹکے سے گردن گھما کر اس نے اندر آتے ہوئے درویش کو دیکھا جو تین چار لمبے لمبے ڈگ بھر کر اس کے پاس پہنچا اور حافظ عبداللہ کا سر گود میں لے کر بیٹھ گیا۔

”آرام کرنے دے اسے۔“ وہ والہانہ حافظ عبداللہ کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ”سونے دے اسے۔ ساری رات امتحان دیتا رہا ہے پگلا۔ تھک گیا ہے۔ سونے دے اسے۔“

”بابا۔“ لڑکی نے اس سے پوچھنے کی کوشش ہی نہ کی کہ وہ کون ہے۔ وہ اسے اجنبی لگا ہی نہ تھا۔ بالکل ایسا لگا جیسے وہ برسوں سے اسے جانتی ہو۔ ”بابا۔ ان کا ہاتھ۔۔۔“

”کیا ہوا اس کے ہاتھ کو؟“ درویش نے اس کا ہاتھ کمبل کے پلو سے باہر نکالا۔ پھر جلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

”بابا۔ انہوں نے دیے کی لو پر اپنا ہاتھ رکھ چھوڑا تھا۔ ہاتھ جلتا رہا مگر انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ تو میں نہ آ کر ہٹاتی تو نجانے کیا ہو جاتا۔“ وہ مزید سہہ نہ سکی اور سسک کر رو پڑی۔

”پگلی ہے تو بھی۔“ درویش نے اس کے سر پر تھپکی دی۔ ”کچھ نہیں ہو گا اسے۔ میرا اللہ چاہے تو ابھی اس کا ہاتھ یوں ہو جائے جیسے اس پر کبھی کوئی خراش تک نہیں آئی مگر۔۔۔“

”مگر کیا بابا؟“ لڑکی نے بیتابی سے پوچھا۔

”مگر میرا اللہ چاہتا ہے کہ حافظ عبداللہ کا ہاتھ دوا سے ٹھیک ہو۔ اس کا نقص باقی رہے۔ یہ عیب والا ہو جائے۔“

”وہ کیوں بابا؟“ وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھی اور درویش اس کے ہر سوال کا جواب یوں دے رہا تھا جیسے کوئی باپ اپنی بیٹی سے لاڈ کر رہا ہو۔

”اس لئے پگلی کہ اپنے اللہ سے محبت کا یہ نشان اس کے ہاتھ پر باقی رہے۔ اسے اور تجھے یاد رہے کہ یہ ہاتھ کیوں اور کیسے جلا تھا؟“

”میں سمجھی نہیں بابا؟“ ایک دم لڑکی کا ذہن جیسے سلیٹ کی طرح صاف ہو گیا۔

”کیا تو نہیں جانتی کہ حافظ نے اپنا ہاتھ جلتے چراغ کی لو پر کیوں رکھ دیا تھا؟“ اچانک درویش کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ”شیطان آ گیا تھا اس کے پاس۔ شیطان جو آگ سے بنا ہے۔ نفس کی آگ کو حافظ عبداللہ نے اپنے اللہ کے حکم پر نور کے الاؤ میں دھکیل دیا۔ نفس جل گیا۔ شیطان خاک ہو گیا۔ نور باقی رہا۔ اب اس نور کا نشان تاعمر میرے حافظ کے ہاتھ پر باقی رہے۔ اس کے اللہ کی نشانی اس کے پاس رہے۔ یہی اس کے معبود کی رضا ہے۔ سمجھیں پگلی۔“ درویش

نے اس کی جانب پیار سے دیکھا۔

''ہاں بابا۔'' لڑکی کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی۔ ''سب سمجھ گئی۔'' اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ رات بھر کی ساری کیفیات ایک پل میں اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ اس کی ساری بدگمانیاں شرمندگی کا پسینہ بن کر اس کی پیشانی سے بہہ نکلیں۔ وہ حافظ عبداللہ کی حرکات سے کیا اخذ کرتی رہی اور حقیقت کیا تھی؟ یہ جان کر اسے خود پر شرم آ گئی۔

''کمبل سے اپنا جسم ڈھانک لے بچی۔ سردی لگ جائے گی۔'' درویش نے حافظ عبداللہ کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ چونکی۔ کمبل کو جسم پر ٹھیک سے لپیٹا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی دوسرے کمرے میں آ گئی۔

درویش نے حافظ عبداللہ کو چارپائی پر لٹایا۔ جلتا ہوا چراغ اٹھا کر لایا اور چارپائی کے پاس نیچے کچے فرش پر رکھ دیا۔

''میں نماز پڑھ لوں۔ تم اتنی دیر اس کے زخم پر چراغ کا تیل چپڑتی رہو۔ باقی کا علاج صبح گاؤں جا کر ہو جائے گا۔''

درویش کمرے سے نکل گیا۔

لڑکی نے ایک پل کو کچھ سوچا۔ پھر چارپائی کی پٹی سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ حافظ عبداللہ کا جلا ہوا ہاتھ تھام کر اس نے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے چراغ سے تیل لیا اور زخم پر چپڑنے لگی۔ وقفے وقفے سے وہ اس کے چہرے پر بھی نظر ڈال لیتی، جہاں سکون کا ایک عالم آباد تھا۔ ایسا ملکوتی سکون اسے پہلے کہاں دیکھنا نصیب ہوا تھا؟

☆

''میرا نام سکینہ ہے جی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''میں سائیاں والا کے میاں اشرف کی بیٹی اور میاں نذرو کی بھتیجی ہوں۔''

''ارے۔'' چوہدری حسن دین چونکا۔ ''پھر تو تُو میری بیٹی اور بھتیجی ہوئی۔ میاں نذرو تو میرے بڑا یار ہے۔''

''چلئے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ آپ کے جاننے والوں کی کچھ لگتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب آپ انہیں ان کے گھر بھجوانے کا انتظام کر دیں چوہدری صاحب۔'' حافظ عبداللہ نے مفلر کے ساتھ گلے میں لٹکے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا جس پر کچھ دیر پہلے گاؤں کے اکلوتے ڈاکٹر جمع حکیم مرزا امیر حسین نے ڈریسنگ کی تھی۔

پو پھٹتے ہی درویش نے ان دونوں کو گاؤں کے راستے پر خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ سورج نکل رہا تھا جب وہ دونوں

چوہدری حسن دین کی حویلی جا پہنچے۔ اندر خبر کی گئی تو فوراً ان دونوں کو بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ رفاقت اور چوہدری حسن دین آئے تو حافظ عبداللہ نے مختصر لفظوں میں انہیں ساری بات بتائی۔ مسجد سے غیر حاضری کی وجہ بھی سامنے آ گئی۔ اب آخر میں جب سکینہ نے اپنا نام اور پتہ بتایا تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔

”سکینہ بیٹی۔ تم اندر جاؤ۔ نہا دھو کر کپڑے بدلو۔ میں اتنی دیر میں تمہارے چچا کو خبر کرتا ہوں۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم کب سیلاب کے پانی میں گریں؟“

”کل صبح چوہدری صاحب۔“ سکینہ نے جواب دیا اور جھرجھری لے کر رہ گئی۔ ”میں اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ پُل پر کھڑی سیلاب کے پانی کا تماشہ دیکھ رہی تھی کہ پاؤں پھسل گیا۔ وہ دونوں شور مچاتی کسی کو مدد کے لئے بلانے بھاگیں۔ میں ڈوبتے ڈوبتے ایک درخت کے تنے سے جا چمٹی جو نجانے کہاں سے بہتا چلا آ رہا تھا۔ پانی نے میرے حواس چھین لئے اور میں بے سدھ ہو گئی۔ ہوش آیا تو بابا شاہ مقیم کے مزار پر تھی۔“

”بس بیٹی۔ یہ اللہ والوں کی کرامتیں ہیں۔ ایک تو تیری جان بچ گئی اوپر سے حافظ عبداللہ جیسے نیک بندے کے ہاتھ لگ گئیں۔ اگر کہیں غلط ہاتھوں میں پڑ جاتیں تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“ چوہدری حسن دین نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔“

”جی۔“ سکینہ نے کرسی پر سر جھکائے بیٹھے حافظ عبداللہ کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”نادرہ کو بلاؤ۔“ چوہدری حسن دین نے رفاقت سے کہا۔

”جی ابا جان۔“ رفاقت اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھ چودہ پندرہ سالہ صحتمند اور ہنستی کھیلتی نادرہ کو لئے واپس آیا۔

”سلام حافظ صاحب۔“ اس نے اندر داخل ہو کر حافظ عبداللہ کو سلام کیا۔ حافظ عبداللہ نے جواب دیتے ہوئے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”نادرہ پتر۔ سکینہ بہن کو اندر لے جا۔ اسے نہلا دھلا کر اس کے کپڑے بدلوا۔ ناشتہ وغیرہ کرا اور آرام کرنے کے لئے بستر میں گھسا دے۔ یہ بہت تھکی ہوئی ہے۔“

”جی ابا۔“ نادرہ نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں مٹکائیں۔ ”مگر یہ ہیں کون؟“

”میرے ایک مرحوم دوست کی بیٹی ہے۔ یہ کل سیلاب کے پانی میں بہہ گئی تھی۔ تیرے استاد صاحب نے اسے بچا لیا۔“

”بچانے والی تو اللہ کی ذات ہے چوہدری صاحب۔“ حافظ عبداللہ نے جلدی سے کہا۔

”ہاں جی۔ مگر کوئی حیلہ وسیلہ بھی تو ہوتا ہے ناں۔“ چوہدری حسن دین نے زور دے کر کہا۔ ”اب وہ خود تو نیچے اتر کر اسے پانی سے نکالنے سے رہا۔ آپ کو بھیج دیا کہ جا بھئی۔ اپنا فرض ادا کر۔“

حافظ عبداللہ مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ نادرہ سکینہ کو اندر لے گئی۔

”رفاقت۔ یار سائیاں والا تک کا راستہ تو سارا سیلاب کے پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہاں فون کی سہولت بھی موجود نہیں۔ اب نذرو کو خبر کیسے کی جائے؟“

”ابا جان۔“ رفاقت نے کمرے میں داخل ہوتے ملازم کے ہاتھ سے ناشتے کی ٹرے تھام کر حافظ عبداللہ کے آگے تپائی پر رکھی اور چوہدری حسن دین سے مخاطب ہوا۔ ”وجاہت آباد کے راستے سائیاں والا پہنچا جا سکتا ہے۔“

”یار۔ بڑا لمبا ہو جائے گا راستہ۔“ چوہدری حسن دین نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

”اب کام تو یہ کرنا ہے ابا جان۔ راستہ لمبا ہو یا چھوٹا۔ جانا تو پڑے گا۔“ رفاقت کہہ کر حافظ عبداللہ سے مخاطب ہوا۔ ”حافظ صاحب۔ آپ ناشتہ شروع کیجئے۔ سوچ کیا رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں یار۔ سوچنا کیا ہے؟“ حافظ عبداللہ نے بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ پھر واپس کھینچ لیا۔ ”یہ بائیں ہاتھ سے کھانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“

”اب یہ تو مجبوری ہے حافظ صاحب۔“ چوہدری حسن دین نے ہمدردی سے اس کی جانب دیکھا۔ ”ہاں۔ اگر آپ کی شادی ہو گئی ہوتی تو اور بات تھی۔ پھر آپ کی بیگم لقمے بنا بنا کر آپ کو کھلاتیں اور آپ دعا کرتے کہ آپ کا ہاتھ ذرا دیر سے ٹھیک ہو۔“ مزاح کی عادت سے مجبور چوہدری حسن دین رہ نہ سکا اور گوہر افشانی کرنے لگا۔ بات ختم کر کے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ حافظ عبداللہ جھینپ کر رہ گیا۔ رفاقت نے استاد کو شرمندہ ہوتے دیکھا تو مسکرا کر منہ پھیرا اور ذرا پرے جا بیٹھا۔ ”مگر آپ نے کیسی لاپروائی دکھائی کہ سوتے میں ہاتھ جلتے چراغ پر دے مارا۔ اگر کہیں چراغ کپڑوں پر آ گرتا تو۔۔۔“

”بس چوہدری صاحب۔ سوتے میں کیا پتہ چلتا ہے۔“ حافظ عبداللہ نے کہا اور بائیں ہاتھ سے بہ امر مجبوری پراٹھا توڑنے لگا۔ اس نے ہاتھ جلنے کے بارے میں یہی بتایا تھا کہ سوتے میں پتہ نہ چلا اور ہاتھ جلتے چراغ پر جا پڑا۔ پھر جب تک وہ سنبھلتا آگ نے ہاتھ جلا ڈالا۔ مرزا امیر حسین نے زخم دیکھ کر کہنا چاہا تھا کہ لگتا ہے بہت دیر تک ہاتھ آگ پر پڑا رہا ہے۔ تاہم حافظ عبداللہ نے بات کو ہوں ہاں میں ٹال دیا۔

ناشتہ کر کے حافظ عبداللہ نے اجازت لی اور مسجد کو چل دیا۔ کچھ دیر بعد چوہدری حسن دین نے اپنے ایک ملازم شفیق مصلی کو میاں نذرو کی طرف روانہ کرتے ہوئے کہا۔

’’وجاہت آباد کے ملک بلال کو تم خوب جانتے ہو۔ میں دیر سے اس کا فون ٹرائی کر رہا ہوں مگر رابطہ نہیں ہو رہا۔ شاید بارش کی وجہ سے لائنیں ڈسٹرب ہو گئی ہیں۔ تم اس سے جا کر ملنا۔ اگر آگے راستہ صاف نہ ہوا تو وہ تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔ اور اگر صاف ہوا تو وہاں زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے‘ میاں نذرو سے جا کر ملو اور اسے بتاؤ کہ اس کی بھتیجی یہاں ہمارے پاس ہے اور بالکل خیر خیریت سے ہے۔ جب چاہیں آ کر لے جائیں۔ وہاں فون کی لائن ابھی تک پہنچی نہیں‘ ورنہ میں جناب کو تکلیف نہ دیتا۔ راستہ رکا ہوا نہ ہوتا تو میں خود ہی سکینہ بیٹی کو چھوڑ آتا۔ سمجھ گیا یا سب کچھ لکھ کر دوں ڈِن وٹے؟‘‘ چوہدری حسن دین نے اس کے چہرے پر بکھری حماقت سے بیزار ہو کر کہا۔

’’سمجھ گیا ہوں جی۔‘‘ شفیق مصلی بولا تو ساری حماقت اس کے چہرے سے چھٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ جب تک چپ رہتا احمق لگتا تھا مگر زبان کھلتے ہی وہ سمجھدار لگنے لگتا تھا۔ ’’آپ فکر نہ کریں۔ جیسا آپ نے کہا ہے‘ ویسا ہی ہو گا۔‘‘

’’تو بس۔ اب چل دے میرے ٹٹو۔ تجھے سائیکل پر جانا ہے اور راستہ کافی طویل ہے۔‘‘ چوہدری حسن دین کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’ویسے تو وجاہت آباد کب تک پہنچے گا‘ اس وقت بارہ بجے ہیں دن کے۔‘‘

’’ڈیڑھ دو گھنٹے کا راستہ تو ہے جی۔ بس زیادہ سے زیادہ دو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو مجھے فون پر آگاہ کرنا۔ بس اب روانہ ہو جا اللہ کا نام لے کر۔‘‘

’’جی چوہدری صاحب۔‘‘ شفیق مصلی نے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

☆

دوپہر کے کھانے کے بعد طاہر حویلی سے کچھ دور ڈیرے میں بیٹھا بلال ملک اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ موضوع بحث عادل اور زبیدہ تھے جن کی شادی کا معاملہ ایسے احسن انداز میں طے ہوا تھا کہ سب لوگوں پر طاہر کی معاملہ فہمی اور فراخ ذہنی کی دھاک بیٹھ گئی۔

’’ملک صاحب۔ نور پور سے چوہدری حسن دین کا آدمی آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔‘‘ دروازے سے اندر داخل ہوتے ایک ملازم نے کہا۔

’’اوہو۔‘‘ ملک سیدھا ہو بیٹھا۔ ’’خیر تو ہے۔‘‘

’’پتہ نہیں جی۔ بس آپ سے ملنے کو کہتا ہے۔‘‘

’’تو بھیجو اسے اندر۔ سوچ کیا رہے ہو؟‘‘ ملک نے ڈپٹ کر کہا۔

’’جی ملک صاحب۔‘‘ ملازم لوٹ گیا۔

کچھ دیر بعد شفیق مصلی نے اندر داخل ہو کر بلند آواز میں سب کو سلام کیا۔ جواب میں سب نے وعلیکم السلام کہا۔ طاہر خاموشی سے صوفے پر نیم دراز سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔

''آؤ بھئی شفیقے۔ خیریت تو ہے؟'' ملک نے اسے پہچان لیا۔ ملک نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی ملک صاحب۔ سب خیر ہے اور چوہدری صاحب بھی خیریت سے ہیں۔ ایک ضروری کام سے آیا ہوں جی۔'' وہ ایک موڑھے پر ٹک گیا۔

''ہاں ہاں۔ کہو۔ کیا بات ہے؟''

جواب میں شفیق مصلی نے اسے چوہدری حسن دین کے پیغام سے آگاہ کیا۔ طاہر اس کی بات سنتا رہا اور غور کرتا رہا۔

''راستہ تو آگے کا صاف ہی ہے شفیقے۔ پھر بھی کسی قسم کی مدد درکار ہو تو بتاؤ۔''

''نہیں جی۔ آپ کو چوہدری صاحب کا سلام دینا تھا بس۔ اگر راستہ صاف ہے تو پھر مجھے چلنا چاہئے۔''

''اونہ بھئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تو ہمارے بابا جی کے گاؤں سے آیا ہے۔'' عقیدت سے ملک نے سر خم کر کے کہا۔ ''لسی پانی کے بغیر کیسے جائے گا تو۔ اوئے کرامت۔'' ملک نے دور بیٹھے ایک آدمی کو پکارا۔

''جی ملک صیب۔'' وہ اٹھ کر قریب چلا آیا۔

''شفیقے کو ساتھ لے جا۔ اس کی خوب ٹہل سیوا کر کے جانے دینا اسے۔ کوئی کسر رہ گئی تو بابا شاہ مقیم کو جانتا ہے ناں؟'' ملک نے اسے خوف دلایا۔

''فکر نہ کریں۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی ملک صیب۔'' کرامت نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا اور شفیق سب کو سانجھا سلام کر کے اس کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

''ملک۔ بابا شاہ مقیم کے مزار پر اپنا کوئی بندہ ہی جڑ دینا تھا۔ وہاں کی دیکھ بھال سے ہمارا بھی اندر دھلتا رہتا۔'' طاہر نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی چھوٹے مالک۔ ایک اللہ والے نے وہاں کا چارج سنبھال لیا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' طاہر نے حیرت سے پوچھا۔

''کافی عرصہ ہو گیا جی۔ بس وہاں کا ذکر نہیں آیا تو آپ کو خبر نہ ہوئی۔''

''اچھا۔ کیسا اللہ والا ہے وہ جس نے بابا کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ تو کسی کو اپنے مزار پر ٹکنے ہی نہیں دیتے۔''

''بس جی۔ یہ کوئی ان کا لاڈلا لگتا ہے جو دھونی رمائے بیٹھا ہے وہاں۔''

''اچھا۔ پھر تو ملنا چاہئے اسے۔'' طاہر کے لہجے میں دلچسپی عود کر آئی۔

''جب حکم کریں' چلے چلیں گے جی۔''

''کل صبح چلیں؟'' طاہر نے فراغت کے وقت کا بہترین استعمال سوچ لیا۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ جب سے آیا ہے اسے بابا شاہ مقیم کے مزار پر جانے کا خیال کیوں نہ آیا۔ پچھلے تین چار سال سے مصروفیت کے باعث وہاں نہ جانے کی کوتاہی تو ہو رہی تھی اس سے مگر اس بار تو وہ بالکل فارغ تھا۔ اسے آتے ہی وہاں جانا چاہئے تھا۔

''ٹھیک ہے جی۔ میں انتظام کرا لیتا ہوں۔'' ملک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صبح سات آٹھ بجے نکل چلیں گے۔ سہ پہر تک لوٹ آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم تیاری کر لو۔ اور ہاں۔ سالانہ عرس پر تو ہمارا حصہ جا رہا ہے ناں وہاں؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے چھوٹے مالک۔'' ملک مسکرایا۔ ''بڑے صاحب کے زمانے سے جو معمول بندھا تھا برابر جاری ہے۔ بیگم صاحبہ نے کبھی اس میں کوتاہی آنے دی ہے نہ کی۔''

''ایسا ہی ہونا چاہئے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''بہت بڑی ہستی ہیں بابا شاہ مقیم۔''

''ہاں جی۔ اس میں کیا شک ہے؟'' ملک نے تائید کی۔

پھر بابا شاہ مقیم کی باتیں چھڑیں تو وقت گزرنے کا احساس اس وقت ہوا جب حویلی سے سہ پہر کی چائے کا پیغام آ گیا۔

طاہر حویلی چلا گیا اور ملک چند ملازموں کے ساتھ اپنے آفس نما کمرے میں' جو ڈیرے کی حدود میں ہی واقع تھا۔ اسے صبح کے سفر کی تیاری کرنا تھی۔

* * *

میاں نذرو اپنے بیٹے سلیم اور سکینہ کی ماں تاج بی بی کے ساتھ اگلے دن چوہدری حسن دین کے ہاں پہنچ گیا۔ شفیق مصلی انہیں حویلی چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ وہ لوگ اپنے شاہی تانگے پر آئے تھے۔ شفیق مصلی سائیکل پر ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا۔

تاج بی بی کی بے چینی کے پیش نظر وہ تو رات ہی کو پہنچ جاتے مگر شفیق مصلی نے انہیں خوب تسلی دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ صبح نور کے تڑکے نکلنا چاہئے۔ رات کا سفر خراب راستے کے باعث مناسب نہیں ہے۔ رات جیسے تیسے گزار کر وہ فجر کی نماز کے فورا بعد ناشتہ کر کے چل پڑے اور آٹھ بجے کے قریب یہاں آن پہنچے۔

ان کے ملنے کا منظر بڑا دلگداز تھا۔ سکینہ ماں اور چچا کے گلے لگ کر بچوں کی طرح روئی۔ تاج بی بی اسے پیار کرتے نہ تھکتی تھی۔ سلیم نے بھی سر پر پیار دیا اور اسے سینے سے لگا کر آبدیدہ ہو گیا۔

’’مر جانئے۔ اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو تیرا یہ بھائی کس کی ماں کو ماسی کہتا۔‘‘ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور روتے ہوئے چہروں پر مسکراہٹیں کھیل گئیں۔

’’واہ بھئی واہ۔‘‘ چوہدری حسن دین نے سلیم کی جانب دیکھ کر قلقاری ماری۔ ’’تم تو اپنی برادری کے لگتے ہو۔ روتے بھی ہو تو سُر میں۔‘‘

’’بس چاچا۔ یہ رونق ہے ہمارے گھر کی۔‘‘ اس نے سکینہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ’’اسے کیا پتہ‘ ہم نے کل رات تک کا وقت کیسے گزارا ہے؟ اس کی تلاش میں دریا کی تہہ کہاں کہاں تک نہیں کھنگالی ہم نے۔ وہ تو آپ کا بندہ پہنچا تو جان میں جان آئی۔‘‘

’’شکر کرو بھائی رب سوہنے کا کہ اللہ نے حافظ عبداللہ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر وہاں بھیج رکھا تھا۔ ورنہ یہ پتہ نہیں کہاں جا کر رکتی۔ درخت تو اس نے کرائے پر لے ہی لیا تھا۔‘‘

’’چاچا۔‘‘ سب کے قہقہے پر سکینہ نے شرما کر چوہدری حسن دین کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔

’’ارے بیٹی۔ انہیں ہنس لینے دے۔ پتہ نہیں تیرے لئے کتنا روئے ہیں؟‘‘ چوہدری حسن دین نے نرمی سے

اسے سمجھایا تو وہ ایک بار پھر ماں سے لپٹ گئی۔

’’اور سنا بھئی چوہدری۔ کیسی گزر رہی ہے؟‘‘ میاں نذرو اس کی طرف سیدھا ہوا۔

’’بتاتا ہوں۔ پہلے تم لوگ کچھ اَن پانی چھک لو۔‘‘ چوہدری حسن دین نے رفاقت اور نادرہ کے ساتھ ملازم کو کھانے پینے کی اشیا لے کر اندر آتے دیکھ کر کہا۔

’’بھابی کہاں ہے؟‘‘ میاں نذرو نے ذرا دیر بعد پوچھا۔

’’میکے گئی ہے۔‘‘ چوہدری حسن دین نے منہ بنا کر کہا۔ ’’بوڑھی ہو گئی پر اس کا میکے کا چسکا نہ گیا۔ ایک دو دن کا کہہ کر جاتی ہے اور سات دن بعد لوٹتی ہے۔‘‘

’’ناراض نہ ہوا کر یار۔‘‘ میاں نذرو نے مٹھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ’’اب تک تو تجھے اس کا عادی ہو جانا چاہئے تھا۔‘‘

’’عادی تو ہو گیا ہوں یار مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ بڑے اہم موقع پر وہ گھر میں موجود نہیں ہوتی۔ اب یہی دیکھ لو کہ تم لوگ آئے ہو اور وہ۔۔۔‘‘

’’اچھا چھوڑ۔ یہ بتا رفاقت کی شادی کب کر رہا ہے؟ اب تو یہ ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔‘‘ میاں نذرو نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

’’میں اس کے لئے ایسی لڑکی ڈھونڈ رہا ہوں جس کے میکے والے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے مہمان ہو چکے ہوں۔ تاکہ یہ میری طرح بیوی کی راہ نہ تکتا رہے۔‘‘ اس نے بیزاری سے کہا۔

’’خیر کی بات نکال منہ سے۔‘‘ میاں نذرو نے اسے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ’’ہنستے بستے گھروں میں جانا آنا لگا ہی رہتا ہے۔ تو تو بالکل ہی۔۔۔‘‘

’’اچھا اچھا۔‘‘ چوہدری حسن دین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’اب بس۔ تم لوگ آئے کس کام سے ہو اور لگ کس کام میں گئے ہو۔ چلو۔ کھانا پینا ہو جائے تو ذرا تم لوگوں کو گاؤں کی سیر کراؤں۔‘‘

’’گاؤں کی سیر؟‘‘ میاں نذرو حیرت سے بولا اور چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ دیا۔ ’’بھائی۔ ہم کیا کراچی سے آئے ہیں جو ہمیں گاؤں کی سیر کرائے گا؟ جیسا ہمارا گاؤں ہے ویسا ہی یہ گاؤں ہے۔ پھر کون سی خاص چیز ہے یہاں جسے دیکھنے کے لئے۔۔۔‘‘

’’ایک خاص چیز تو حافظ عبداللہ ہے ابا جی۔ ہمیں سب سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اس کے پاس جانا چاہئے۔‘‘ اچانک سلیم نے کہا تو وہ سب اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرنے لگے۔ یہ کام تو انہیں آتے ہی کر لینا

چاہئے تھا۔

’’خوش کیتا ای پتر۔‘‘ چوہدری حسن دین نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’واقعی۔ یہ بات تو میرے بھی ذہن سے نکل گئی۔ میں تو تم لوگوں کو بابا شاہ مقیم کے مزار پر لے جانا چاہتا تھا' جن کی دعا برکت سے سکینہ بیٹی کی جان بچی۔ یہ میرا اپنا خیال ہے۔ آپ لوگوں کا میرے مراسلے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔‘‘

’’ہم اس سے بالکل اتفاق کرتے ہیں بھائی جی۔‘‘ تاج بی بی نے پہلی بار زبان کھولی۔ ’’ایسے اللہ والوں ہی کی وجہ سے تو دنیا آباد ہے۔ ہمیں وہاں ضرور جانا چاہئے۔‘‘

’’مگر پہلے حافظ عبداللہ۔۔۔‘‘ سلیم نے اشتیاق سے کہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے جس نے اس کی بہن کی جان بچائی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

’’تو ٹھیک ہے۔‘‘ چوہدری حسن دین اٹھ گیا۔ ’’چلو۔ اس کی مسجد میں چلتے ہیں۔‘‘

’’کس کی مسجد میں جا رہے ہیں ابا جان؟‘‘ رفاقت نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

’’حافظ عبداللہ کی مسجد میں بیٹے۔‘‘

’’مگر وہ تو مسجد میں نہیں ہیں۔‘‘ رفاقت نے بتایا۔

’’تو پھر کہاں ہیں؟‘‘

’’بابا شاہ مقیم کے مزار پر۔ میں فجر پڑھنے گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ظہر کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔‘‘

’’چلو۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہاں تو ہمیں جانا ہی تھا۔ وہیں مل لیں گے۔ کیوں میاں گھگو؟‘‘ اس نے میاں نذرو کا پھلکا اڑایا۔

’’ہاں ہاں۔ وہیں چلے چلتے ہیں۔‘‘ میاں نذرو نے اس کی بات ان سنی کر دی تاکہ اور زیادہ مذاق کا نشانہ نہ بننا پڑے۔ تاج بی بی بھی کھڑی ہوگئی۔

’’سکینہ۔‘‘ اس نے کسی سوچ میں ڈوبی بیٹی کا شانہ ہلایا۔ ’’تو بھی چل۔‘‘

’’آں۔۔۔ ہاں۔‘‘ وہ جیسے کسی خواب سے چونکی۔ ’’کہاں اماں؟‘‘

’’کہاں کھوئی ہوئی ہے دھی رانی؟‘‘ میاں نذرو نے پیار سے اسے مخاطب کیا۔ ’’ہم بابا شاہ مقیم کے مزار پر جا رہے ہیں۔ حافظ عبداللہ سے بھی وہیں مل لیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے چاچا۔ میں بھی چلتی ہوں۔‘‘ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاج بی بی نے صاف محسوس کیا کہ وہ اب بھی کسی سوچ میں ہے۔ مگر کس سوچ میں؟ یہ تو شاید سکینہ کو خود بھی معلوم نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد تاج بی بی، سکینہ، سلیم اور چوہدری حسن دین میاں نذرو کے شاہی تانگے میں سوار بابا شاہ مقیم کے مزار کی طرف جا رہے تھے۔

☆

دن تو جیسے تیسے گزر گیا مگر رات کا اکثر حصہ حافظ عبداللہ نے جاگ کر گزارا۔

پچھلی رات جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا تھا' وہ ایسا انہونا تھا کہ وہ اب تک خود کو خواب کی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔ درویش تو ایسا اس کے خیالوں پر سوار ہوا کہ ایک پل کو وہ اس کی طرف سے دھیان ہٹاتا' دوسرے پل وہ پھر آ دھمکتا۔ رہ گئی سکینہ' تو اس کے تصور میں آتے ہی اس کے ہاتھ کا زخم دل میں ٹیس سی دوڑا دیتا۔ اس کا جی چاہتا وہ آنکھیں بند کئے پڑا "سکینہ سکینہ" کا ورد کرتا رہے۔

فجر کی اذان کا وقت ہوا تو وہ آدھا جاگا آدھا سویا ایک دم اٹھ بیٹھا۔ لاحول پڑھ کر جسم پر پھونک ماری اور رفع حاجت کے بعد وضو کے لئے مسجد کے چھوٹے سے وضو خانے میں آ گیا۔ مرزا امیر حسین نے اسے زخم پر پانی ڈالنے سے منع کیا تھا۔ ویسے بھی ہاتھ میں حرکت دینے سے درد جاگ اٹھتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کا مسح کیا اور باقی وضو مکمل کر کے اذان کے لئے مسجد کی چھت پر چلا گیا۔

اذان کے بعد دعا مانگ کر وہ نیچے آنے کے لئے سیڑھیوں کی طرف چلا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ دور نور پور سے باہر بابا شاہ مقیم کا مزار جیسے اسے صدا دے رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ درویش نے بھی وہاں اذان دی ہو گی۔ درویش کا خیال آتے ہی اس کا جی چاہا کہ وہ سب کام چھوڑ کر اس کے پاس چلا جائے۔ اس کی انوکھی اسرار سے لبالب باتیں جسم میں سنسنی سی پیدا کر دیتی تھیں۔ ایک بار پھر تصور ہی تصور میں وہ کمرہ امتحان میں پہنچ گیا۔ جہاں چارپائی پر سکینہ پڑی تھی' دروازے میں درویش کھڑا تھا اور وہ خود سراپا حیرت بنا درویش کی باتیں سن رہا تھا۔

اسی وقت بڑی مدھم سی "اللہ اکبر" کی ندا اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کا سارا جسم لرز گیا۔ درویش اذان دے رہا تھا۔ حافظ عبداللہ کا دل سینے میں کسی پنچھی کی طرح پھڑ پھڑایا اور سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ اذان ختم ہونے تک وہ آنکھیں بند کئے کھڑا کانپتا رہا۔ پھر جونہی درویش نے آخر میں "لا الٰہ الا اللہ" کہا' حافظ عبداللہ بید مجنوں کی طرح لرزتا کانپتا چھت سے نیچے اتر آیا۔

فجر کی نماز میں بمشکل سات آٹھ نمازی تھے' جن میں رفاقت بھی شامل تھا۔ نماز کے بعد وہ لوگ اس کی خیریت دریافت کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اس نے کسی کو نہ بتایا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔ بس ایک ضروری کام کا کہہ کر ٹال دیا۔ ہاتھ جلنے کے بارے میں اس کی جگہ رفاقت نے سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ جلتے چراغ پر ہاتھ جا پڑا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی جب رفاقت نے اس سے اجازت چاہی۔

”رفاقت۔ میں بابا شاہ مقیم کے مزار پر جا رہا ہوں۔ ظہر تک لوٹ آؤں گا۔ اگر مجھے دیر ہو گئی تو اذان دے دینا' جماعت میں خود آ کے کراؤں گا۔“

”ٹھیک ہے حافظ صاحب لیکن آپ اتنی صبح صبح۔۔۔ ذرا دن چڑھے چلے جایئے گا۔“ رفاقت نے رواروی میں کہا۔

”نہیں یار۔“ حافظ عبداللہ نے سر پر ٹوپی درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس۔ دل اکھڑ سا گیا ہے۔ وہاں جاؤں گا تو سکون ملے گا۔“

”جیسے آپ کی مرضی جی۔ اور ناشتہ؟“ اچانک رفاقت کو یاد آ گیا۔

”وہ میں کر لوں گا۔ رات کا کھانا بچا پڑا ہے۔“ حافظ عبداللہ نے جلدی سے کہا۔

”میں ابھی دس منٹ میں لے آتا ہوں جی۔“

”نہیں بھئی۔“ حافظ نے ہاتھ اٹھا کر اسے حتمی طور پر روک دیا۔ ”میں کر لوں گا۔ تم جاؤ۔ ابا جی کو میرا سلام دینا۔ اور ہاں۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”جی حافظ صاحب۔ کچھ کہہ رہے تھے آپ؟“ جب وہ خاموش ہی رہا تو رفاقت نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”کچھ نہیں۔“ حافظ عبداللہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تم جاؤ۔“

رفاقت اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اب وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ اس سے سکینہ کا حال پوچھنا چاہتا تھا۔ الفاظ اس کی زبان تک آ کر رک گئے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ایسی بات اس کی زبان سے نہ نکل گئی جس سے اس کے دل کا چور پکڑا جاتا۔ اور یہ تو شاید اسی کے دل کا چور تھا' سکینہ کو اس کی خبر ہو گی' اسے اس بات کا قطعاً یقین نہ تھا۔

سورج نکل آیا تھا جب وہ بابا شاہ مقیم کے مزار پر پہنچا۔ حسب معمول درویش اسے باہر کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ مزار کے اندر چلا گیا۔ سلام کر کے بابا کے سرہانے' ان کے چہرے کے عین سامنے دوزانو بیٹھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور درود شریف کے بعد ذرا بلند آواز میں سورہ محمد ﷺ کی تلاوت شروع کر دی۔ سرور کی ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ پھر درود شریف ہی کا ورد کر رہا تھا۔ سورہ محمد ﷺ کی تلاوت کے بعد اس نے درود شریف کا ورد کب شروع کیا' اسے کچھ خبر نہ تھی۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کا اندر شفاف ہو گیا ہے۔ ذہل گیا ہے۔ بے تابی کا کہیں نام و نشان نہیں ہے اور سکون ہے کہ اس پر سایہ فگن ہے۔

اس نے دعا مانگی اور آمین کہتے ہوئے جب چہرے پر ہاتھ پھیرے تو پتہ چلا اس کا چہرہ اور داڑھی آنسوؤں میں تر تھے۔ سر جھکائے چند لمحے بیٹھا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر مزار کا ماتھا چوما۔ سلام کیا اور الٹے پاؤں باہر نکل آیا۔

باہر قدم رکھا تو بائیں ہاتھ کھڑے درویش نے آنکھیں کھول دیں۔

”آ گیا حافظ۔“ وہ اس کی طرف بڑھا۔ ”میں کب سے کھڑا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بابا۔۔۔ آپ۔“ حافظ نے جلدی جلدی چپل پاؤں میں ڈالی اور اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔

”اوں ہوں۔۔۔“ درویش نے سرزنش کی۔ ”آج کیا ہے۔ آئندہ ایسا نہیں کرنا۔ کیوں مجھے ابلیس کے حوالے کرنے پر تلا ہے تو۔“ وہ حافظ عبداللہ کو سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”اسے بھی فخر اور تکبر لے ڈوبا تھا۔ جس کے ہاتھ پاؤں چومے جائیں اسے وہ بڑی جلدی آن لیتا ہے۔ اسے سمجھاتا ہے کہ وہ دوسروں سے افضل ہے۔ اور یہ سوچ ہی وہ تازیانہ ہے جو انسان کے اندر سے عاجزی کو مار مار کر بھگا دیتی ہے۔“

”بابا۔“ حافظ عبداللہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ”میں یہیں آپ کے پاس نہ آ جاؤں؟“

”سیانا ہے تو۔“ درویش مسکرایا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ٹبے کی طرف چل پڑا۔ ”میرے پاس کیا رکھا ہے۔ سوائے تنہائی، اداسی اور جلی بجھی باتوں کے۔ تجھے بھری پُری جگہ پر رہنا ہے۔ پھلنا پھولنا ہے۔ یہاں آ کر کیا کرے گا؟“

”بس میرا جی چاہتا ہے بابا۔ میں ہر وقت آپ کے پاس رہوں۔“ حافظ عبداللہ کے لبوں سے نکلا۔

”جی تو بہت سی باتوں کو چاہتا ہے حافظ۔ سبھی پوری تو نہیں ہو جاتیں۔“ درویش اس کے ساتھ ٹبے پر چڑھا اور دونوں پیپل تلے بیٹھ گئے۔ ”تو یہ بتا۔ اس پگلی کا کیا حال ہے؟“

”کس کا بابا؟“ حافظ عبداللہ کا دل زور سے دھڑکا اور نظر جھک گئی۔

درویش نے سر نیچا کئے گھاس کے تنکے توڑتے حافظ عبداللہ کی طرف چند لمحوں تک دیکھا۔ پھر ہنس دیا۔

”اچھا ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”اچھا ہے جو تو اسے بھول جانا چاہتا ہے۔ نیکی کو نسیان کے دریا میں ڈال دینا ہی اچھا ہے۔“

حافظ عبداللہ نے سر اٹھایا نہ درویش کی بات پر کوئی تاثر ظاہر کیا۔ وہ اب ایک تنکا دانتوں میں دبائے خاموش

بیٹھا تھا۔

''چل۔ اشراق پڑھ لیں۔ وقت نہ نکل جائے۔'' اچانک درویش نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے حافظ کے کندھے سے چادر کھینچی اور ٹبے پر بچھا دی۔ دونوں قبلہ رخ کھڑے ہوئے اور اپنے اللہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے عبادت کے دروازے پر اس کی دی ہوئی توفیق سے دستک دینے لگے۔

☆

دن کے ساڑھے نو بجے تھے جب میاں نذرو کا شاہی تانگہ بابا شاہ مقیم کے مزار کے باہر آن رکا۔ وہ سب لوگ نیچے اترے اور مزار کے اندر سلام کے لئے چلے گئے۔

سکینہ نے اندر جاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ درویش اور حافظ عبداللہ میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ ''شاید کمرے میں ہوں گے۔'' اس نے سوچا اور گھر والوں کے ساتھ مزار کے اندر چلی گئی۔

پھولوں کی چادر چڑھائی گئی جو میاں نذرو نے رستے میں گاؤں کے پھلیرے سے لے لی تھی۔ دعا مانگی گئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا گیا جس نے انہیں سکینہ صحیح سلامت لوٹا دی تھی۔

سکینہ نے سر جھکایا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے خود پر قابو نہ رہا۔ نہ زبان سے کوئی لفظ نکل رہا تھا نہ دل سے کوئی دعا۔ بس اشک تھے کہ بہتے چلے جا رہے تھے۔ سسکی تک اس کے لبوں تک نہ آئی۔ چہرے کو ڈھانپتا دوپٹہ بہت بڑی ڈھال بن گیا۔ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ اشک کیوں ہو رہی ہے؟

دعا کے بعد وہ نذرانہ مزار کے اندر دروازے کے پاس رکھے بکس میں ڈال کر باہر نکلے تو حیران ہوئے۔ سامنے برگد کے درخت تلے دھاری دار دو تین دریاں بچھی تھیں اور درویش ان سے کچھ دور ایک بڑے سے مسطح پتھر پر کھڑے گھٹنے بازوؤں کے کلاوے میں لئے بیٹھا تھا۔ جبکہ میاں نذرو کا کوچوان دری کے کونے پر سر جھکائے حافظ عبداللہ کے پاس بیٹھا تھا۔ انہیں حیرت یہ تھی کہ جب وہ پہنچے تھے تو وہاں ایسی کسی چیز کا نام و نشان نہ تھا مگر اب یوں لگتا تھا کہ یہ سارا اہتمام ہی ان کے لئے کیا گیا ہے۔

انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر درویش اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سکینہ نے اسے دیکھا اور جیسے بھاگ کر اس کے قریب چلی گئی۔

''آ گئی تو۔'' درویش نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''جیون جوگئے۔ رو کیوں رہی ہے؟'' اس نے آہستہ سے کہا اور اسے ساتھ لگا لیا۔ ''کیا اپنا بھید سب کو بتائے گی۔ چپ ہو جا۔ روک لے اس نمکین پانی کو۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔''

سکینہ نے اس کے کندھے سے لگے لگے بڑے غیر محسوس انداز میں پلو سے آنکھیں خشک کر لیں اور الگ ہو گئی۔

''آؤ جی بھاگاں والیو۔'' درویش نے ان سب کو دونوں ہاتھ اٹھا کر دور سے کہا اور ساتھ ہی اپنے گھٹنے چھونے سے صاف منع کر دیا۔ اس طرح اس نے ان سے مصافحہ کرنے سے بھی جان بچا لی۔

''بابا۔'' چوہدری حسن دین نے اس سے دو قدم دور رک کر ہاتھ جوڑ دیے۔ ''ہم آپ کا اور حافظ عبداللہ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔''

''شکر ادا کر اس کا چوہدری۔ جس نے یہ سارا کھیل رچایا ہے۔'' درویش نے آسمان کی جانب انگلی اٹھا دی۔'' میں نے کیا ہی کچھ نہیں تو شکریہ کس بات کا قبول کروں۔ باقی رہا حافظ تو وہ بیٹھا ہے۔ وہ جانے اور تم جانو۔ تم جتنا چاہو اسے شرمندہ کر لو۔''

''نہیں بابا۔ شرمندہ کیوں کریں گے ہم اسے؟ ہم تو اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ ہماری بیٹی کی جان بچا کر اس نے ہمیں خرید لیا ہے۔'' میاں نذرو نے ممنونیت سے کہا۔

''تو کیا کہتا ہے میاں؟'' درویش نے سلیم کا رخ کیا جو کبھی اسے اور کبھی حافظ عبداللہ کو دیکھ رہا تھا۔

''میں۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میرے لئے تو وہ دنیا کا سب سے عظیم انسان ہے جس نے میری بہن کو مرنے سے بچا لیا۔''

''بس۔'' اچانک درویش بھڑک اٹھا۔ ''مرنے سے تیری بہن کو میرے اللہ نے بچایا ہے۔ حافظ عبداللہ کون ہوتا ہے اسے بچانے والا۔ تم لوگ شرکیہ الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے ذرا نہیں سوچتے۔''

''معافی چاہتا ہوں بابا۔'' سلیم سہم سا گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''پتہ ہے۔ پتہ ہے۔'' درویش ایک دم ٹھنڈا ہو گیا اور بیزاری سے بولا۔ ''شرک کی نیت نہیں ہوتی، اسی لئے بچ جاتے ہو تم لوگ۔ پھر بھی بولنے سے پہلے سوچا کرو۔ سوچا کرو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''جی بابا۔'' سلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی متاثر نظر آ رہے تھے۔

''لے بھئی حافظ۔ بابا شاہ مقیم نے تیرے مہمان بھیجے ہیں۔ ان سے باتیں کر۔ میں ان کے لئے تبرک لے آؤں۔'' درویش نے وہیں سے کہا اور سکینہ کے سر پر پیار دے کر پلٹ گیا۔

وہ سب لوگ حافظ عبداللہ کی طرف چل پڑے جو اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ میاں نذرو، سلیم اور چوہدری حسن دین نے اس سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اس کا حال چال پوچھا۔ تاج بی بی نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا

اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ سکینہ ماں کے عقب میں سر جھکائے کھڑی کنکھیوں سے بار بار حافظ عبداللہ کے پٹی میں ملفوف ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ سب اس کے پاس ہی دری پر بیٹھ گئے۔

’’حافظ صاحب۔ ہم آپ کا شکریہ ادا کر کے اس نیکی کا درجہ نہیں گھٹانا چاہتے جو آپ نے سکینہ ہمیں زندہ سلامت لوٹا کر ہمارے ساتھ کی ہے۔‘‘ سلیم نے حافظ عبداللہ کا بایاں ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر کہا۔ ’’میں سکینہ کا بھائی ہوں جی۔ زندگی میں کبھی میری جان کی ضرورت بھی پڑ جائے تو مانگ لینا۔ رب کی قسم۔ انکار کروں تو کافر ہو کر مروں جی۔‘‘

’’کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔‘‘ حافظ عبداللہ نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ’’میں نے کیا کیا ہے۔ یہ تو میرے سوہنے اللہ کا کرم ہے کہ سکینہ بی بی کی جان بچ گئی۔ میں تو ایک حیلہ بن گیا اور بس۔ میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا میری جگہ۔ سکینہ بی بی پھر بھی بچ جاتیں۔‘‘

’’سچ ہے بیٹا۔‘‘ میاں نذرو نے سر ہلا کر کہا۔ ’’مگر اب تو تم ہی ہمارے لئے اس نیکی کا سبب بنے ہو ناں۔ زبان سے تمہارے شکریے کے الفاظ ادا کرنے سے دل کو ذرا تسلی ہو جائے گی۔ باقی اس نیکی کا نہ کوئی بدل ہے نہ انعام۔‘‘

’’بس کرو یار اب۔‘‘ ایک دم چوہدری حسن دین بول پڑا۔ ’’تم تو اپنے شکریے کے بوجھ تلے میرے حافظ صاحب کا سانس روک دو گے۔ بس اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ اس نے حافظ عبداللہ کو مزید مشکل میں پڑنے سے بچا لیا۔

’’پھر بھی ابا جی۔ ہمیں حافظ صاحب کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ زبانی جمع خرچ سے کیا فائدہ۔‘‘ سلیم نے باپ کی طرف دیکھا۔

’’کیا کریں پتر۔ تو بتا؟‘‘ میاں نذرو بیٹے کی طرف متوجہ ہوا۔

’’دیکھئے۔ آپ لوگوں نے میرا شکریہ ادا کر لیا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے بارے میں آپ لوگ سوچیں بھی مت۔ اس سے مجھے تکلیف ہو گی۔‘‘ حافظ عبداللہ نے ان کی نیت بھانپ کر جلدی سے کہا۔ اسی وقت اس کی نگاہ سکینہ پر پڑی جو اسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

’’اماں۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔‘‘ اچانک سکینہ نے زبان کھولی تو سب لوگ چونک پڑے۔ اس کے وجود سے تو وہ جیسے بے خبر ہی ہو گئے تھے۔

’’ہاں ہاں بیٹی۔ تو کہہ۔‘‘ تاج بی بی کے ساتھ میاں نذرو بھی بول اٹھا۔ ’’شاید تیری ہی بات کچھ ایسی ہو کہ

ہمارے دل اطمینان پا سکیں۔‘‘

’’رک جاؤ بیٹی۔‘‘ چوہدری حسن دین نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ’’ادھر آ۔ پہلے چاچا بھتیجی صلاح کر لیتے ہیں۔ پھر انہیں بتائیں گے۔ آ جا۔‘‘ وہ دری سے اٹھا اور جوتے پہننے لگا۔

سکینہ نے ایک پل کو کچھ سوچا۔ ایک نگاہ بھر حافظ عبداللہ کی جانب دیکھا۔ لگتا تھا وہ اسے کچھ بھی کہنے سے روکنا چاہتا ہے مگر پھر نجانے کیوں اس نے سکینہ سے نظر ملتے ہی نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر سر جھکا لیا۔ سکینہ‘ چوہدری حسن دین کے ساتھ ان لوگوں سے تیس پینتیس قدم دور کھیتوں کے کنارے چلی آئی۔

’’اب بتا بیٹی۔ کیا کہنا چاہتی ہے تو؟‘‘ چوہدری حسن دین یوں کھڑا ہو گیا کہ اس کا رخ باقی لوگوں کی طرف تھا اور سکینہ کی پشت۔

’’چاچا‘‘ سکینہ نے زبان پھیر کر اپنے ہونٹوں کو تر کیا۔ ’’میں۔۔۔ میں۔۔۔‘‘ اس نے نظر جھکا لی۔

’’دیکھ بیٹی۔ بات تو حافظ عبداللہ کا شکریہ ادا کرنے کی ہے۔ وہ اسے روپیہ پیسہ مکان وغیرہ دے کر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب تیرے ذہن میں کیا ہے‘ تو وہ بتا دے۔‘‘

’’کسی کی جان بچانے کی قیمت کیا یہی کچھ ہے چاچا؟‘‘ سکینہ نے اس کی جانب دیکھا۔

’’نہیں۔‘‘ خلاف معمول چوہدری حسن دین اس وقت بالکل سنجیدہ تھا۔ ’’مگر ہم اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں بیٹی؟‘‘

’’جان میری بچائی ہے اس نے چاچا۔ تو کیا اس کا شکریہ ادا کرنے کا موقع مجھے نہیں ملنا چاہئے؟‘‘ اچانک سکینہ نے جیسے حوصلہ پکڑ لیا۔

’’بالکل ملنا چاہئے بیٹی۔‘‘ چوہدری حسن دین نے اس کی آنکھوں میں بڑے غور سے دیکھ کر کہا اور اس بار سکینہ نے نظر نہ جھکائی بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ ’’تو بتا۔ کیا کرنا چاہتی ہے تو؟‘‘

اور جواب میں اس نے جو کہا اسے سن کر چوہدری حسن دین کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس نے جیسے لڑکھڑانے سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھ سکینہ کے شانوں پر رکھ لئے۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔

’’ہاں چاچا‘‘ سکینہ نے پرُسکون لہجے میں کہا۔ ’’یہی میرا شکریہ ہے حافظ عبداللہ کے حضور۔‘‘

’’مگر کیوں بیٹی؟ اتنا بڑا فیصلہ۔۔۔‘‘

’’میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے چاچا۔ نہ یہ اچانک ہے اور نہ کسی دباؤ کے تحت۔ یہ حتمی ہے۔ اس

میں کوئی لچک ممکن نہیں۔‘‘ اس نے چوہدری حسن دین کی بات کاٹ دی۔

اس کی آواز میں نجانے کیا تھا کہ چوہدری حسن دین کا سانس سینے میں رک سا گیا۔ اس نے پلکیں زور سے جھپک کر نظر میں اڑتی دھول صاف کرنے کی کوشش کی۔ پھر آہستہ سے سکینہ کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔

’’سکینہ بیٹی۔ میں تجھے وہاں ان لوگوں کے پاس سے یونہی اٹھا کر نہیں لے آیا تھا۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں میں محسوس کر رہا تھا کہ تو حافظ عبداللہ کو بار بار کنکھیوں سے دیکھ رہی ہے۔ میری بات کا برا نہ منانا۔ میں نے اس بات کو اچھا نہ سمجھا اور دل میں بدگمانی کا شکار بھی ہوا' کیونکہ حافظ عبداللہ کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ وہ میرے بچوں کا استاد ہے۔ اس کی شرم مارتی ہے مجھے۔ جب تو نے کہا کہ تو حافظ عبداللہ کے لئے کچھ کہنا چاہتی ہے تو میں یہ سوچ کر تجھے وہاں سے اٹھا لایا کہ تو نادانی میں کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکال دے جسے بھگتنا ہمارے لئے مشکل ہو جائے مگر مجھے یہ اندازہ قطعی نہیں تھا کہ تو اتنی بڑی بولی لگا دے گی اپنی جان بچانے کی۔ ابھی تک میں یہ بھی نہیں جان پایا کہ تو نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟‘‘

’’وہ میں سب کے سامنے بتاؤں گی چاچا۔‘‘ سکینہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

’’سب کے سامنے؟‘‘ چوہدری حسن دین چونکا۔ ’’مگر کیوں؟ دیکھ بیٹی۔ مجھے یہیں بتا دے تاکہ میں وہاں بات کو سنبھال سکوں۔‘‘

’’ایسی کوئی بات نہیں ہے چاچا' جس کے لئے مجھے کسی کی سفارش کی ضرورت پڑے۔ بات بالکل صاف' سیدھی اور سچی ہے جو میں سب کو ایک ساتھ بتانا چاہتی ہوں۔‘‘

’’بیٹی۔۔۔‘‘ چوہدری حسن دین نے کہنا چاہا۔

’’بس چاچا۔ اور کچھ نہیں۔‘‘ سکینہ نے جیسے بات ختم کر دی۔ ’’آیئے چلیں۔ سب لوگ نجانے کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔‘‘ وہ سر جھکائے آہستہ سے پلٹی۔ چوہدری حسن دین نے اسے روکنا چاہا' مگر وہ قدم اٹھا چکی تھی۔ بیچارگی سے ہونٹ کاٹتے اور دماغ میں اٹھتے بگولوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ آنے والے لمحات میں کیا طوفان جنم لینے والا تھا' اس کا احساس اسے بخوبی ہو رہا تھا۔

سکینہ لوٹی اور سر جھکائے اس طرح آ کر دری پر بیٹھ گئی کہ اب اس کے سب لوگ اس کے سامنے اور حافظ عبداللہ کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ پر تھا۔ چوہدری حسن دین لمبے لمبے ڈگ بھرتا آیا اور سکینہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سب حیران تھے کہ سکینہ ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے ان کے سامنے کیوں آ بیٹھی ہے؟ درویش ابھی تک نہ لوٹا تھا۔

التحیات پر جیسے عورتیں بیٹھتی ہیں' اس انداز میں بیٹھ کر سکینہ نے بائیں ہتھیلی زمین پر بچھا کر جسم کا سارا بوجھ اس

پر ڈال دیا اور دوپٹہ سر پر ٹھیک کر لیا۔

''چاچا۔ آپ بات کریں گے یا میں بولوں؟'' اس نے اپنے ساتھ بیٹھے چوہدری حسن دین سے آہستہ آواز میں پوچھا' جس کی ساری شگفتگی ہوا ہو چکی تھی۔

''نہیں۔ تم ابھی خاموش رہو۔'' چوہدری حسن دین نے بھی آہستہ سے جواب دیا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

سب لوگ انہیں اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر میاں نذرو رہ نہ سکا اور بول پڑا۔ ''کیا بات ہوئی بھئی تم چاچے بھتیجی میں۔ اب بتا بھی دو۔ کیوں ہمارا ضبط آزما رہے ہو۔''

''میاں۔'' چوہدری حسن دین نے بجھی بجھی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ''سکینہ بیٹی۔۔۔'' وہ رک گیا۔ اس کا حوصلہ نہ پڑ رہا تھا کہ بات ایک دم سے زبان سے نکال دے۔

''سکینہ بیٹی۔'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''وہ چاہتی ہے کہ۔۔۔''

''ارے بابا۔ کیوں تیرا پیشاب خطا ہو رہا ہے۔ کہہ دے جلدی سے۔ میرا دل تو ہول کھانے لگا ہے کہ نجانے کیا بات کہنے والا ہے تو؟'' میاں نذرو کی بیتابی شدید ہو گئی۔

''تو سن میاں۔'' چوہدری حسن دین نے سر جھٹک کر کہا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب جو ہو سو ہو اسے بات کر دینی چاہئے۔ ''مگر میری بات سننے سے پہلے یہ جان لے کہ اگر بات تم لوگوں کی عقل اور سمجھ سے اوپر کی ہوئی تو فوری طور پر کوئی جوابی اقدام کرنے سے گریز کرنا۔ بات اتنی ہی نازک ہے کہ میں بھی بڑی مشکل سے سمجھ پایا ہوں۔''

سب لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ حافظ عبداللہ نے گھبرا کر سکینہ اور چوہدری حسن دین کی جانب دیکھا۔ سکینہ تو سر جھکائے بیٹھی تھی اور چوہدری حسن دین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ضرور مگر وہاں اس کے لئے کوئی پیغام تھا نہ تسلی۔

''سکینہ بیٹی چاہتی ہے کہ اس کی شادی حافظ عبداللہ سے کر دی جائے۔''

چوہدری حسن دین کے الفاظ تھے یا بجلی کا کڑاکا۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کی سماعتیں انہیں دھوکا دے رہی ہوں۔ وہ کچھ اور سننا چاہتے تھے مگر سنائی کچھ اور دے رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو چوہدری؟'' میاں نذرو ایک دم جیسے اکھڑ گیا۔ اس نے گھور کر حافظ عبداللہ کی جانب دیکھا جو اپنی جگہ پر دم بخود بیٹھا تھا۔ اسے خود سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس نے جو سنا وہ غلط تھا' یا جو سکینہ کی نظریں کہہ رہی تھیں وہ سچ تھا۔ سکینہ نے اسے ایک بار بھرپور نگاہوں سے دیکھا' پھر سر جھکا لیا۔

''میں درست کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے سکینہ بیٹی نے یہی کہا ہے۔'' چوہدری حسن دین نے سنبھالا لیا۔ ''اور

میاں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہیں بات کی باریکی کو سمجھنے سے پہلے کوئی بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ''

''اور بات کی باریکی کو سمجھا کیسے جائے گا چاچا؟'' اچانک سلیم کی زہریلی آواز ابھری۔ وہ اپنے غصے کو ضبط کی لگام دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سکینہ بیٹی کی بات سن کر۔ اس نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ یہ جاننے کے بعد ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ہمیں اس کی بات ماننا چاہیے یا نہیں؟''

''مگر بھائی صاحب۔ یہ کیسے ممکن ہے؟'' تاج بی بی کی کمزوری آواز ابھری۔ اسے سکینہ سے ایسے اقدام کی امید ہی نہ تھی۔ ویسے بھی وہ اپنے دیور کے رحم و کرم پر تھی۔ اسے زندگی کی ہر سہولت ضرور میسر تھی مگر ہر فیصلے کا اختیار صرف میاں نذرو کے پاس تھا۔ اب اسے یہ خوف ستا رہا تھا کہ سکینہ کی اس بات کے ردعمل کے طور پر ان ماں بیٹیوں کے ساتھ جو سلوک ہوگا' اس کی ابتدا کس ستم سے ہوگی۔

''ممکن اور ناممکن کا فیصلہ کرنے سے پہلے اگر آپ لوگ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں تو شاید میں آپ کو سمجھا سکوں۔'' سکینہ نے بڑی مشکل سے بوجھل پلکیں اٹھائیں اور حافظ عبداللہ کی جانب دیکھا جس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن کے مصداق وہ اپنی جگہ جیسے گڑ کر رہ گیا تھا۔

''پہلی بات یہ ہے کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی ذات میں رہ کر' اپنے طور پر کیا ہے۔ اس میں حافظ صاحب کا کوئی دخل نہیں ہے' اس لئے انہیں کسی بھی طرح قصوروار نہ سمجھا جائے۔''

''اور دوسری بات؟'' شعلہ بار انداز میں سلیم نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''دوسری بات یہ کہ میرے اس فیصلے کی' ایک عورت ہونے کے ناطے میرے پاس بڑی معقول وجہ موجود ہے۔''

''وہ بھی کہہ ڈالو۔'' سلیم کا لہجہ اب بھی بڑا تلخ تھا۔

''ایک عورت کے لئے سب سے محترم وہ مرد ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس کے جسم کو چھوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ایک دم سلیم اور میاں نذرو کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ آگ بگولہ ہوگئے۔ ان کے نظروں کا ہدف حافظ عبداللہ بنا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے' سکینہ کی آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''میری بات کا غلط مطلب نہ لو سلیم بھائی۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے سلیم۔'' چوہدری حسن دین نے دونوں باپ بیٹے کو تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''اس کی بات پوری سن تو لو۔''

’’سننے کے لئے رہا کیا ہے اب چاچا۔ سب کچھ تو صاف ہو گیا ہے۔‘‘ سلیم بھڑکا۔

’’کچھ صاف نہیں ہوا۔ کچھ نہیں سنا ابھی تم نے۔‘‘ سکینہ کی آواز بلند ہو گئی۔ ’’مجھے بات پوری کرنے دو۔ غصہ نکالنے کے لئے تمہیں بہت وقت مل جائے گا۔‘‘

سلیم اور میاں نذرو نے اسے بڑی کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے بادل نخواستہ خاموشی اختیار کر لی اور حافظ عبداللہ نے ایک بار پھر امید بھری نظروں سے بابا شاہ مقیم کے مزار کی جانب دیکھا۔ ابھی تک درویش باہر نہیں آیا تھا۔ اس کے ہوتے شاید حالات وہ خراب رخ اختیار نہ کرتے‘ جس کی طرف وہ اب جا رہے تھے۔

’’مجھے جب سیلاب سے حافظ صاحب نے نکالا تو یہ شام کے قریب کا وقت تھا اور میں اس وقت بیہوش تھی۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ وہ مجھے چادر میں لپیٹ کر اپنے کندھے پر اٹھا کر اس کمرے میں لے گئے اور چارپائی پر ڈال دیا۔‘‘ سکینہ نے اس کمرے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جس میں اس نے رات گزاری تھی۔ سب نے پلٹ کر اس جانب دیکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

’’میں جب ہوش میں آئی تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ مجھے بتایا کہ میں بابا شاہ مقیم کے مزار پر ہوں۔ مجھے کھانے کو روٹی دے کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور قرآن پاک کی تلاوت میں محو ہو گئے۔ ’’میرے ساتھ میرا اللہ موجود ہے۔‘‘ یہ بات مجھے بے خوف کرنے کے لئے حافظ صاحب نے کہی تھی‘ مگر ایک اجنبی جوان مرد کے ساتھ انجان جگہ پر موجود ہونے کا احساس مجھے پلک نہ جھپکنے دیتا تھا۔ میرا جسم پانی کے تھپیڑے کھا کھا کر چور ہو چکا تھا۔ میں تھکن سے بے حال تھی۔ سو جانا چاہتی تھی۔ جاگ جاگ کر جب حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے تو میں نے کمرہ اندر سے بند کیا اور لیٹ گئی۔ تب‘ حافظ صاحب چپکے سے آئے۔ مجھے سوتا دیکھ کر چند لمحے کھڑے رہے پھر لوٹ گئے۔ میں نے ان کے جانے کے بعد اٹھ کر کھڑکی کی درز سے دیکھا۔ وہ بے تابی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ شاید وہ بھی اسی کیفیت کا شکار تھے جو مجھے نہ سونے دے رہی تھی۔ میں گھبرا گئی اور اپنے اللہ سے رو رو کر مدد مانگنے لگی۔‘‘

سکینہ رکی۔ اس نے سر جھکائے بیٹھے حافظ عبداللہ پر ڈالی۔ پھر میاں نذرو‘ سلیم اور اپنی ماں کی جانب دیکھا‘ جو خاموشی سے اس کی بات سن رہے تھے۔ ان کی حالت میں ایک ٹھہراؤ تو آیا تھا مگر ماتھے اب بھی شکن آلود تھے۔

’’کافی دیر بعد میں نے دوبارہ ڈرتے ڈرتے کھڑکی کی درز سے جھانک کر دیکھا اور میرا سانس رک گیا۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ جب صورتحال میری سمجھ میں آئی تو مجھے لگا‘ میں کسی اور ہی دنیا میں ہوں۔ حافظ صاحب مجھے اس دنیا کے فرد نہ لگے۔ میں ان کے سامنے خود کو حقیر ترین محسوس ہوئی۔ آپ جانتے ہیں‘ میں نے کیا دیکھا؟‘‘

سکینہ نے بات روک کر دھندلائی ہوئی نظروں سے ان سب کو باری باری دیکھا۔ وہ سب اس کی بات مکمل ہونے کے انتظار میں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی جواب دیتا بھی تو کیا' خود چوہدری حسن دین تک تو حیرت میں گم یہ قصہ عجب شب سن رہا تھا۔

''میں نے دیکھا۔'' سکینہ کی آواز بھیگتی چلی گئی۔ ''حافظ صاحب تلاوت میں اس طرح منہمک ہیں کہ انہیں یہ تک ہوش نہیں کہ شیطان کو اپنے خیالوں سے' اپنی سوچوں سے نکال پھینکنے کے لئے انہوں نے اپنا جو ہاتھ جلتے چراغ کی لو پر رکھا تھا' وہ خشک لکڑی کی طرح آگ پکڑ چکا ہے۔ جل رہا ہے۔ پگھل رہا ہے۔ میں بھاگی۔ ان کے کمرے میں پہنچی۔ ان کے قریب پہنچی تو درویش بابا نے مزار کے باہر اللہ اکبر کی صدا بلند کی۔ میں نے حافظ صاحب کا ہاتھ جلتے چراغ سے ہٹایا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ درد اور تکلیف کا احساس انہیں تب ہوا جب میں نے ان کا ہاتھ کمبل کے پلو میں لپیٹا اور انہوں نے مجھے دیکھا۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ غش کھا گئے۔ اسی وقت درویش بابا اذان ختم کر کے اندر آئے اور انہوں نے حافظ صاحب کو لے جا کر اسی چارپائی پر ڈال دیا جس پر ساری رات میں کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ یہ ہاتھ۔۔۔'' سکینہ نے سسکی لی اور حافظ عبداللہ کے جلے ہوئے ہاتھ کی جانب اشارہ کیا۔ ''خود بخود جلتے ہوئے چراغ پر نہیں جا پڑا تھا۔ حافظ صاحب نے اسے خود آگ کے حوالے کر دیا تھا' تا کہ ان کے خیالوں میں بار بار نقب لگاتا شیطان جل کر خاک ہو جائے۔ درد اور اذیت کی جس منزل سے وہ گزرے ہیں' میں اور آپ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔۔۔ اور یہ سب انہوں نے صرف اس لئے کیا کہ ان کا دھیان میری طرف سے ہٹا رہے۔ میں ان کی نفسانی گمراہی سے محفوظ رہوں۔ سکینہ کی عزت بچی رہے۔ سکینہ اپنے پچھلوں تک پہنچے تو اس کا دامن پاک ہو۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنی لرزتی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ آنسو بہنے کا اسے کوئی ہوش نہ تھا۔

چوہدری حسن دین بُت بنا سب کچھ سن رہا تھا تو باقی لوگوں کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ ان کے اذہان میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ سب کچھ سن رہے تھے اور تصور میں فلم سی چلتی دیکھ رہے تھے۔

''ایک جوان لڑکی کو اپنے نفس کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کے لئے حافظ صاحب نے خود کو جس امتحان میں ڈالا' کیا وہ کسی عام انسان کے بس کی بات ہے؟'' سکینہ نے چند لمحوں کے بعد آنکھیں خشک کرتے ہوئے ان سب سے سوال کیا۔ ''ان کا ہاتھ زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہو گیا۔ ایک دن میری شادی ہونا ہی ہے۔ جس طرح ہر لڑکی چاہتی ہے کہ اس کا ہونے والا شوہر خوبصورت ہو۔ خوبیوں میں ایسا ہو کہ دوسری لڑکیاں اس پر رشک کریں۔ اسی طرح میں بھی اپنے لئے ایسا ہی شوہر چاہتی ہوں۔۔۔ لیکن کیا مجھے حافظ صاحب جیسا مرد ملے گا؟ ایسا مرد جس نے اپنے نفس کو پچھاڑ کر ثابت کر دیا کہ مردانگی عزت لوٹنے کا نام نہیں' عزت کی حفاظت کرنے کا نام ہے۔ میرے جسم کو صرف ایک غیر مرد

نے اب تک چھوا اور وہ حافظ صاحب ہیں۔ انہوں نے جن حالات میں مجھے مس کیا' وہ ان کی مجبوری تھی لیکن انہوں نے میری مجبوری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ میرا جسم میرے شوہر کی امانت ہے۔ میں چاہتی ہوں' چار کلمے پڑھ کر جس انسان کو میرے جسم کا مالک بننا ہے' وہ وہی ہو جس نے پہلی اور آخری بار میرے جسم کو چھوا اور اس میں اس کی بدنیتی کو کوئی دخل نہ تھا۔۔۔ ہاں مگر اس کے لئے میں حافظ صاحب کی رضا کی مکمل پابند ہوں۔ اگر وہ نہیں چاہتے تو میں انہیں اس کے لئے مجبور نہیں کروں گی کہ وہ مجھ سے شادی کے لئے ہاں کریں۔''

سکینہ خاموش ہو گئی۔

چوہدری حسن دین نے ہاتھ بڑھایا اور اسے بازو کے کلاوے میں لے کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ سسکتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔

سب لوگ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ انہیں فیصلہ کرنے میں دقت ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ کوئی گڈے گڑیا کا بیاہ نہیں تھا جس کے لئے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی جاتی۔ حافظ عبداللہ نے ایک بار پھر مزار کی طرف نظر اٹھائی اور یہ دیکھ کر چونکا کہ مزار کے بجائے درویش گاؤں کی طرف سے آنے والے رستے پر چلا آ رہا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکری تھی جسے وہ ایک ہاتھ سے سنبھالے ہوئے تھا۔

اسے آتا دیکھ کر حافظ عبداللہ نے بڑا حوصلہ محسوس کیا۔ درویش نے چوہدری حسن دین کے قریب پہنچ کر مٹھائی کی ٹوکری اسے تھما دی۔

''بابا۔ یہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''بابے شاہ مقیم کی طرف سے تبرک بھی ہے اور منہ میٹھا کرنے کے لئے مبارک بھی۔'' درویش نے دھیرے سے کہا۔ پھر باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے تھے۔

''بیٹھو بیٹھو اللہ والیو۔ کھڑے کیوں ہو گئے۔ بیٹھ جاؤ۔ لگتا ہے ابھی بات تم لوگوں کے حلق سے نہیں اتری۔ میرے حافظ کو تول رہے ہو ابھی۔'' وہ رکا تو حافظ عبداللہ اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

سکینہ اب درویش کے دائیں اور حافظ عبداللہ بائیں طرف تھا۔ باقی سب لوگ اس کے سامنے تھے۔ حافظ عبداللہ نے کچھ کہنا چاہا مگر درویش نے اسے ہاتھ اٹھا کر خاموش کرا دیا۔ اس کے بیٹھنے پر سب لوگ پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے

''ہاں۔ تو ابھی تک حافظ کا قول پورا نہیں ہوا۔ یہی بات ہے ناں؟'' درویش نے میاں نذرو اور سلیم کی طرف دیکھا۔

''بات یہ ہے بابا۔۔۔'' میاں نذرو نے زبان کھولی۔

’’حافظ عبداللہ کا رنگ سانولا ہے۔ چہرہ مہرہ بھی واجبی سا ہے۔ مال دولت پلے ہے نہیں۔ مسجد کے حجرے میں رہتا ہے۔ آگے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں۔ سکینہ جیسی پڑھی لکھی‘ خوبصورت‘ اچھے اور اونچے گھرانے کی لڑکی کے قابل نہیں ہے وہ۔ یہی بات ہے ناں میاں؟‘‘ درویش نے میاں نذرو کی بولتی بند کر دی۔ ’’مگر اس سے شادی کا فیصلہ تو سکینہ نے کیا ہے۔ وہ بالغ ہے۔ اپنی پسند کا نکاح کر سکتی ہے۔ پھر تم لوگوں کو کیا اعتراض ہے اس پر؟‘‘

’’اعتراض ہے بھی اور نہیں بھی بابا۔‘‘ اس بار سلیم نے کہا۔

’’جو میں نے گنوائے ہیں‘ ان کے علاوہ کوئی اور اعتراض ہو تو کہو۔‘‘ درویش نے اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

’’لڑکی کی ماں سے بھی تو پوچھ لینا چاہئے۔‘‘

’’ہاں۔ یہ جائز بات ہے۔‘‘ درویش نے تاج بی بی کا رخ کیا۔ ’’تو بول۔ تو کیا کہتی ہے بی بی۔ تجھے کیا اعتراض ہے اس انہونی پر؟‘‘

’’مجھے؟‘‘ تاج بی بی نے گھبرا کر میاں نذرو اور پھر سلیم کی طرف دیکھا جو اسے سرد سی نظروں سے تک رہے تھے۔ ’’مجھے کیا اعتراض ہوگا بابا جی۔ جو فیصلہ کرنا ہے سکینہ کے چاچا اور سلیم پتر نے کرنا ہے۔‘‘

’’مطلب یہ ہے کہ تجھے اس نکاح پر کوئی اعتراض تو نہیں ناں؟‘‘

’’میں کیا کہہ سکتی ہوں جی؟‘‘ تاج بی بی نے بیچارگی سے کہا اور سر جھکا لیا۔

’’ہاں۔ تو کیا کہے گی بیچاری۔ تیری زبان پر تو بیوگی نے تالا ڈال رکھا ہے۔ بولے گی تو بے گھر ہو جائے گی اس عمر میں۔ اپنا کیا ہے تیرے پاس‘ سوائے سکینہ کے۔۔۔‘‘ درویش نے طنز بھری نگاہوں سے میاں نذرو اور سلیم کی جانب دیکھا جنہوں نے سر جھکا لئے تھے۔

’’آپ ہماری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں بابا۔‘‘ سلیم نے آہستہ سے کہا۔ ’’لوگ کیا کہیں گے۔ برادری کیا کیا باتیں نہ بنائے گی؟ ہم کس کس کا منہ بند کرتے پھریں گے۔‘‘

’’باقی سب کی فکر چھوڑ۔ صرف اپنا منہ بند کر لے۔‘‘ درویش نے اس کی جانب انگلی اٹھائی۔ ’’تو نہ چاہے گا تب بھی یہ نکاح تو ہوگا۔‘‘

’’کوئی زبردستی ہے؟‘‘ سلیم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

’’نہیں۔‘‘ درویش مسکرایا۔ ’’زبردستی نہیں۔ فیصلہ ہے اس کا۔‘‘ اس نے آسمان کی جانب دیکھا۔ ’’اور اس کے فیصلے تیرے میرے چاہنے سے نہیں بدلتے۔ تو زور لگا کر دیکھ لے۔ ہوگا وہی جو اس کی مرضی ہے۔‘‘

’’ابا۔ اٹھ جا۔ چلیں اب۔ بہت ہو گئی۔ چل تائی۔ سکینہ کو ساتھ لے اور گھر چل۔‘‘ سلیم نے اچانک اپنی جگہ چھوڑ دی۔

میاں نذرو نے اس کی جانب دیکھا۔ پھر دوپٹے میں منہ چھپائے بیٹھی آنسو بہاتی تاج بی بی پر نگاہ ڈالی۔ آخر میں اس کی نظر سر جھکائے بیٹھی سکینہ پر جم گئی۔ چند لمحے وہ انگلیاں مروڑتی سکینہ کو دیکھتا رہا۔ پھر حافظ عبداللہ کی طرف نگاہ اٹھائی، جو اپنے جلے ہوئے ہاتھ کو گھور رہا تھا۔

’’ابا۔۔۔‘‘ سلیم نے اس کا شانہ ہلایا۔

میاں نذرو نے آہستہ سے اس کا ہاتھ شانے سے ہٹا دیا اور درویش کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’بابا۔ آپ نے فیصلہ تو سنا دیا مگر اب تک حافظ عبداللہ سے نہیں پوچھا کہ اس کی کیا مرضی ہے؟‘‘

’’تو اب پوچھ لیتے ہیں اللہ والیا۔‘‘ درویش نے حافظ عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ’’کیوں حافظ۔ تجھے سکینہ سے نکاح منظور ہے یا نہیں؟ دل سے جواب دینا۔ کوئی زبردستی ہے نہ دباؤ۔ تو اپنے فیصلے میں آزاد ہے۔‘‘

’’بابا۔‘‘ حافظ عبداللہ نے ایک نظر سکینہ پر ڈالی جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نجانے کیا تھا کہ حافظ عبداللہ ان میں کھو کر رہ گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس نے سر جھکا لیا۔ ’’میں خود کو اس قابل نہیں پاتا۔‘‘

’’سیانا نہ بن۔‘‘ درویش نے اسے جھڑکی سی دی۔ ’’جو نعمت اللہ تجھے دے رہا ہے اس کا کفران کر رہا ہے۔ شرم کر شرم۔‘‘

’’بابا۔۔۔ میں۔۔۔‘‘ حافظ ہکلا کر رہ گیا۔

’’سکینہ۔ پگلئے، یہ تو بڑا بزدل نکلا۔ ڈرتا ہے۔ امتحان سے نہیں ڈرا۔ نتیجے سے ڈر گیا۔‘‘ درویش نے سکینہ کی جانب گردن جھکائی۔ ’’اب بول۔ کیا کرے گی تو؟‘‘

’’کچھ نہیں بابا۔‘‘ سکینہ نے بڑے سکون سے کہا۔ ’’میں نے کہا ناں۔ مجھے جس نے ایک بار چھو لیا، وہی میرا صاحب ہے۔ یہ میرے قابل نہیں، بات یہ نہیں۔ اصل میں، میں ان کے قابل نہیں ہوں۔ یہ مجھے نہ اپنائیں۔ ان کی مرضی۔ میں ساری زندگی ان کے نام پر بیٹھ کر گزار دوں گی۔ لوگوں کے سائیں پردیس بھی تو چلے جاتے ہیں بابا۔‘‘

’’یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟‘‘ حافظ عبداللہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

’’ٹھیک کہہ رہی ہوں حافظ صاحب۔‘‘ اس کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ ابھری۔ ’’میں نے آپ کا رنگ ڈھنگ، آپ کا نام نسب، آپ کا خاندان اور مال و دولت نہیں دیکھی۔ آپ نے یہ سب کچھ دیکھا۔ فیصلہ آپ کا رہا۔ آپ نے مجھے ٹھکرا دیا مگر میں نے آپ کو اپنا لیا ہے۔ اپنا مان لیا ہے۔‘‘

’’آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ‘‘ حافظ کا لہجہ بھرا گیا۔ ’’میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو کوئی سکھ دے سکوں۔ لوگوں کے دیے ہوئے پر دو وقت کی روٹی چلتی ہے۔ مسجد کے حجرے میں رہتا ہوں۔ آپ نازوں کی پلی میرے ساتھ رُل جائیں گی۔ ‘‘

’’رُل جانے دیجئے مجھے۔ میں مرضی سے رُل جانے کو تیار ہوں۔ آپ مجھے نہ رُلنے پر مجبور کرنے والے کون ہوتے ہیں؟‘‘ سکینہ کی آواز ڈوب گئی۔

’’بابا۔ ‘‘ اچانک چوہدری حسن دین نے درویش کی جانب دیکھا۔ ’’مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ ‘‘

’’ہاں ہاں۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ تو بھی بول۔ مجھے پتہ ہے تو اچھا ہی بولے گا۔ بول۔ ‘‘

’’اگر بات اتنی ہی سی ہے تو۔۔۔ ‘‘ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اس میں سے ایک چابی نکالی اور دری پر رکھ دی۔ ’’یہ میرے آبائی مکان کی چابی ہے۔ میں ابھی اسی وقت یہ مکان اور اپنے چار کھیت جو اس مکان کے ساتھ جڑے ہیں حافظ عبداللہ کے نام کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے اب انہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ ‘‘

سب لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سلیم کا حال سب سے برا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے۔

’’یہ کی ناں پگلوں والی بات۔ ‘‘ درویش قلقاری مار کر ہنسا۔ ’’اب بول حافظ۔ اب کیا کہتا ہے۔ اب تو تو بھی ساہوکار ہو گیا۔ اب کیسے ہچر مچر کرے گا؟‘‘

’’بابا۔ ‘‘ حافظ عبداللہ کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ درد کی ایک لہر آنسوؤں میں بھیگ کر پلکوں سے اتری اور رخساروں پر پھیل گئی۔ وہ بایاں ہاتھ چہرے پر رکھ کر سسک پڑا۔

’’مبارک ہو سکینہ۔ تیرا پگلا پن کام آ گیا۔ ‘‘ درویش نے مسکراتے ہوئے سکینہ کی جانب دیکھا۔ وہ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ کر ہولے سے ہنس دی۔

’’پگلے۔ اٹھا لے یہ رسید۔ اس پر قبولیت کے دستخط ہو گئے ہیں۔ ‘‘ درویش نے چابی کی طرف اشارہ کیا تو چوہدری حسن دین نے نفی میں سر ہلایا۔

’’نہیں بابا۔ میں نے خالی خولی صلح نہیں ماری تھی۔ یہ سب اب حافظ۔۔۔ ‘‘

’’پتہ ہے۔ پتہ ہے۔ ‘‘ درویش نے چابی اٹھا کر اس کی جیب میں ڈال دی۔ ’’تو نے جس نیت سے کہا تھا وہی تو قبول ہوئی ہے پگلے۔ رہے یہ دونوں۔ تو ان کے لئے میرا اللہ اور اس کا پیارا حبیب ﷺ کافی ہیں۔ ‘‘

چوہدری حسن دین خاموش ہو گیا۔

’’ہاں بھئی چھوٹے میاں۔ اب کیا خیال ہے تیرا؟‘‘ درویش نے سلیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواب میں وہ خاموشی سے اٹھا اور ایک طرف سر جھکا کر جا بیٹھا۔

’’بابا۔‘‘ چوہدری حسن دین کی آواز پر وہ سب ایک دم چونکے۔ ’’اگر اجازت ہو تو میں حافظ عبداللہ کے لئے میاں نذرو سے سکینہ بیٹی کا ہاتھ باقاعدہ مانگ لوں۔‘‘

’’تو بھی مانگنا چاہتا ہے چوہدری۔‘‘ درویش بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ ’’مانگ لے۔ مانگ لے۔ تو بھی نام لکھوا لے۔ جلدی کر۔‘‘

اور چوہدری حسن دین نے آگے سرک کر اپنی اچکن کا پلہ میاں نذرو کے سامنے پھیلا دیا۔ ’’میاں۔ اپنی بیٹی میرے حافظ صاحب کے لئے میری جھولی میں ڈال دے یار۔‘‘

’’اس کا اختیار میری بھرجائی کو ہے چوہدری۔‘‘ میاں نذرو نے تاج بی بی کی طرف اشارہ کر دیا۔

چوہدری نے اس کی طرف رخ کیا تو تاج بی بی نے گردن گھما کر نم آنکھوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ ’’سلیم پتر۔ تیری بہن کا ہاتھ مانگ رہے ہیں چوہدری صاحب۔ کیا ہاں کر دوں بیٹا؟‘‘

’’تائی۔‘‘ سلیم اٹھ کر آیا اور تاج بی بی سے لپٹ گیا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

’’واہ بھئی واہ۔ آج تو یہاں سب ہی اللہ والے اکٹھے ہو گئے۔‘‘ درویش جھومتے ہوئے بولا۔ ’’آج تو سب کے اندر دھوئے جا رہے ہیں۔ سب کا میل نکالا جا رہا ہے۔ واہ میرے مالک۔ آج تو کیا دکھانا چاہتا ہے؟‘‘ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

’’میری ایک درخواست ہے چوہدری صاحب۔‘‘ حافظ عبداللہ نے جھجکتے ہوئے چوہدری حسن دین سے کہا۔

’’آپ حکم دیں حافظ صاحب۔ درخواست کیوں کرتے ہیں آپ۔‘‘ وہ بڑے خلوص سے بولا۔

’’اگر یہ بات طے ہو ہی گئی ہے تو میں چاہوں گا کہ نکاح بڑی سادگی اور خاموشی سے ہو۔ کوئی ہلا گلا نہ کیا جائے۔‘‘

’’مگر۔۔۔‘‘ سلیم نے کہنا چاہا۔

’’حافظ صاحب ہمارے سر کے صاحب ہیں سلیم پتر۔ یہ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی کرو۔‘‘ میاں نذرو نے سلیم کی جانب دیکھ کر کہا۔ ’’اگر ہم اسے روایتی شادی کے طور پر کریں گے تو شرعی پابندیوں کا تماشا ضرور بنے گا اور میرا خیال ہے حافظ صاحب چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ حافظ عبداللہ نے نظر اٹھائی۔ ’’میرا یہی مطلب تھا۔‘‘

”تو ٹھیک ہے۔“ چوہدری حسن دین نے دخل دیا۔ ”اگر معاملہ اسی طرح توڑ چڑھتا ہے تو دیر کس بات کی۔ ابھی نکاح پڑھاؤ اور دھی رانی کو وداع کر دو۔“

”اتنی جلدی اور اس حالت میں؟“ اب کے تاج بی بی بولی۔

”ارے بہن میری۔ نیک کام میں دیر کی جائے تو شیطان سو سو حیلے رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں داج وری کا جھگڑا تو ہے کوئی نہیں۔ اللہ کا دیا میرے پاس حافظ صاحب کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ میں تو کہتا ہوں بابا شاہ مقیم کی دعاؤں کی چھاؤں میں یہ کام آج ابھی کر کے سرخرو ہو جاؤ۔“

بابا شاہ مقیم کا نام آیا تو سب کے منہ بند ہو گئے۔ حافظ عبداللہ کے سر پر چوہدری حسن دین نے اپنا پٹکا ڈالا اور سکینہ کا گھونگھٹ نکال کر اس کی ماں کے پاس بٹھا دیا گیا۔ حافظ عبداللہ نے اپنا نکاح خود پڑھایا۔ حق مہر کی ادائیگی اسی وقت چوہدری حسن دین نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتار کے کر دی۔ حافظ عبداللہ نے خود سکینہ کو انگوٹھی پہنائی۔

نکاح ہو گیا تو درویش نے مبارک مبارک کا شور مچا دیا۔

”لاؤ بھئی لاؤ۔ مٹھائی لاؤ۔ بابا شاہ مقیم انتظار میں ہو گا۔ چلو چوہدری۔ سب کا منہ میٹھا کراؤ بھئی۔“ وہ بچوں کی طرح خوش تھا۔ سب سے پہلے اس نے مٹھائی کا ٹکڑا اٹھا کر سکینہ کے منہ سے لگایا۔ پھر حافظ عبداللہ کو برفی کھلائی۔ اس کے بعد ہاتھ چوہدری حسن دین کے آگے پھیلا دیا۔

”لاؤ چوہدری۔ میرا حصہ؟“

”بابا“ چوہدری حسن دین حیرت سے بولا۔ ”آپ کا حصہ کیسا؟ یہ سب آپ ہی کا تو ہے۔“ اس نے مٹھائی کا ٹوکرا درویش کے آگے کر دیا۔

”نہیں بھائی۔ میرا حصہ دیتا ہے تو دے۔ ورنہ میں چلا۔“ وہ جیسے ناراض ہو گیا۔

چوہدری حسن دین نے جلدی سے ایک بڑا گلاب جامن اٹھا کر درویش کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میرے پگلے کا حصہ بھی دے۔“ اس نے دوسرا ہاتھ آگے کر دیا۔

”پگلا؟“ چوہدری حسن دین کے ساتھ باقی سب بھی حیران ہوئے۔ ”وہ کون ہے بابا؟“

”تجھے اس سے کیا کہ وہ کون ہے؟ تو اس کا حصہ دے دے۔ لا جلدی کر۔“

چوہدری حسن دین نے اس کی ناراضگی کے ڈر سے فوراً ہی دوسرا گلاب جامن اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

درویش ایک دم پلٹا اور یوں تیز تیز قدموں سے مزار کی جانب چل دیا جیسے وہ ان میں سے کسی کا واقف ہی نہ ہو۔ پھر مزار کے اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

سکینہ اور حافظ عبداللہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور ان کے سر جھک گئے۔ خاموشی۔ سناٹا۔ چُپ۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ انہیں صرف اپنے اپنے دل دھڑکنے کی صدا سنائی دے رہی تھی اور بس۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب طاہر، ملک بلال اور اس کے چند ملازم بابا شاہ مقیم کے مزار کے باہر پجارو سے اترے۔

اگر دس پندرہ منٹ پہلے آتے تو وہ حافظ عبداللہ، سکینہ اور باقی سب لوگوں سے بھی مل لیتے۔ نکاح کے فوراً بعد جو درویش مزار کے اندر گیا تو پھر باہر نہ آیا۔ وہ کچھ دیر اس کا انتظار کرتے رہے۔ پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ جلد باہر نہ آئے گا تو باہم مشورے سے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ سب لوگ پہلے نور پور چلیں۔ وہاں چوہدری حسن دین کے ہاں قیام کیا جائے۔ آج کا باقی دن اور آنے والی رات وہاں گزاری جائے۔ اگلے دن وہ سکینہ کو ساتھ لے کر سائیاں والے کو لوٹ جائیں گے۔ دو دن بعد چوہدری حسن دین سکینہ کو باقاعدہ جا کر سائیاں والا سے واپس نور پور لے آئے گا۔

تانگے میں وہ سب لوگ کسی نہ کسی طرح پھنس پھنسا کر بیٹھ گئے اور ایک چھوٹی سی بارات کی شکل میں نور پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

برگد تلے بچھی دریاں دیکھ کر ملک بلال نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا کیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دونوں کمرے دیکھے۔ کوئی نہ ملا تو وہ سب مزار کی طرف چلے۔

مزار کے باہر رک کر طاہر نے کھسہ اتارا۔ پھر کرتے کی جیب سے رومال نکال کر سر پر باندھا۔ ملک نے اپنی ٹوپی سر پر درست کی۔ ملازموں نے تب تک گاڑی سے اجناس کی دو بوریاں اور مٹھائی کا ٹوکرا اتار لیا تھا۔ مزار کا دروازہ اندر سے بند پا کر وہ رک گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ ملک کچھ کہتا، ایک دم دروازہ کھلا اور درویش ان کے سامنے آ گیا۔

”آ گیا پگلے۔“ اس نے اپنی چمکدار آنکھوں سے طاہر کی جانب دیکھا۔

طاہر جیسے مسحور ہو گیا۔ اس کی زبان سے کچھ نکلا نہ ہونٹ ہلے۔ وہ تو بت بنا درویش کی آنکھوں میں گم ہو گیا

تھا۔

’’بابا۔‘‘ ملک نے کہنا چاہا۔ ’’یہ میرے چھوٹے مالک۔ ۔ ۔ ‘‘

’’جانتا ہوں۔‘‘ درویش نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ’’تو یہیں رک ابھی۔ اور تو آ جا میرے ساتھ۔‘‘ اس نے طاہر کا ہاتھ تھام کر اسے اندر کھینچ لیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ ملک اور باقی سب لوگ منہ پھاڑے رہ گئے مگر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کہتا یا اندر جانے کی کوشش کرتا۔

طاہر اپنے حواس سے بیگانہ کسی بے وزن شے کی طرح درویش کے ساتھ کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی لفظ ریت اڑا رہا تھا۔ ’’پگلے۔ پگلے۔ پگلے۔‘‘

درویش اسے لئے ہوئے بابا شاہ مقیم کے سرہانے اسی جگہ آ رکا جہاں حافظ عبداللہ بیٹھا کرتا تھا۔

’’بیٹھ جا۔‘‘ درویش نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

طاہر کسی معمول کی طرح اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

’’بابا کو سلام کر لے۔‘‘ پیار سے درویش نے کہا تو وہ چونکا۔ حواس میں آ گیا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے بابا شاہ مقیم کے مزار کی جانب نظر جمائی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر قبر کو چھو لیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگائیں اور دعا میں محو ہو گیا۔ چند منٹ بعد آمین کہتے ہوئے اس نے ہاتھ چہرے پر پھیرے اور درویش کی جانب متوجہ ہوا جو سر جھکائے آنکھیں بند کئے جیسے مراقبے میں گم تھا۔

طاہر کا جی چاہا اس پُرسکون چہرے کو دیکھتا رہے۔ اسے درویش کے چہرے میں عجیب سا سحر دکھائی دے رہا تھا۔ دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسلنے والا سحر۔ جس کی لذت دل کو درد سہنے پر اکسائے۔ رگ و پے میں سرور بن کر تیر جانے والا درد۔ اس کا دل ہولے ہولے جیسے آہیں بھرنے لگا۔ وہ اس کیفیت میں ڈوب جانے کو تھا کہ درویش کی آواز نے اس کی سماعت میں خوشبو اتار دی۔

’’عشق کا جام ہونٹوں تک نہیں پہنچا۔ یہی دُکھ لئے پھرتا ہے ناں تو؟‘‘ آہستہ سے درویش نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

طاہر ان سرخ سرخ ڈوروں سے لبریز آنکھوں کی چمک سے خیرہ ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کانپے۔ آواز نہ نکلی۔ نظر میں غبار سا پھیل گیا۔ درویش کا دمکتا چہرہ اس کی بصارت کے حلقے میں دھندلا گیا۔

’’کوئی ان چھوا تجھے چاہے۔ یہی تمنا تجھے کو بکو خوار کرتی پھرتی ہے ناں اب تک۔‘‘

’’بابا۔‘‘ بمشکل طاہر کے لبوں سے نکلا اور اس سرگوشی کے بعد وہ بے زبان ہو گیا۔ کوشش کے باوجود کچھ اور نہ

کہہ سکا۔ حلق میں اُگتے کانٹوں کا درد پیاس میں شدت پیدا کرتا چلا گیا۔

”پگلا ہے تو۔“ درویش اس کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا۔ ”شرط لگا رکھی ہے کہ اس سے عشق کرے گا جو پہلے تجھ سے عشق کرے جو پہلے تجھے چاہے۔ جس نے تجھ سے پہلے کسی کو نہ چاہا ہو۔ اَن چھوا ہو۔ جس کے خیالوں میں سب سے پہلے تیرا عکس ابھرا ہو۔ تو خود کسی کے لئے ایسا کیوں نہیں بن جاتا۔ اَن چھوا۔ سب سے پہلا تصور۔ سب سے پہلا خیال۔ سب سے پہلا عکس۔“

طاہر بے جان بُت کی طرح سن رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا۔ بولنے سے معذور نہیں تھا۔ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف سننا چاہتا تھا۔ اس پر ادراک کے در وا ہو رہے تھے۔ پرت کھل رہے تھے۔ حقیقتیں بے نقاب ہو رہی تھیں۔ اس بے حجابی میں ایک اور ہی لطف تھا۔ ایک اور ہی مزا تھا جو اس کو بے صدا کئے ہوئے تھا۔

”عشق شرطوں سے نہیں کیا جاتا۔ عشق تو اس سے بھی ہو جاتا ہے جو ہر رات کسی نئے مرد کا بستر بنتی ہے مگر جو اس پر عاشق ہوتا ہے‘ اسے صرف وہ نظر آتی ہے‘ اس کے گاہک نظر نہیں آتے۔ وہ بستر بھی نظر نہیں آتا جس پر پڑی سلوٹیں شمار نہیں ہو پاتیں۔ اس کے لئے تو وہ اَن چھوئی ہو جاتی ہے۔ عشق اسے ایسا بینا کرتا ہے کہ اس کے سوا سب کچھ دِکھنا ختم ہو جاتا ہے۔ جانتا ہے کیوں؟“

درویش رکا۔ طاہر کی آنکھوں میں سوال ابھرا‘ زبان نہ ہلی۔ تب جواب نے پر کھولے۔

”اس لئے کہ عشق کا پہلا حرف عین‘ عاشق صادق پر نازل ہو جاتا ہے۔ عین‘ عبادت۔ عشق کا پہلا حرف عین‘ عبادت سے منور ہے۔ اور عبادت کیا ہے؟ عجز۔ عبودیت۔ عشق کا بندہ عاجز ہو جاتا ہے۔ عجز نہ ہو تو عبادت نہیں ہو سکتی۔ عجز نہ ہوتا تو عشق کا پہلا حرف نہ ہوتا۔ وہ جو سب سے پہلا عشق کرنے والا ہے ناں۔“ درویش نے شہادت کی انگلی چھت کی طرف اٹھا دی۔ ”اس نے جب آدم میں عشق کا عین ودیعت کیا تو ایک ایسی صفت کی شکل میں کیا‘ جسے اس نے اپنے لئے ممنوع قرار دے دیا۔ عجز۔ عبودیت۔ یہ آدم کے خمیر میں ڈالا۔ خود تکبر کے تخت پر بیٹھا اور استکبار کو آدم کے لئے شجر ممنوعہ قرار دے دیا۔ آدم کو بندہ بنایا۔ اسے عبد کیا۔ اپنا عبد۔ عبداللہ۔ عین‘ عشق کا پہلا حرف۔ عبد میں عجز ہو گا تو وہ عبادت کے لئے عبودیت کے مرتبے پر فائز ہو گا اور عبادت جب عجز سے عبارت ہوتی ہے تو عشق کا پہلا حرف سمجھ میں آتا ہے پگلے۔ عبادت کر۔ عجز میں ڈوب کر۔ جیسے۔۔۔“

درویش خاموش ہو گیا۔

طاہر کا سانس سینے میں رک سا گیا۔ بیتابی نے اسے شدت سے جکڑ لیا۔

”کہتے رہیے بابا۔“ وہ نشے میں ڈوبی آواز میں بولا۔ اس نے پورا زور لگا دیا تب جا کر وہ یہ چند الفاظ کہہ پایا

تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی طاقت لڑکھڑا رہی ہو۔ بے خود ہو کر اپنا آپ چھوڑ گئی ہو۔

”جیسے۔۔۔“ درویش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کسی کو چاند کے داغ دکھائی نہ دیے۔ اپنا عجز یاد رہا۔ چاند کا گرہن نظر نہ آیا۔ اپنی عبادت کے آگے سب کچھ ہیچ لگا۔ یاد آیا کچھ؟“

طاہر کے دماغ میں ریگستان سا جاگا۔ تصور میں امبر اور قمر کے ہیولے ابھرے اور معدوم ہو گئے۔

”ہاں بابا۔“ وہ شرابیوں کے انداز میں جیسے کسی کنویں کی تہہ سے بولا۔ ”یاد آ گیا۔“

”عشق کا پہلا حرف۔ عین عبادت۔ یاد رکھنا۔ عبادت میں عجز لازم ہے۔ عجز نہ ہو تو عبادت نہیں ہوتی۔ عجز نہ ہو تو انسان کو خود پر عبد کے بجائے معبود ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اپنے آپ کو چاہنا تو اس متکبر کے لئے ہے اور بس۔ کسی اور کے لئے یہ روا نہیں ہے۔ اس نے اپنے نور کو خود چاہا۔ اپنے نور سے عشق کیا۔ اپنے نور کو اپنا حبیب بنایا۔ اپنا محبوب بنایا۔ پھر ساری مخلوق کو اپنے حبیب ﷺ سے عشق کا حکم دیا۔ کہا‘ جو مجھے پانا چاہے‘ وہ میرے حبیب ﷺ کو چاہے۔ جو اس تک جانا چاہے۔ اسے اس کے حبیب ﷺ کا منظورِ نظر ہونا پڑتا ہے۔ اس وسیلے کے بغیر وہ ہاتھ نہیں آتا۔۔۔ اور جو اس کی ”اپنے آپ کو چاہنے کی صفت“ سے متصف ہونا چاہتا ہے ناں‘ اس پر استکبار کا رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ تکبر سے جڑتے ہی انسان مشرک ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اس کے ہاں ہر گناہ کی معافی ہے‘ شرک کی معافی نہیں ہے پگلے۔“ درویش نے اس کی جانب تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھائی۔

”بابا۔“ طاہر ساری جان سے لرز کر رہ گیا۔

”ہاں۔“ درویش نے سر ہلا کر کہا۔ ”پگلا بن کر رہ۔ سیانا بننے میں جان کانٹوں پر گھسیٹی جاتی ہے۔ پگلے پن میں معافی مل جاتی ہے۔ آسانی پگلا بن کر رہنے میں ہے۔ سیانا وہ ہے جو چاہے جانے کی خواہش کا اسیر ہو جائے۔ پگلا وہ ہے جو کسی کو چاہنے لگے۔ عبد ہو جائے۔ ایک سیانا حافظ عبداللہ ہے جو چاہا گیا۔ ایک پگلی سکینہ ہے جس نے حافظ عبداللہ سے عشق کر لیا۔ اس کی عبادت میں محو ہو گئی۔“

”بابا۔ عبد کی عبادت۔۔۔؟“ طاہر نے حیرت سے کہا۔

”نہ نہ پگلے۔“ درویش نے کانپ کر کانوں کو چھوا۔ ”عبادت تو صرف اس کی ہے جو معبود ہے۔ مگر مجاز میں خدائی بھی تو چھپا رکھی ہے اس نے۔ خود ہی تو کہتا ہے کہ اگر اپنے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت اپنے مجازی خدا کو سجدہ کرتی۔ کہتا ہے کہ ماں کو ایک بار محبت سے دیکھنے کا ثواب بیٹے کو ایک حج مقبول کے برابر دیتا ہوں۔ عبادت نہیں کی مگر کی ہے۔ حج نہیں کیا مگر ہو گیا۔ یہ استعارے ہیں۔ تشبیہیں ہیں۔ مثالیں ہیں۔ انہیں اسی طرح لینا چاہئے۔ عجز پیدا ہوتا ہے عبادت کی طرف رغبت سے۔ پگلی سکینہ نے حافظ عبداللہ کے سامنے عاجزی سے اقرار کیا کہ

وہ اسے چاہتی ہے۔ سیانا حافظ عبداللہ اکڑ گیا کہ وہ اس کے قابل نہیں ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اس سیانے کو سمجھایا کہ پگلا بن۔ سیانا نہ بن۔ اللہ کی نعمت کا کفران نہ کر۔ شکر ہے اسے سمجھ آ گئی۔ اب سکینہ کو رغبت کے لئے راستہ مل گیا۔ عبادت میں عجز کے لئے چن لیا اس نے حافظ عبداللہ کو۔ وہ اس کی خدمت کرے گی اور عبادت کا ثواب پائے گی۔ یہ ہے عشق کے عین کی حقیقت۔‘‘

’’بابا۔‘‘ طاہر کے اندر چراغ سے جل اٹھے۔

’’اسی لئے کہتا ہوں تو پگلا ہے۔‘‘ درویش نے اس کی جانب پیار سے دیکھا۔ ’’اتنی جلدی پگلے ہی بات سمجھ بھی لیتے ہیں اور مان بھی لیتے ہیں۔‘‘

’’اور عشق کا دوسرا حرف۔۔۔‘‘

’’شین کی بات کر رہا ہے۔‘‘ درویش ہولے سے ہنسا۔ ’’ابھی نہیں۔ پہلے عین کو تو دیکھ لے۔ جان لے۔‘‘

’’کیسے بابا؟‘‘ طاہر اتاولے پن سے بولا۔

’’صبر پگلے۔ صبر۔‘‘ درویش نے اس کے گال کو چھوا۔ ’’دکھائیں گے تجھے۔ چند دن ٹھہر جا۔ ابھی لوٹ جا۔ تیرے گھر میں بھی ایک پگلی ہے۔ ابھی اس کے پاس لوٹ جا۔ تجھے چند دن بعد دکھائیں گے کہ عین کے پرت کیسے کھلتے ہیں؟‘‘

’’تب تک میرا کیا حال ہو جائے گا بابا؟‘‘ طاہر نے درویش کے دونوں ہاتھ تھام کر سینے سے لگا لئے۔ اس کا دل یوں دھک کر رہا تھا جیسے کوئی دھان کوٹ رہا ہو۔

’’اچھا ہے۔‘‘ درویش نے مسکرا کر کہا۔ ایک اطمینان اس کی آنکھوں سے جھلکا۔ ’’بہت اچھا ہے۔ جوت جگ گئی ہے۔ اسے انتظار کی ہوا دے۔ اس الاؤ کو بھڑکنے دے۔ اس پر ہاتھ تاپ۔ اپنی آگ پر ہاتھ تاپنے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے پگلے۔ اپنے الاؤ پر ہاتھ تاپ۔ کباب ہونے سے پہلے کی سوندی سوندی خوشبو لے۔ اشتہا کو بڑھنے دے۔ خوب چمک جائے تو بھوک لذت دیتی ہے۔۔۔ لذت۔۔۔‘‘ درویش نے سسکاری بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ’’لذت سے عشق کا شین شروع ہوتا ہے پگلے۔ عشق کا شین۔۔۔‘‘

درویش ایک سلگتی ہوئی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

طاہر کے سارے جسم میں پھریریاں سی چکرا رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا ابھی کے ابھی اس کے جسم میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں گی۔ وہ درویش کے چہرے میں گم ہو کر رہ گیا جہاں زردی چھا گئی تھی۔ سرسوں کے پھولوں جیسی شفق کی ابتدا جیسی۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ تب آہستہ سے درویش نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور بڑھ گئی تھی۔ طاہر اس سرخی کی لپک کو سہہ نہ سکا اور گھبرا کر نظر ہٹالی۔

’’ارے۔ میں تو بھول ہی گیا۔‘‘ اچانک درویش کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر قبر کے تعویذ پر رکھے دو میں سے ایک گلاب جامن اٹھایا اور ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ طاہر کی جانب دراز کر دیا۔ ’’لے۔ یہ تیرا حصہ ہے۔‘‘

طاہر نے بسم اللہ کہہ کر ایک گلاب جامن اٹھالیا۔

’’کھالے۔ یہ بابے شاہ مقیم کا تبرک ہے جو سکینہ اور حافظ عبداللہ کے ایک ہو جانے کی خوشی میں تیرے لئے آیا رکھا ہے۔‘‘

طاہر نے آہستہ آہستہ گلاب جامن کھانا شروع کیا۔ اسے لگا‘ اس نے ایسی لذیذ مٹھائی آج سے پہلے کبھی نہیں کھائی۔ جوں جوں وہ گلاب جامن حلق سے اتارتا گیا‘ اس کے جسم میں تیرتی بے چینی دم توڑتی چلی گئی۔ اس کے رگ و پے میں ایک سکون اور صبر سا پر پھیلاتا چلا گیا۔

’’اور یہ لے۔ اپنی پگلی کے لئے لے جا۔ یہ صرف اسی کو دینا۔ میں اپنا حصہ اسے بھجوا رہا ہوں۔‘‘ درویش نے دوسرا گلاب جامن ایک کاغذ میں لپیٹ کر اسے تھما دیا۔ طاہر نے سر سے رومال کھولا۔ کاغذ اس میں رکھ کر گانٹھ ماری اور کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

’’اب جا۔ باہر وہ بونے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ جا۔ اللہ تیرا اندر آباد رکھے۔‘‘ درویش نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

طاہر اٹھ کھڑا ہوا۔ قبر کے تعویذ کو پیروں کی طرف سے چھوا۔ درویش کی جانب جھکا تو اس نے ہاتھ اٹھایا اور اسے خم ہونے سے روک دیا۔

’’یہ صرف اس کا حق ہے۔‘‘ چھت کی جانب شہادت کی انگلی اٹھا کر مسکراتے ہوئے وہ بولا۔ ’’اس کے سوا کسی کے آگے سر جھکانا شرک ہے۔‘‘

سر اثبات میں ہلاتے ہوئے طاہر ایک دم سیدھا ہو گیا۔

’’اللہ حافظ بابا۔‘‘ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر آنکھیں جھکائیں۔

’’اللہ حافظ۔‘‘ درویش نے ہاتھ کھڑا کیا۔

طاہر الٹے پاؤں باہر نکلا۔ چوکھٹ پر ایک پل کو رکا پھر دروازے پر چلا آیا۔ پٹ کھلے تو باہر بیتابی سے ٹہلتا ملک بلال نظر آیا۔

طاہر نے باہر قدم رکھا۔ مگر نہیں۔ یہ طاہر تو نہیں تھا۔ یہ اس کا چھوٹا مالک تو نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ کوئی اور۔۔۔ جس کے چہرے پر زردی اور آنکھوں میں آگ سی آباد تھی۔ طاہر کا چہرہ ایک عجیب سے جلال کے ہالے میں دمک رہا تھا۔ یہ کیسی زردی تھی جس پر سرخیاں نثار ہو رہی تھیں۔ یہ کیسی آگ تھی جس میں خنکی کروٹیں لے رہی تھی۔

ملک بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ باقی کے ملازم بھی طاہر کی بدلی ہوئی حالت کو حیرت سے جانچ رہے تھے۔

''ملک۔ تم سب بھی سلام کر لو۔ میں گاڑی میں تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔'' طاہر کہہ کر پجارو کی طرف بڑھ گیا۔

ملک نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کا حوصلہ نہ ہوا۔ آہستہ سے وہ ملازموں کی جانب مڑا۔ پھر انہیں اجناس کی بوریاں اور مٹھائی کا ٹوکرا اٹھا لانے کا کہتے ہوئے وہ مزار کی طرف چل دیا۔ اس کے آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے قدم اس کے کسی سوچ میں ڈوبے ہونے کے غماز تھے اور اس سوچ کا تعلق صرف اور صرف طاہر کی موجودہ حالت سے تھا۔

☆

''کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' طاہر کمرے میں داخل ہوا تو صفیہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''ہاں۔'' طاہر مسکرایا۔ ''کیا ہوا میری طبیعت کو۔''

''ٹھیک نہیں لگتی۔'' وہ بیتابی سے اس کا ماتھا چھوتے ہوئے بولی۔ ''رنگ دیکھئے کیسا زرد ہو رہا ہے اور جسم بھی تپ رہا ہے۔'' اس نے اس کے رخسار پر ہاتھ کی پشت رکھ دی۔

''ارے نہیں۔ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔'' طاہر نے لاپروائی سے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ ٹھیک نہیں ہیں۔'' صفیہ بے قرار ہو رہی تھی۔ اس کی آواز میں فکر عود کر آیا۔ ''ٹھہریے۔ میں آپ کا ٹمپریچر چیک کرتی ہوں۔ ابھی پتہ چل جائے گا۔'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف لپکی۔ دراز کھولا۔ اس میں سے تھرمواسٹک نکالی اور واپس اس کی طرف آ گئی۔ طاہر تب تک بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔

صفیہ نے آتے ہی اسٹک اس کے ماتھے پر چپکا دی اور کسی ماہر نرس کی طرح رسٹ واچ پر ٹائم نوٹ کرنے لگی۔

طاہر نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک تو اسے یاد آ گیا کہ بابا نے صفیہ کے بارے میں پگلی کا لفظ استعمال کیا تھا اور دوسرے اسے علم تھا کہ صفیہ اس کے بارے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لے گی۔ جب تک اس کا اطمینان نہ ہو جائے وہ اپنا کام جاری رکھے گی۔

”ارے۔“ ایک منٹ بعد اسٹک ہٹا کر جب اس نے اس پر ٹمپریچر چیک کیا تو حیرت بھری آواز اس کے لبوں سے نکلی۔ ”یہ کیا؟“

”کیا ہوا؟“ طاہر نے نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ٹمپریچر تو نارمل ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ ”مگر جسم اب بھی گرم ہے آپ کا۔“ اس نے دوبارہ اس کی گردن چھو کر دیکھی۔

”کہہ تو رہا ہوں میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے یہ اسٹک خراب ہو گئی ہو۔“ وہ اب بھی یقین نہ کر رہی تھی۔ ”میں بازار سے تھرمامیٹر منگواتی ہوں۔“ اس نے اسٹک تپائی پر ڈالی اور قالین پر اکڑوں بیٹھ کر طاہر کے پاؤں سے کھسہ اتارنے لگی۔ ”آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لئے کوئی ہلکی سی گولی اور چائے لے کر آتی ہوں۔“

”پستول کی گولی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ طاہر نے اسے ستانے کے انداز میں کہا۔

تڑپ کر صفیہ نے اس کی جانب دیکھا۔ پھر اس کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ پا کر اس کا چہرہ نارمل ہو گیا۔ ”میں جانتی ہوں آپ مجھے ایسی باتوں سے دکھ دے کر خوش ہوتے ہیں طاہر۔ لیکن پلیز‘ کچھ اور کہہ لیا کیجئے۔ مجھے تھپڑ مار لیا کیجئے‘ اپنے بارے میں ایسی بات نہ کہا کیجئے۔“ سر جھکا کر وہ اس کی جرابیں اتارتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ طاہر ہنس پڑا۔

”جانتی ہوں۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ”آپ کا مذاق کسی دن میری جان لے لے گا۔ تب آپ کو یقین آئے گا کہ۔۔۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ جرابیں اور کھسہ بیڈ کے نیچے سرکا کر اس نے طاہر کے پاؤں دونوں ہاتھوں سے سہلائے‘ پھر اس سے پہلے کہ طاہر کچھ سمجھ پاتا اس نے اس کے دونوں پیروں کو باری باری چوم لیا۔

”ارے ارے۔“ اس نے پاؤں کھینچ لئے۔ ”یہ کیا دیوانگی ہے بھئی۔“ وہ گھبرا گیا۔

”عقیدت ہے یہ۔“ صفیہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ ”اس سے آپ مجھے کبھی مت روکئے گا طاہر۔“ وہ اٹھ گئی۔ ”میں آپ کے لئے ڈسپرین اور چائے لاتی ہوں۔“

”رکو۔“ طاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اپنا تحفہ تو وصول کر لو۔“

”یہ کیا ہے؟“ طاہر نے جیب سے نکال کر رومال کا گولہ صفیہ کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”کھول کر دیکھو۔“ طاہر نے کہا۔

صفیہ نے رومال کی گانٹھ کھولی۔ اندر سے کاغذ میں لپٹا ہوا خوشبو دیتا گلاب جامن نکلا تو اس نے حیرت سے طاہر کی جانب دیکھا۔

”بابا شاہ مقیم کے دربار کا تبرک ہے۔ وہاں کے درویش بابا نے خاص طور پر تمہارے لئے بھیجا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ یہ صرف تمہیں دوں۔ یہ ان کا اپنا حصہ ہے جو انہوں نے تمہارے لئے رکھ چھوڑا تھا۔“

”بسم اللہ۔“ صفیہ نے ادب سے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ”میں قربان اس تحفے کے۔“ ذرا دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں نمی سی چمک رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور قالین پر طاہر کے قدموں میں گھٹنے موڑ کر بیٹھ گئی۔

”لیجئے۔ ذرا اسے جھوٹا کر دیجئے۔“ اس نے گلاب جامن انگلیوں میں تھام کر طاہر کے ہونٹوں کی جانب بڑھایا۔

”اوں ہوں۔“ طاہر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اپنا حصہ وہاں کھا آیا ہوں۔“

”جانتی ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر میں اپنا حصہ آپ کے بغیر کیسے کھا سکتی ہوں۔ لیجئے۔ ذرا سا ہی لے لیجئے۔“

”مگر۔۔۔“ طاہر نے کہنا چاہا۔

”طاہر۔“ صفیہ نے گلاب جامن اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ”آپ اسے جھوٹا کر دیں گے تو میرا حصہ مجھ پر حلال ہو جائے گا۔ مجھے حرام کھانے سے بچانا آپ پر فرض ہے یا نہیں؟“ اور بے اختیار طاہر کے ہونٹ وا ہو گئے۔ اس نے ذرا سا گلاب جامن دانتوں سے کاٹ لیا۔

”شکریہ۔“ وہ کھل اٹھی۔ پھر اس نے ہاتھ واپس کھینچا اور بچوں کی طرح گلاب جامن کھاتی ہوئی اٹھ کر چل دی۔

”پگلی۔“ بے ساختہ طاہر کے دماغ میں درویش بابا کی آواز گونجی۔ اسے بے طرح صفیہ پر پیار آ گیا جو دروازے سے باہر قدم رکھ چکی تھی۔

اس کے جانے کے بعد طاہر بستر پر دراز ہو گیا اور ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے ذہن میں صبح کے واقعے کی فلم سی چلنے لگی۔ درویش کی ایک ایک بات اسے ازبر تھی۔ راستے بھر بھی وہ خاموش رہا۔ ملک بلال نے ایک دو بار کوئی بات کرنا چاہی مگر جب اس کی طرف سے کوئی خاص توجہ نہ ملی تو وہ بھی خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

حویلی پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور اب بستر پر لیٹا پھر انہی سوچوں میں ڈوب گیا جن سے رستے بھر اس کا دل اور دماغ الجھے رہے تھے۔۔

عشق کا فلسفہ آج ایک عجیب رنگ میں اس پر کھلا تھا۔ عشق کا ہر حرف اپنے اندر کیا وسعت رکھتا تھا' یہ تو اس کے لئے ایک اچنبھا تھا۔ ایک اسرار کا عالم تھا' جس میں اسے درویش نے داخل کر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ تھا اور درویش کی باتیں۔ ہر ہر بات ہشت پہلو تھی۔ وہ جتنا ان پر غور کرتا گیا' اس کا ذہن فراخ ہوتا چلا گیا۔ سوچوں میں روشنی پھیلتی چلی گئی۔ حیرت کا ایک جہان تھا' جو اس کے لئے اپنی باہیں پسارے اسے عشق کا مفہوم سمجھانے کے لئے جھوم رہا تھا۔ عین سے عاشق صادق۔ عین عجز سے عبادت' عبودیت اور عبد کے بعد اب عین سے عقیدت نے اس کی سوچوں کو اور بہت کچھ عطا کر دیا تھا۔ کہیں امبر اور قمر تھے تو کہیں حافظ عبداللہ اور سکینہ۔ اور کہیں صفیہ اور۔۔۔

صفیہ پر آ کر اس کا دماغ رک گیا۔ صفیہ۔۔۔ جس نے اسے عین عقیدت کا احساس دلایا تھا۔۔۔ اس کے ساتھ طاہر کا نام جوڑا جاتا یا سرمد کا؟ وہ الجھ کر رہ گیا۔ سرمد کے بقول وہ صفیہ کے لئے دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔ اور وہ خود صفیہ کو دل کے تخت پر جو مقام دے کر بٹھا چکا تھا' کیا وہ سرمد کے جذبے سے کمتر نہیں تھا؟ اس کے لئے کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہو گیا۔ درویش نے صفیہ کو پگلی اور اسے پگلا کہا تھا۔ یعنی ایک پگلی کے لئے ایک سیانا درکار تھا۔ کہیں وہ سیانا سرمد تو نہیں تھا؟ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔

اسی وقت صفیہ ایک منی ٹرے میں چائے کا کپ اور ڈسپرین کی گولیاں رکھے اندر داخل ہوئی۔ طاہر نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا جو مسکراتے ہوئے اس کے قریب آ چکی تھی۔

"کیا بات ہے طاہر؟" وہ جیسے اس کے دل تک پہنچ گئی۔ "دل گھبرا رہا ہے تو ڈاکٹر کو بلوا لیں۔" اس نے ٹرے تپائی پر رکھی اور اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا جو برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

"ارے۔" "اب بالکل ہی ٹھنڈا ہو گیا آپ کا جسم۔" وہ پریشانی سے بولی۔ "یہ ہو کیا رہا ہے؟" اس نے طاہر کی طرف تشویش سے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" طاہر نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "تم چائے دو مجھے۔ میرا خیال ہے' ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"چائے تو پی لیں آپ۔" اس نے کپ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ "مگر میں ڈاکٹر کو بلوا رہی ہوں۔ اسے چیک کر لینے دیجئے۔"

"کیا ضرورت ہے۔" طاہر نے اسے روکا۔ "میں نے کہا ناں' معمولی ٹھنڈ کا اثر ہے۔ چائے پینے سے دور ہو جائے گا۔ اگر فرق نہ پڑا تو پھر ڈاکٹر کو بلوا لیں گے۔"

"چلئے۔ یونہی سہی۔ آپ چائے پی کر آرام کریں۔ میں آپ کے لئے یخنی بنواتی ہوں۔" صفیہ نے کمبل

کھول کر اس کی ٹانگوں پر پھیلا دیا اور اس کی جانب فکر مندی سے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ کمرے میں لوٹی تو طاہر سینے تک کمبل اوڑھے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کے پاس آئی۔ آہستہ سے اس کا ماتھا چھو کر دیکھا۔ حرارت نارمل محسوس ہوئی تو بے اختیار اس کے لبوں سے ”یا اللہ تیرا شکر ہے“ کے الفاظ نکل گئے۔ اس نے جھک کر طاہر کی پیشانی کو ہلکا سا بوسہ دیا۔ لائٹ آف کی اور چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ دروازہ بیحد آہستگی سے بند کر کے جاتی ہوئی صفیہ کب جانتی تھی کہ طاہر اب بھی جاگ رہا تھا اور اس کے بوسے نے طاہر کی روح تک میں ایک سرشاری سی بھر دی تھی۔ سرمد کا خیال ایک دم اس کے دل و دماغ سے یوں محو ہو گیا جیسے اس کا کہیں وجود ہی نہ رہا ہو۔

☆

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔

عادل اور زبیدہ کی شادی ہو گئی۔ طاہر اور صفیہ خاص طور پر ان کی شادی میں شریک ہوئے۔ صفیہ بہت خوش تھی۔ گاؤں کی شادی اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ وہاں کے رسم و رواج اس کے لئے جہاں اچنبھے کا باعث تھے، وہیں دلچسپی بھی رکھتے تھے۔

زبیدہ کی رخصتی تک وہ دونوں ماسٹر محسن کے ہاں موجود رہے۔ پھر جب وہ اپنے ماں باپ، بھائی اور سہیلیوں کو آنسوؤں کے حوالے کر کے بلکتی ہوئی پیا کے گھر کو سدھار گئی تو اداس اداس صفیہ نم آنکھیں لئے طاہر کے ساتھ حویلی لوٹ آئی۔

رات وہ کتنی ہی دیر تک جاگتی رہی۔ اس کا جی چاہا وسیلہ خاتون سے بات کرے۔ وقت دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ اس وقت سو گئی ہوں گی، اس نے سوچا۔ پھر صبح ان سے بات کرنے کا خیال دل میں لئے وہ طاہر کے بازو پر سر رکھ کر سو گئی، جو آنکھیں موندے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔

صبح اٹھ کر اس نے سب سے پہلے وسیلہ خاتون کو فون کیا۔ وہ اس کی طرف سے فکر مند تھیں۔ جب اس نے انہیں اپنے بارے میں خیریت کا بتایا تو ان کی جان میں جان آئی۔ دوپہر کے قریب بیگم صاحبہ کا فون آ گیا۔ وہ، اعجاز اور ڈاکٹر ہاشمی اس وقت مدینہ منورہ میں تھے اور خوش تھے۔ طاہر نے ان کی واپسی کا جان بوجھ کر نہ پوچھا۔ ایسی مقدس جگہ سے لوٹ آنے کو کس کا جی چاہتا ہے؟ وہ ان سے واپسی کا پوچھ کر گستاخی کا مرتکب نہ ہونا چاہتا تھا۔ صفیہ اور طاہر کو بہت سی دعائیں دے کر انہوں نے فون بند کیا تو صفیہ کے ساتھ ساتھ طاہر کا موڈ بھی بہت اچھا ہو چکا تھا۔

”طاہر۔ آپ بتا رہے تھے کہ آپ کو پھر بابا شاہ مقیم کے مزار پر جانا ہے۔“ وہ موبائل تپائی پر ڈالتے ہوئے

بولی۔

’’ہاں۔ جانا تو ہے مگر کل۔‘‘ دن کا حساب لگاتے ہوئے اس نے بتایا۔

’’میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟‘‘ وہ اشتیاق سے بولی۔

’’تم؟‘‘ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

’’کیوں؟ کیا کوئی دقت ہے؟‘‘ اسے غور سے دیکھتے ہوئے صفیہ نے پوچھا۔

’’نہیں۔ دقت کوئی نہیں۔‘‘ طاہر نے صاف گوئی سے کہا۔ ’’دراصل بابا نے مجھے اکیلے آنے کو کہا تھا۔‘‘

’’اچھا اچھا۔‘‘ وہ مطمئن ہو گئی۔ ’’تو اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے۔ آپ اکیلے چلے جائیں مگر لوٹ جلدی آیئے گا۔ پھر ٹھنڈ نہ لگوا بیٹھیے گا۔‘‘

’’تمہیں برا تو نہیں لگا؟‘‘ طاہر نے اس کی جانب دیکھا۔

’’ارے۔‘‘ وہ ہنسی۔ ’’برا کیوں لگے گا۔ آپ نے کہہ دیا، میں نے مان لیا۔ بس۔‘‘

طاہر کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اتنا عجز۔ اتنی فرمانبرداری۔ اتنا خلوص۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

اسی وقت موبائل بول پڑا۔ طاہر نے جیب سے سیٹ نکالا اور سکرین پر امبر کا نمبر دیکھ کر جلدی سے بٹن دبا دیا۔

’’ہیلو سر۔ مارننگ۔ میں بول رہی ہوں امبر۔‘‘ دوسری طرف سے وہ چہکی۔

’’مارننگ۔ مارننگ۔‘‘ طاہر ہنسا۔ ’’کیا حال ہے لیڈی؟‘‘

’’بالکل ٹھیک سر۔ آپ سنایئے۔ کیسی گزر رہی ہیں چھٹیاں؟‘‘

’’فسٹ کلاس۔‘‘ وہ صفیہ کی جانب دیکھ کر بولا جو اس کے قریب کھڑی اشارے سے پوچھ رہی تھی کہ کس کا فون ہے۔

’’امبر کا فون ہے۔‘‘ طاہر نے ہولے سے بتایا۔

’’اچھا اچھا۔‘‘ صفیہ بھی مسکرائی اور اس کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر سر اس کے سر کے ساتھ جوڑ لیا۔ اب وہ بھی امبر کی باتیں سن سکتی تھی۔

’’کیسا جا رہا ہے آفس؟‘‘ طاہر نے پوچھا۔

’’میں نے آپ کو کسی قسم کی رپورٹ دینے کے لئے فون نہیں کیا سر۔‘‘ امبر نے خوش گفتاری سے کہا۔ ’’آپ کی رپورٹ لینے کے لئے کیا ہے۔‘‘

"وہ تو میں نے بتا دیا لیڈی۔" طاہر پھر ہنسا۔ امبر سے بات کرتے ہوئے اس کے ذہن میں درویش کا اس کے بارے میں "پگلی" کا لفظ گونج رہا تھا۔ وہ اسی تناظر میں اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ "تم سناؤ۔ تمہارے پروفیسر صاحب کیسے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک سر۔ THE POROUD کے معاملات میں میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔"

"مفت کام نہ لیتی رہنا ان سے۔ گھر کے مرغے کو دال برابر سمجھو گی تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں سر۔" امبر اس کے کمنٹ پر ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔ "آپ کی اس بات پر میں آپ کی چھٹی مزید کتنی ایکسٹنڈ کر دوں؟"

"ابھی پہلی چھٹی ختم ہونے میں تین دن باقی ہیں بھئی۔" طاہر نے جلدی سے کہا۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں سر کہ آج میرا موڈ بہت اچھا ہے فائدہ اٹھا لیجئے۔"

"تو پھر یہ بھی تم پر رہا کہ تم ہمیں اور کتنی چھٹی دے سکتی ہو۔" طاہر شگفتگی سے بولا۔

"اگر میری مرضی پر بات ٹھہری ہے تو سر آپ جب جی چاہے لوٹئے گا۔ آپ کے لئے کھلی آفر ہے۔"

"واقعی؟" طاہر نے حیرت سے پوچھا۔

"یس سر۔ جب جی چاہے آیئے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"مگر امبر۔۔۔"

"پروفیسر صاحب کو کالج سے تین ماہ کی چھٹی مل گئی ہے سر۔ اب میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ میں بھی کہوں اتنی نوازش کا سبب کیا ہے؟"

"شکریہ امبر۔" اچانک بیچ میں صفیہ بول پڑی۔ "آپ نے بہت اچھا کیا جو انہیں مزید کچھ عرصے کے لئے ٹینشن فری کر دیا۔"

"ارے۔ آپ بھی وہیں ہیں صفیہ جی۔" امبر کا موڈ اور خوشگوار ہو گیا۔ "بہر حال میں نے اکیلے سر کو نہیں، آپ کو بھی ان کے ساتھ مزید انجوائے کرنے کا وقت دیا ہے۔" اور صفیہ نے جھینپ کر سر پیچھے ہٹا لیا۔ "اوکے۔ آلویز بی ہیپی اینڈ بائی۔" امبر نے ہنستے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔

طاہر نے موبائل جیب میں ڈالا اور انگڑائی لی۔ ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور دروازے کی جانب چل پڑا۔

"میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھاؤں گا۔" کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

صفیہ اٹھی اور کرسی پر جا بیٹھی۔ ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔

امبر کی باتوں نے اس کا حال عجب کر دیا تھا۔ اس کا بدن ایک دم ٹوٹنے لگا۔ ایک دم تھکن نے گھیر لیا۔ وہ اپنی یہ حالت طاہر پر ظاہر نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ امبر کیا سمجھ رہی تھی، اسے اس کا احساس ہوا تو جذبات میں جوار بھاٹا سا اٹھا مگر وہ امبر کو کیا بتاتی کہ جب سے طاہر نے سرمد کی باتیں سنی تھیں اور اس کے ساتھ گھر لوٹا تھا، تب سے آج تک وہ دونوں ہر وقت ایک ساتھ ہوتے ہوئے بھی اتنے ہی دور تھے جتنا شادی سے پہلے۔

صبح کے نو بجے تھے جب مقررہ دن طاہر اکیلا ہی پجارو میں بابا شاہ مقیم کے مزار پر جا پہنچا۔ اس نے ملک یا کسی اور ملازم کو ساتھ نہ لیا۔ ہاں ملک بلال کو اتنا بتا دیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ساتھ ہی منع کر دیا کہ کوئی اس کے پیچھے نہ آئے۔

درویش اسے مزار کے باہر ہی مل گیا۔ وہ گاڑی سے اترا اور اس کے پاس چلا آیا۔

’’آ گیا پگلے۔‘‘ وہ اسے دیکھ کر معصومیت سے مسکرایا۔

’’جی بابا۔‘‘ اس نے ادب سے جواب دیا۔

’’چلیں؟‘‘ درویش نے پوچھا۔

’’ضرور بابا۔‘‘ یہ پوچھنے کو اس کا جی ہی نہ چاہا کہ کہاں جانا ہے؟ ’’مگر۔۔۔‘‘ اس نے مزار کی طرف دیکھا۔

’’سلام کرنا چاہتا ہے؟‘‘ درویش مسکرایا۔ ’’بابا شاہ مقیم وہاں۔۔۔‘‘ درویش نے مزار کی جانب اشارہ کیا۔ ’’اندر موجود نہیں ہے۔ کہیں گیا ہوا ہے۔ اینٹ روڑوں کو سلام کرنا ہے تو یہیں سے کر لے۔ کیا خیال ہے؟‘‘ وہ ہنسا۔ ’’آ جا۔ چلیں۔‘‘ اور وہ سر جھکائے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ان کا رخ نور پور گاؤں کی جانب تھا۔

گاؤں میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ لوگوں نے درویش کو سلام کیا۔ وہ جواب دیتا ہوا، طاہر کو ساتھ لئے نور پور کی اکلوتی مسجد پر چلا آیا۔ مسجد کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

درویش نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ اب وہ جہاں کھڑے تھے وہ ڈیوڑھی نما جگہ تھی جو نمازیوں کے جوتیاں اتارنے کے لئے تھی۔ اس کے بعد سامنے مسجد کا صحن اور اس کے بعد مسجد کی عمارت۔ صحن میں دائیں ہاتھ وضو خانہ بنا ہوا تھا۔ جس کے آخر پر طہارت خانے کے بعد چھوٹی سی کھوئی کے اوپر چرخی اور اس میں رسی سے بندھا چمڑے کا ڈول دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں ہاتھ حافظ عبداللہ کا حجرہ تھا، جس کی دیوار آگے کی جانب مسجد کے ساتھ جا ملی تھی۔ حجرے کی مسجد کے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ وا تھے۔

”پگلے۔“ درویش نے اپنے دائیں ہاتھ کھڑے طاہر کی طرف دیکھا۔ ”عشق کے عین کا نظارہ کرنے کے لئے تیار ہو جا۔“

طاہر کا دل زور سے دھڑکا اور رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ نجانے اس کے سامنے کیا آنے والا تھا۔ درویش نے قدم آگے بڑھایا اور کھلی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ طاہر اس کے ساتھ تھا۔

اندر کا منظر دیکھ کر طاہر کو پہلے تو کچھ سمجھ نہ آیا۔ پھر نجانے کیوں اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ایسا خواب جو دھند بن کر اس کی آنکھوں میں غبار اڑا رہا ہے۔ چمکیلا‘ رگوں میں سنسناہٹ دوڑاتا‘ دماغ کے بند دریچوں کو پُرشور آواز کے ساتھ کھولتا ہوا خواب۔

دلہن کے لباس میں ملبوس جواں سال خوبصورت گوری چٹی سکینہ‘ اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھے باریش‘ سانولے اور واجبی سی شکل کے حامل حافظ عبداللہ کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کرا رہی تھی۔ وہ روٹی کا لقمہ توڑتی۔ اسے سالن لگاتی اور حافظ عبداللہ کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیتی۔ بچوں کی طرح حافظ عبداللہ منہ کھول کر لقمہ لے لیتا۔ پھر وہ گود میں پڑے اپنے لنجے ہاتھ سے ہونٹ صاف کرنا چاہتا تو وہ بڑی نرمی سے اسے روک دیتی۔ اس کے لنجے ہاتھ کو تھام کر چومتی۔ پھر اپنے گوٹے کناری سے سجے سرخ دوپٹے کے پلو سے اس کے ہونٹوں کو اردگرد سے صاف کرتی۔ طاہر نے صاف دیکھا کہ حافظ عبداللہ کی آنکھوں میں شبنم لبالب تھی۔ لگتا تھا وہ کسی وقت بھی چھلک پڑے گا۔ نجانے کیوں؟

طاہر کو لگا جیسے اس کے سامنے جنت کے باسیوں کا کوئی منظر چل رہا ہو۔ ایک حور اپنے مالک کی خدمت کر رہی تھی۔

”یہ ہے عشق کا عین پگلے۔ عبادت‘ عجز‘ عقیدت۔“ درویش کی بیحد آہستہ سی آواز نے طاہر کو ہوش و حواس کی دنیا میں کھینچ لیا۔ ”وہ پگلی ایسا کیوں کر رہی ہے اور وہ سیانا کیوں اندر سے بلک رہا ہے؟ آ۔ تجھے عین کے ہجے کر کے بتاؤں۔“

کھڑکی سے ہٹ کر وہ حجرے کے دروازے پر آ گئے۔ درویش نے ایک پل کو کچھ سوچا پھر آہستہ سے دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے حافظ عبداللہ کی آواز ابھری۔

”اللہ والیا۔ تیرے ہاں مہمان آیا ہے۔“ درویش نے جواب میں کہا اور کوئی جیسے بڑی جلدی میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور درویش کے پیچھے کھڑے طاہر نے دیکھا‘ ان کے سامنے حافظ عبداللہ حیران حیران کھڑا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے اپنی آستین سے آنکھیں خشک کر ڈالیں۔

”ارے بابا آپ۔۔۔“ اسے جیسے یقین نہ آ رہا تھا۔ نظر طاہر پر پڑی تو وہ اور کھل گیا۔ ”آیئے ناں بابا۔ آیئے۔ آپ بھی آیئے جی۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔“ وہ انہیں راستہ دیتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔

درویش اور طاہر آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ کھلی کھڑکی سے آتی سورج کی روشنی سے منور کمرہ جیسے ان کے استقبال کے لئے مسکرا رہا تھا۔

”سلام بابا۔“ چٹائی پر بیٹھی سکینہ اٹھ کھڑی ہوئی اور درویش کے آگے سر جھکا دیا۔

”کیسی ہے تو اللہ والیئے؟“ درویش نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”نہال ہوں بابا۔ سکھ میں ہوں۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”سکھی رہے گی تو۔ میرے رب کے حکم سے۔“ وہ پیار سے بولا۔ ”لگتا ہے تم لوگ کھانا پینا کر رہے تھے۔“ درویش نے چٹائی پر برتن پڑے دیکھ کر کہا۔

”ہاں بابا۔ ناشتہ کر رہے تھے۔ آپ بیٹھئے ناں۔ میں آپ کے لئے بھی ناشتہ بناتی ہوں۔“ اس نے اب تک ایک بار بھی طاہر کی جانب نہ دیکھا تھا۔

”بیٹھتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں۔“ درویش نے چپل اتار دی اور طاہر اس کی تقلید میں چٹائی پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ سکینہ کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ سہاگ کی چادر سے خود کو ڈھکے وہ اسے کوئی ایسا محل نظر آ رہی تھی جس میں غلیظ ہوا کے کسی جھونکے کے داخلے کے لئے کوئی روزن موجود نہ ہو۔ حافظ عبداللہ بھی دروازہ بھیڑ کر ان کے پاس آ بیٹھا۔

”لے بھئی پگلے۔ یہ ہے حافظ عبداللہ۔ اس کی کہانی تو تجھے ہم بعد میں سنائیں گے پہلے اپنی بیٹی سے یہ کہہ دیں کہ ہمارے لئے صرف چائے بنائے۔“

”اچھا بابا۔“ سکینہ مسکرا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

حافظ عبداللہ نے کھانے کے برتنوں پر رومال دے کر انہیں ایک طرف سرکا دیا۔ درویش نے اس کے ہاتھ پر نظر ڈالی۔

”کیا حال ہے حافظ اس نشانی کا؟“

”بس۔ ٹھیک ہو گیا ہے بابا۔ اب اس سے تھوڑا بہت کام لینے لگ گیا ہوں۔“ حافظ عبداللہ نے اپنے چُرمرائے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”جانتا ہے اس ہاتھ کے ساتھ کیا کیا میرے اوپر والے نے؟“ درویش نے اچانک طاہر کا رخ کر لیا۔

”کیا بابا؟“ حافظ عبداللہ کے ہاتھ کو دیکھتا ہوا طاہر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اور حافظ عبداللہ کا سر جھک گیا۔ درویش نے کہنا شروع کیا تو طاہر کے اندر روزن کھلتے چلے گئے۔ روشنی اور رنگوں کے فوارے چھوٹنے لگے۔ اس کی حیرت فزا آنکھیں حافظ عبداللہ کے چہرے کا طواف کرتی رہیں جہاں سوائے حیا کے کچھ نہ تھا۔ شاید وہ داستان میں اپنی تعریف پر خود کو شرمندہ شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔

"یوں میری پگلی نے اس سیانے کو اپنے پلو سے باندھ لیا۔ اس کا یہ ہاتھ' جو بظاہر دیکھنے میں لنجا لولا لگتا ہے' میرے رب کی مہر کی وہ نشانی ہے' جس کے آگے دنیا کی ساری خوبصورتیاں ہیچ ہیں۔ کیوں پگلے' ٹھیک کہا ناں میں نے؟" درویش نے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔

"ہاں بابا۔" طاہر کے حلق سے بڑی چھلکتی ہوئی آواز نکلی۔ "ایسے ہاتھ نصیبوں والوں کے ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔" درویش بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔ "یہی تو میں کہتا ہوں۔ ایسے ہاتھ نصیبوں والے کے ہوتے ہیں جنہیں کوئی دم دم بوسے دیتا رہے۔ چومتا رہے۔"

"بابا۔" حافظ عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر سر جھکا لیا۔ "سکینہ تینوں وقت مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہے۔ ہر نماز کے لئے وضو کراتی ہے۔ میرے اس ناکارہ ہاتھ کو سو سو بوسے دیتی ہے۔ مجھے ہر وہ کام کرنے سے روک دیتی ہے جو مجھے اس ہاتھ سے کرنا ہوتا ہے۔ وہ میرا دایاں ہاتھ بن گئی ہے بابا۔" حافظ عبداللہ کی آواز بھرا گئی۔

"وہ بھی تو اپنے اس بندے کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ زبان بن جاتا ہے۔ کان بن جاتا ہے۔ آنکھ بن جاتا ہے جو اس کے لئے اپنا آپ تیاگ دیتا ہے۔ عاجز ہو جاتا ہے۔ عبودیت کی سیڑھی پر پاؤں رکھ دیتا ہے۔ عشق کے عین کے رستے پر چل پڑتا ہے۔" درویش نے وجد میں آ کر کہا۔

"کیا میں غلط کرتی ہوں بابا؟" اسی وقت سکینہ چائے کے تین پیالے پلاسٹک کے پھولدار ٹرے میں رکھے آ گئی اور ٹرے ان کے سامنے چٹائی پر رکھ دی۔

درویش نے طاہر کی جانب نظر کی' جو حیران حیران سا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیے سے جل رہے تھے۔ لو دے رہی تھیں اس کی آنکھیں۔

"کیا مجھے عبادت نہیں کرنی چاہئے؟"

"کرنی چاہئے میری پگلی بیٹی۔ کرنی چاہئے۔" درویش کا حلق آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ "یہ اگر کبھی تجھے روکے ناں۔ تو اس کی بات کبھی نہ ماننا۔ اپنی ہی کرتی رہنا۔ یہ سیانا ہے۔ کبھی اسے خیال آ گیا ناں کہ تیری نیکیاں بڑھتی جا رہی ہیں' تیری عبادت پہ رنگ آ رہا ہے تو شاید رشک کے مارے تجھے روکنا چاہے مگر اس وقت اس کی نہ ماننا۔ اپنے اللہ کی کہی کرنا۔ وہ کہتا ہے ناں کہ جس کا مالک اس سے راضی' وہ بھی اس سے راضی۔ تو اپنے دونوں مالکوں کو راضی کرتی

رہنا۔ ایک کی خدمت اور دوسرے کی عبادت میں بڑا گہرا تعلق ہے پگلی۔ تو نے یہ جان لیا ہے۔ بس اس بھید کا دامن نہ چھوڑنا۔ مضبوطی سے پکڑے رکھنا اسے۔ ‘‘

’’جی بابا۔ ‘‘

’’کیوں پگلے۔ عشق کے عین کی حقیقت پلے پڑی؟ ‘‘ درویش نے چائے کا پیالہ اس کے آگے سرکایا۔

’’ہاں بابا۔ ‘‘ وہ جلتی ہوئی آواز میں بولا۔

’’تو پھر اس کی خدمت کو قبول کر کے بھی کیوں انجان بنا رہتا ہے؟ کیوں اس کی عبادت کو صبر کے کانٹوں پر ڈال دیتا ہے؟ وہ جو تیرا ماتھا چوم کر کمرے سے نکل جاتی ہے‘ اسے آنسوؤں سے وضو کرا کے تیرے من کو سکون ملتا ہے کیا؟ ‘‘

’’نہیں بابا نہیں۔ ‘‘ وہ جلدی سے بول اٹھا۔ ’’بس۔ اندر ایک پھانس سی چبھ گئی ہے۔ وہ نہیں نکلتی۔ ‘‘ وہ بے بسی سے بے حال ہو گیا۔

’’نکل جائے گی۔ نکل جائے گی۔ ‘‘ درویش نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ ’’ابھی یہ تبرک حلق سے اتار۔ ‘‘

بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے طاہر نے آنکھوں کو چھلکنے سے روکا۔ پھر آستین سے چہرہ صاف کیا اور چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔ حافظ عبداللہ اور سکینہ بھی چٹائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئے۔

’’سکینہ بیٹی۔ ایک بات تو بتا۔ ‘‘ درویش نے طاہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

’’جی بابا۔ ‘‘ اس نے پلکیں اٹھائیں۔

’’تو نے میرے ساتھ آئے اس مشٹنڈے سے پردہ کیوں نہیں کیا؟ ‘‘ درویش کا اشارہ طاہر کی طرف تھا۔

’’میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں بابا۔ ‘‘ وہ سادگی سے بولی۔ ’’اور جو نظر ہی نہ آئے اس سے پردہ کیسا؟ ‘‘

’’اللہ۔۔۔۔ ‘‘ درویش نے بے اختیار ایک فلک شگاف نعرہ لگایا اور یوں جھومنے لگا جیسے اس پر جذب طاری ہو گیا ہو۔ ’’ٹھیک کہتی ہے پگلی۔ جو دکھائی نہ دے اس سے پردہ کیسا؟ وہ بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لئے تو اس سے بھی پردہ نہیں کیا جاتا۔ اس سے پردہ کیسا؟ اس سے پردہ کیسا؟ ‘‘ وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔

’’چل پگلے۔ آ جا۔ چلیں۔ ‘‘ ایک دم درویش اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’یہ تو بہت آگے چلی گئی۔ اسے تو حافظ کے سوا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ آ جا۔ چلیں۔ اس نے عبادت کی منزل کو چھو لیا ہے۔ عشق کا عین اس پر کھل گیا ہے بابا۔ عین کا در اس پر وا ہو گیا ہے۔ ‘‘ درویش کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

طاہر اس کے پیچھے لپکا۔ درویش بڑبڑاتا ہوا مسجد سے باہر نکل چکا تھا۔ طاہر نے پلٹ کر دیکھا۔ حافظ عبداللہ

اور سکینہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظریں حافظ عبداللہ سے ملیں تو دونوں بے اختیار مسکرا دیے۔ لرزتا ہوا نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر اس نے حافظ عبداللہ کی جانب ہاتھ ہلایا۔ جواب میں اس نے بھی اپنے جلے ہوئے ہاتھ سے اس کی جانب اشارہ کیا تو وہ جلدی سے مسجد کا دروازہ پار کر گیا۔ آنکھوں میں چھا جانے والی دھند کے پار دیکھا تو درویش اس سے کتنی ہی دور بھاگتا ہوا گلی کا موڑ مڑ رہا تھا۔ طاہر نے خود کو تیز قدموں سے اس کی آواز کے تعاقب میں ڈال دیا' جو ہوا کے دوش پر لہرا لہرا کر رقص کر رہی تھی۔

"اس سے پردہ کیسا؟
اس سے پردہ کیسا؟
اس سے پردہ کیسا؟"

☆

طاہر اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا مگر درویش کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان' اس کا پتہ نہ چلا۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتا ہوا بابا شاہ مقیم کے مزار پر آیا۔ درویش وہاں بھی نہیں تھا۔ طاہر کا حال عجیب ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس کے قابو میں نہ تھا۔ جی چاہتا تھا وہ کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جائے۔ اس کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا۔ لگتا تھا ابھی رگیں پھٹ جائیں گی اور خون ابل پڑے گا۔ سینے میں ایک الاؤ سا دہکنے لگا تھا جس کی لپٹیں اسے جھلسائے دے رہی تھیں۔ سکون کس چڑیا کا نام ہے؟ وہ بھول گیا تھا۔ قرار کسے کہتے ہیں؟ اسے یاد نہ تھا۔ بے کلی تھی کہ اسے آگ کے پالنے میں جُھلا رہی تھی۔

"بابا۔۔۔" اس نے بے بس ہو کر پورے زور سے صدا دی اور چرر چرر کی آواز کے ساتھ اس کا گریبان لیرو لیر ہو گیا۔ چیتھڑے اڑ گئے۔ اس نے اپنے بال نوچ لئے۔ گھٹنوں کے بل وہ کچی زمین پر گرا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگا۔

وہ دیوانوں کی طرح رو رہا تھا۔ آہیں بھر رہا تھا۔ اس کی سسکیوں میں کوئی فریاد بار بار سر اٹھاتی اور دم توڑ دیتی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ کس سے کہہ رہا تھا؟ کون جانے۔ ہاں ایک بابا شاہ مقیم کا مزار تھا جو روشن دھوپ میں سر اٹھائے اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی اس حالت کا گواہ ہو رہا تھا۔

دوپہر سے شام ہوئی اور شام سے رات۔ درویش نے آنا تھا نہ آیا۔

وہ کسی بے آسرا' بے سہارا' بے زبان کی طرح اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے خاک کے فرش پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن سفید لٹھے کی طرح کورا ہو چکا تھا۔ کوئی سوچ' کوئی خیال' کوئی شبیہہ اس پر ابھر ہی نہ پا رہی تھی۔ بالکل

خالی الذہنی کے عالم میں وہ وہاں یوں بیٹھا تھا جیسے دنیا اور دنیا والوں سے اس کا تعلق ٹوٹ چکا ہو۔

گھٹنے کھڑے کیے' ان کے گرد دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے تھامے' سر جھکائے' آنکھیں بند کیے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا کہ ایک آہٹ نے اسے اپنا ستا ہوا چہرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

آہستہ سے اس نے سر گھمایا۔ دائیں دیکھا۔ کچھ نہ تھا۔ بائیں دیکھا۔ خاموشی مہر بہ لب تھی۔ مگر یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ اس نے کسی کے تیز تیز قدموں سے پتوں اور گھاس پر چلنے کی آواز سنی تھی۔ اسی وقت وہ آواز پھر ابھری۔ اب اس کے ساتھ کسی کی صدا بھی ابھری۔

وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

”اس سے کیسا پردہ؟“ درویش کی آواز اب کے صاف سنائی دی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اسے آواز کی سمت کا اندازہ ہو گیا۔ بابا شاہ مقیم کے مزار کے عقب میں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا' آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ دیوانہ وار اس طرف بھاگا۔

درویش قبرستان میں تیز تیز قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ اس کے پاؤں تلے آنے والے کانٹے اسے زخم زخم کیے دے رہے ہیں۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ بالوں میں خاک اور جسم پر مٹی نے تہہ جما دی تھی۔ وہ جذب کے عالم میں قبرستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہر شے سے بیگانہ ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی آسمان کی طرف دیکھ لیتا۔ پھر اس کے ٹہلنے میں اور شدت آ جاتی۔ ہونٹوں پر ایک ہی فقرہ تھا جو کبھی نعرہ بن جاتا اور کبھی سرگوشی۔

”اس سے پردہ کیسا؟ اس سے پردہ کیسا؟ اس سے پردہ کیسا؟“

طاہر گرتا پڑتا اس کے قریب پہنچا اور پھر ایک بار جب وہ پلٹ کر قبروں کے درمیان سے دوسری جانب جانے کو تھا کہ وہ اس کے قدموں سے جا لپٹا۔

”بابا۔“

”ارے۔۔۔“ ایک دم درویش کی زبان تھم گئی۔ ”پگلے۔ تو ابھی یہیں ہے؟“ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔“

”بابا۔“ طاہر نے اس کے ہاتھ تھام کر اپنا ماتھا ان پر ٹکا دیا۔ ”میں کہاں جاؤں اب؟“ اس کا بھیگا ہوا لہجہ تھکان سے لبریز تھا۔

”کہاں جاؤں سے کیا مطلب؟“ سسکتے ہوئے طاہر پر درویش کی نظریں جم سی گئیں۔ ”ارے۔ واپس جا۔“

”واپس کہاں بابا؟“ طاہر نے برستی ہوئی آنکھیں درویش کی جانب اٹھائیں۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں وہ دونوں قبرستان کے خاموش ماحول میں دو روحوں کی طرح ہمکلام نظر آ رہے تھے۔ ”مجھے تو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کوئی راستہ سامنے نہیں ہے جس پر چل کر میں جہاں سے آیا تھا وہاں لوٹ کر جا سکوں۔“

”پگلا ہوتا جا رہا ہے تو واقعی۔“ درویش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”اور یہ تو نے اپنا حال کیا بنا لیا ہے؟“

”پتہ نہیں بابا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟“

”چل۔ ادھر چلتے ہیں۔ یہ تیری جگہ نہیں ہے۔ چل۔“ درویش نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکالے۔ اسے اٹھایا اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے کمرے میں چلے آئے۔ وہاں تک آتے آتے طاہر کی حالت کافی سنبھل گئی۔ طبیعت میں ٹھہراؤ سا آ گیا اور الاؤ کی دہک میں کمی بھی۔

کمرے میں داخل ہو کر چٹائی پر بیٹھتے ہی ایک دم طاہر گھبرا گیا۔ اس کی نظر درویش کے پیروں پر پڑی جو لہولہان ہو رہے تھے۔ کانٹوں نے اس کی پنڈلیوں تک کو خون میں نہلا رکھا تھا۔ خون اور مٹی میں لتھڑے اس کے پاؤں دیکھ کر وہ تھرا گیا۔

”بابا۔ آپ تو زخمی ہیں۔“ اس نے بے اختیار اس کے پاؤں چھو لئے۔

”اچھا۔“ درویش نے حیرت سے اپنے پیروں کی جانب دیکھا۔ ”یہ کیسے ہو گیا؟“

”آپ یہیں بیٹھئے۔ میں پانی لاتا ہوں انہیں دھونے کے لئے۔“ طاہر اٹھا اور درویش کے روکتے روکتے کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے کمرے میں بھی کچھ نہ ملا تو وہ مزار کے صحن میں چلا آیا۔ دروازے کے پاس ہی ایک میلا سا سٹیل کا جگ پڑا تھا۔ اس نے اس میں ہینڈ پمپ سے پانی نکالا اور واپس لوٹ آیا۔

درویش سرہانے بانہہ دھرے چٹائی پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ طاہر نے اپنے پھٹے کرتے کے دامن سے ایک ٹکڑا اپھاڑا اور درویش کے پاس بیٹھ گیا۔ کپڑے کو جگ کے پانی میں بھگو بھگو کر وہ درویش کے زخم صاف کرنے لگا اور بڑی نرمی سے تلووں سے کانٹے نکالنے لگا۔ درویش یوں بے حس و حرکت پڑا تھا جیسے بڑے آرام سے سو رہا ہو۔ طاہر اس کے کانٹے نکالتا رہا۔ خون اور مٹی صاف کرتا رہا۔ زخم برہنہ ہوتے چلے گئے۔ جگہ جگہ سے گوشت اڑ گیا تھا۔ اذیت کا احساس ہوا تو طاہر کا دل بھر آیا۔

”پگلے۔“ اچانک درویش نے آنکھیں کھول دیں۔ ”رات بہت جا چکی۔ اب گھر جا۔“

”نہیں بابا۔“ طاہر نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ”اب کسی گھر کی یاد دل میں باقی رہی

ہے نہ کہیں جانے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے یہیں اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیں۔ ‘‘

’’نہیں رے۔ ‘‘ درویش نے پاؤں سمیٹ لئے اور اٹھ بیٹھا۔ ’’تو اکیلا نہیں ہے۔ کوئی اور بھی بندھا ہے تیرے نام سے۔ اس کا حق مارے گا تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ ‘‘ درویش نے اوپر کی جانب دیکھا۔

’’میں اسے آزاد۔۔۔ ‘‘

’’بس۔ ‘‘ درویش نے سختی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’ایک لفظ اور نکالا تو راندہ درگاہ ہو جائے گا۔ ‘‘ وہ بھڑک اٹھا۔ ’’اپنی مستی کے لئے اسے خود سے الگ کرنا چاہتا ہے۔ پگلے۔ اس کی تو اجازت ہی نہیں ہے۔ ‘‘

’’تو پھر میں کیا کروں بابا؟ ‘‘ وہ بے بسی سے نم دیدہ ہو گیا۔ ’’میں کیا کروں؟ ایک پھانس ہے جو اس دل میں اٹک گئی ہے۔ نکلتی ہی نہیں۔ ‘‘

’’نکالنا ہی پڑے گی۔ ‘‘ درویش آنکھیں موند کر بڑبڑایا۔ ’’تو نے ہمارے کانٹے نکالے ہیں۔ اب تیری پھانس بھی نکل ہی جانی چاہئے۔ ‘‘ اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

’’ادھر دیکھ۔ ‘‘ وہ تحکم سے بولا۔

بے اختیار طاہر کی نظریں اٹھیں اور درویش کی نظروں میں مدغم ہو گئیں۔

’’یہ جو تیرے اندر پھانس اٹکی ہوئی ہے ناں۔ یہ پھانس نہیں ہے عشق کا دوسرا حرف ہے۔ شین۔ کیا سنا تو نے؟ عشق کا دوسرا حرف شین ہے یہ۔ جانتا ہے شین کس کی علامت ہے؟ مگر نہیں تو کیسے جانے گا؟ تو تو بس اسے دل میں اتار کر بے خبر ہو گیا۔ یہ نہ سوچا کہ یہ حرف تیرے دل میں اترا کیسے؟ کیوں اترا؟ ‘‘

طاہر بُت بنا درویش کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ عشق کے عین نے اس کا یہ حال کر دیا تھا جو اس کے ساتھ بیتا بھی نہ تھا۔ اور عشق کا شین اس کے ساتھ کیا کرنے والا تھا جو اس کے اندر پھانس بن کر اٹکا ہوا تھا۔ اس کے دل میں اندر تک اترا بیٹھا تھا۔

اس کا جی چاہا' درویش سے کہے۔ ’’بابا' رکو مت۔ بولتے رہو۔ بولتے رہو۔ ‘‘ اس کے بولنے میں سکھ تھا۔ سکون تھا۔ ٹھہراؤ تھا۔ فیض تھا۔ ایسا فیض جو طاہر کی بے کلی کو تسلی کی چادر سے ڈھانپ لیتا تھا۔ تشفی کے دامن میں سمیٹ لیتا تھا۔

’’شین۔۔۔ ‘‘ درویش نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک سسکی لی۔ ’’عشق کے پہلے حرف عین سے عبادت۔ عجز میں ڈوبے عبد کی عبادت اور عقیدت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ عبادت' جیسی سکینہ کر رہی ہے۔ جیسی تیرے گھر میں ہو رہی ہے۔ جیسی تیرے شہر میں داغدار قمر کے دامن میں پھول کھلا رہی ہے۔ اور اب عشق کا دوسرا حرف

شین۔ ‘‘ درویش ایک لمحے کو رکا۔ پھر اس کی آواز ابھری تو نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خمار آلود بھرائی ہوئی۔ طاہر اپنے آپ سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ اسے صرف درویش کی خوشبو سے بوجھل‘ تپش سے لبریز آواز سنائی دے رہی تھی۔ نہیں۔ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بے خودی کا شہد تھا جو قطرہ قطرہ اس کے کانوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس کے دل پر شبنم بن کر اتر رہا تھا۔

’’عشق حقیقی تک پہنچنے کے لئے عشق مجازی ضروری ہے۔ جیسے کسی چھت تک پہنچنے کے لئے سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چھت پر پہنچ کر سیڑھی سے الگ ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ سیڑھی کے بغیر چھت پر پہنچنا غیر فطری ہے۔ ہاں جو پیدا ہی چھت پر ہوا ہو اس کے لئے سیڑھی کی ضرورت نہیں پڑتی مگر ہم عام اور بے حیثیت انسانوں کے لئے وسیلہ اور حیلہ دونوں ضروری ہیں۔ کبھی سیڑھی کا وسیلہ۔ کبھی کمند کا حیلہ۔ عشق مجازی کے لئے ضروری ہے کہ کوئی دل کے دروازے پر آ کر دستک دے۔ اس میں آ کر مکین ہو جائے۔ دل کو اپنی جاگیر سمجھ کر اس پر قابض ہو جائے۔ اس میں اپنی مرضی کی دھڑکنیں جگائے۔ کبھی اسے توڑے۔ کبھی اسے جوڑے۔ کبھی اچانک غائب ہو جائے اور رلا رلا کر دل والے کو عاجز کر دے۔ کبھی ایسا مہربان ہو کہ نہال کر دے۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب دل میں ایسا گداز پیدا ہو جاتا ہے کہ دل والا بات بے بات آبگینے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے۔ آنسو اس کی پلکوں کی نوکوں پر موتیوں کی طرح اٹکے رہتے ہیں۔ وہ غم ملے تو روتا ہے۔ خوشی پائے تو روتا ہے۔ سوئے تو روتا ہے۔ جاگے تو روتا ہے۔ سوچے تو روتا ہے۔ سمجھے تو روتا ہے۔ یہ رونا اس کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ اس وقت۔۔۔ ‘‘ درویش نے دھیرے سے پلکیں وا کیں۔ طاہر سر جھکائے‘ بے حس و حرکت بیٹھا‘ ہر شے سے بیگانہ اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے طاہر کے چہرے پر نگاہیں جما دیں اور پھر گویا ہوا۔

’’اس وقت اس کے دل میں اس قدر نرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہاں رحمان آن بسیرا کرتا ہے اور اگر ذرا سا۔۔۔ ‘‘ درویش نے انگلی کی پور کے کونے پر انگوٹھے کا ناخن رکھ کر کہا۔ ’’اتنا سا بھی شیطان کو موقع مل جائے تو وہ چھلانگ مار کر دل کے سنگھاسن پر آ بیٹھتا ہے۔ تب گداز پر غیریت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ رحمانیت رخصت ہو جاتی ہے اور شیطانیت لوریاں دینے لگتی ہے۔ دوئی لپک کر آتی ہے اور وحدانیت سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ پھر انسان‘ انسان صرف اس حد تک رہ جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پیر انسانوں جیسے ہیں اور بس۔ اس کے اندر دہکتا عشق کا الاؤ ہوس کی آگ بن جاتا ہے۔ لوگ اس کے ہاتھ پیر چومنے لگتے ہیں۔ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جوانیاں اس کے انگ لگتی ہیں تو وہ اسے نفس پر غلبے کا نام دے کر خوش ہوتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ خود شیطان کو خوش کر رہا ہوتا ہے۔ عشق کے نام پر بھڑکنے والے شعلے پر ہوس کے چھینٹے پھوار بن کر برسنے لگتے ہیں اور پھوار میں بھیگنے کا تو ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے ناں۔ یہ مزا انسان کو عشق کی کسک سے دور لے جاتا ہے۔ اس چبھن سے دور لے جاتا ہے جس کا نام مجاز ہے۔ وہ دھیرے دھیرے

اس رنگ میں ایسا رنگا جاتا ہے کہ اس کا اپنا رنگ، عشق کا رنگ ناپید ہو جاتا ہے۔ ہوش اسے تب آتا ہے جب آخری لمحہ اس کے سامنے اس کا کچا چٹھا لئے آن کھڑا ہوتا ہے۔۔۔ مگر اس وقت اس کا ہوش میں آنا بیکار ہو جاتا ہے۔ عشق کے نام پر پھیلائی ہوئی بربادی اسے اپنے پیروں تلے روندتی ہوئی گزر جاتی ہے اور اس کا وجود تو مٹ جاتا ہے تاہم اس کا نام ابد الآباد تک عبرت بن کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اور اگر۔۔۔'' درویش نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا لہجہ گھمبیر ہوتا چلا گیا۔ آواز میں ایک عجیب سی نرمی پر کھولنے لگی۔۔۔ ''اگر یہ گداز رحمانیت کو چھو لے تو عشق مجازی کا ہاتھ عشق حقیقی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ دل، اس کا گھر بن جاتا ہے جو ہر کافر کے دل میں بھی کبھی نہ کبھی پھیرا ضرور ڈالتا ہے۔ پھر جسے وہ چُن لے، وہ کافر رہتا ہے نہ مشرک، بس اس کا بندہ بن جاتا ہے اور جس کا دل اسے پسند نہ آئے وہ اس کے آنے کو یوں بھول جاتا ہے جیسے جاگنے پر خواب یاد نہیں رہتا۔۔۔ عشق مجازی کی پہلی منزل عشق کے پہلے حرف عین سے شروع ہوتی ہے۔ عبادت جہاں پھل پانا شروع کرتی ہے، وہاں سے عشق کے دوسرے حرف شین کے رخ سے پردہ اٹھتا ہے۔ شین۔۔۔'' درویش نے ایک مستی بھری سسکی لی۔ ''شین۔۔۔ شین سے شک ہوتا ہے بچّے۔''

''شک۔۔۔؟'' ایک دم طاہر کا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ سارے بدن میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ لرز کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''ہاں بچّے۔'' درویش کی نگاہیں اسی کی جانب مرکوز تھیں۔ وہ درویش کی لو دیتی آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ زبان کو مزید کچھ کہنے کا یارا ہی نہ رہا۔ وہ ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ درویش کہہ رہا تھا۔

''شک۔۔۔ عشق کو مہمیز کرتا ہے۔ اسے ایڑ لگاتا ہے۔ انسان جس سے عشق کرتا ہے اس کے بارے میں ہر پل، ہر لمحہ شک کا شکار رہتا ہے۔ کبھی اسے یہ شک چین نہیں لینے دیتا کہ اس کا محبوب کسی اور کی طرف مائل نہ ہو جائے تو کبھی یہ شک نیندیں اڑا دیتا ہے کہ کوئی اور اس کے محبوب پر کمند نہ ڈال رہا ہو۔ کبھی یہ شک بے قراری کی آگ کو ہوا دینے لگتا ہے کہ اس کے عشق میں کوئی کمی نہ رہ جائے کہ اس کا محبوب ناراض ہو جائے تو کبھی یہ شک کانٹوں پر لوٹنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کسی اور کے جذبے کی شدت میرے محبوب کو متاثر نہ کر لے۔ شک کے یہ ناگ جب انسان کو ڈسنے لگتے ہیں تو وہ درد کی اذیت سے بے چین ہو ہو جاتا ہے۔ شک اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے محبوب کے آس پاس رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ اس پر کسی دوسرے کا سایہ نہ پڑنے دے۔ اسے دل میں یوں چھپا لے کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ کھو دینے کا یہ خوف اسے کچھ پا لینے کی منزل کی طرف ہانک دیتا ہے۔ جتنی شدت سے یہ شک کا خوف اس پر حملہ آور ہوتا ہے، اتنی ہی جلدی وہ عشق کی یہ دوسری منزل طے کر لیتا ہے۔ جب صدیق ؓ کو یہ شک ستاتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے محبوب ﷺ کے حضور اس سے بڑھ نہ جائے تو گھر کی سوئی تک نچھاور کر دی جاتی ہے۔

جب عمرؓ کو یہ شک مس کرتا ہے تو صدیقؓ سے آگے بڑھ جانے کے لئے رشک کی آخری منزل تمنا بن کر دل میں جنم لیتی ہے۔ جب عبداللہؓ کو یہ شک بے قرار کرتا ہے تو وہ اپنے سگے باپ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ اس کے محبوب ﷺ سے معافی نہ مانگ لے گا وہ اسے مدینہ میں داخل نہ ہونے دے گا۔ جب یہ شک زیدؓ کی جان کو آتا ہے تو وہ اپنے باپ کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی کو ٹھکرا کر اپنے آقا ﷺ کے در پر ابدی غلامی کے لمحات کو چُن لیتا ہے۔ قیس کو یہ شک لیلی کے کتے کو چومنے پر مائل کر لیتا ہے کہ وہ اس کتے سے بھی پیار کرتی ہے۔ یہ شک رانجھے کو کان پھڑوا کر جوگی بنا دیتا ہے تا کہ وہ کسی اور کو حالتِ ہوش میں ویسے دیکھ ہی نہ سکے جیسے ہیر کو دیکھتا تھا۔ یہ شک مہینوال کو ران کے کباب بنا کر سوہنی کے حضور پیش کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے اور۔۔۔ یہی شک ہے جو اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہے تو ساری ساری رات سونے نہیں دیتا۔ انسان کروٹیں بدلتے بدلتے چپکے سے اٹھتا ہے۔ یخ بستہ پانی سے وضو کرتا ہے اور محبوبِ حقیقی کی آرزو میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ میرے علاوہ اور کس کس کی طرف مائل بہ لطف ہے؟ کون کون اس کی مہر سے فیض یاب ہو رہا ہے؟ کس کس طرح کوئی اس کے حضور آہ و زاری کے نذرانے پیش کر رہا ہے؟ جن سے متاثر ہو کر وہ رونے والوں پر کیا کیا مہربانیاں کر رہا ہے؟ کیا کیا ناز دکھا رہا ہے کہ اپنے عشق کے مبتلاؤں کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا؟ بندہ یہ سبب ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ناپید ہو جاتا ہے کہ جس کے باعث اس کا رب اوروں پر مہربان اور اس خام و ناکام کی طرف سے لاپروا ہوا بیٹھا ہے۔ بندہ اس شک میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا خالق اس کا مالک اس کے علاوہ باقی سب پر مہربان ہے۔ اور ایسا ہے تو کیوں؟ یہ ”کیوں“ اسے اپنے مالک کے حضور لرزہ براندام رکھتا ہے۔ اس ”کیوں“ کا جواب پانے کے لئے یہ شک اسے ایسے قیام میں ڈبو دیتا ہے کہ اپنی خبر بھی نہیں رہتی۔ ایسے رکوع میں گم کر دیتا ہے کہ اس کی طوالت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ سُوہ لینے کی اس حالت میں یہ شک رات رات بھر سجدے کراتا ہے۔ ایسے سجدے کہ سر اٹھانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ لگتا ہے کہ ابھی سجدے میں سر رکھا تھا کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ محبوبِ حقیقی کی دبے پاؤں یہ تلاش اس شک ہی کی دین ہوتی ہے جس میں انسان یہ سوچ کر نکل کھڑا ہوتا ہے کہ:

کوٹھے تے پڑکوٹھڑا ماہی کوٹھے سُکدیاں توریاں
ادھی ادھی راتیں جاگ کے میں پیاں تیریاں چوریاں”

بڑی پُرسوز آواز میں درویش نے تان لگائی۔

طاہر کا دل ایک دم کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کی حالت ایسی غیر ہوئی کہ وہ بیقراری کے عالم میں سر مار کر رہ گیا۔ دونوں ہتھیلیاں پہلوؤں میں چٹائی پر ٹیکے وہ ہلکورے لے رہا تھا۔ جھوم رہا تھا۔ لوہا جانے کیسا گرم تھا کہ ایک ہی

چوٹ نے اسے سانچے میں ڈھال دیا۔

”وہ جو سب کا محبوبِ حقیقی ہے۔ محبوبِ ازلی ہے۔ اسے اپنے علاوہ کسی اور کی طرف مائل دیکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔“ درویش نے ایک سرد آہ بھری۔ ”مگر۔۔۔“ اس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ نے جنم لیا۔ ”وہ تو سب کا محبوب ہے ناں۔ سوائے ایک کے کسی اور ایک کا ہو کر رہنا اس کی سرشت ہی میں نہیں۔ جس ایک کا وہ ہے، اسے اس نے اپنا محبوب ﷺ بنا لیا ہے۔ باقی سب کا وہ مشترکہ محبوب ہے۔ اسی لئے تو وہ ہر جگہ مل جاتا ہے۔ ہر جائی جو ہے۔۔۔ ہر جائی۔۔۔ ہر جگہ مل جاتا ہے۔“ درویش کی آنکھوں کے سوتے ابل پڑے۔ ”ہر جائی۔۔۔ وہ تیرا بھی ہے اور میرا بھی۔ اس کا بھی ہے اور اُس کا بھی۔ یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔۔۔ وہ سب کا ہے اور کسی کا بھی نہیں۔۔۔ ہر جائی۔“ وہ بچوں کی طرح سسک پڑا۔ ”مگر کیسا ہر جائی ہے وہ کہ ہر جگہ ہے اور کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ پھڑائی نہیں دیتا۔ لکن میٹی کھیلتا ہے ہمارے ساتھ۔ خود چھپا رہتا ہے اور ہمیں ڈھونڈنے پر لگا دیا ہے۔ پھر کہتا ہے میں تو تمہاری شہ رگ کے قریب ہوں۔ سر جھکاؤ اور مجھے پا لو۔ میں تمہارے دل میں رہتا ہوں۔ دل۔۔۔ جس میں اس کے عشق کے تینوں حرف اودھم مچائے رکھتے ہیں۔ شک ان میں سب سے زیادہ لاڈلا ہے۔ اسے کھل نہ کھیلنے دو تو یہ روٹھ جاتا ہے۔ منہ پھیر کر چل دیتا ہے۔ اسے کبھی دل سے جانے نہ دینا بچے۔ اس کے ہونے سے ہی عشق کی سج دھج ہے۔ عشق کا الاؤ اسی چنگاری سے دہکتا ہے۔ یہ چنگاری سلگنا بند کر دے تو عشق کا شعلہ سرد پڑنے لگتا ہے۔ دم توڑنے لگتا ہے۔ یہ شک ہی ہے جو انسان کا ہاتھ پکڑ کر عشق مجازی کے راستے سے عشقِ حقیقی کی منزل تک لے جاتا ہے۔ محبوب کی نظروں میں ہلکا پڑ جانے کا شک انسان کو کبھی بے وزن نہیں ہونے دیتا۔ اسے محبوب سے دور نہیں جانے دیتا۔ دل میں پھانس بن کر اٹک جانے والا یہ شک۔۔۔“ درویش رک گیا۔

”بولتے رہیے بابا۔ رکیے مت۔“ طاہر نے مچل کر درویش کی جانب دیکھا۔ جان سمٹ کر جیسے لبوں پر آ گئی۔ طاہر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درویش کے لبوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ طاہر اس مسکراہٹ سے اور بے قرار ہو گیا۔

”یہی وہ شک ہے۔ وہ پھانس ہے۔ عشق کے شین کی یہی وہ شدت ہے جس نے کسی تیسرے کا خوف تیرے دل میں بٹھا دیا ہے۔“ درویش نے اس کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

طاہر کے دل کا بھید آشکار ہوا تو وہ حیرت سے سُن ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے۔

”نہ۔۔۔“ درویش نے انگلی اس کی جانب اٹھا دی۔ اسے بولنے سے روک دیا۔ ”تجھے یہ شک نہیں ہے کہ تیری پگلی اور اس تیسرے میں کوئی واسطہ ہے۔ نہ نہ۔ تجھے تیرے عشق کی شدت نے اس شک میں مبتلا کر دیا ہے کہ کسی

روز وہ سامنے آ گیا تو اس کے عشق کی شدت تیری پگلی کو تجھ سے دور نہ لے جائے۔ وہ ایک پل کو بھی اگر اس کے بارے میں کچھ سوچ لے گی تو تیرا کیا حال ہوگا؟ اس کا خیال بھی تیرے اور تیری پگلی کے درمیان نہ آ جائے، یہ شک تجھے تیری پگلی کے قریب نہیں جانے دیتا۔ ایسا ہی ہے ناں پگلے؟‘‘ درویش نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے طاہر نے سر جھکایا اور اثبات میں ہلا دیا۔

’’اسی لئے تو میں تجھے پگلا اور اسے پگلی کہتا ہوں جو دن رات تیری پوجا کرتی ہے۔ پگلا ہونے میں بڑا فائدہ ہے۔ سیانا ہو جائے ناں بندہ تو اس کے ہر ہر فعل کی جانچ ہوتی ہے۔ اس کا امتحان لیا جاتا ہے جیسے حافظ عبداللہ کا لیا گیا۔ اسے تو اس کی پگلی نے بچا لیا۔ تو بول۔ تیرے پاس کوئی پگلی ہے جو تجھے بچا لے؟‘‘

جواب میں طاہر درویش کو درد بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے پاس درویش کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

’’ہے۔ تیرے لئے ہونی تو سیانی چاہئے تھی مگر اس کے رنگ نیارے ہیں۔ اس نے تجھ جیسے پگلے کو سیانی نہیں دی، پگلی ہی دی۔ وہ جو تیرے گھر میں پڑی ہے ناں۔ تیرے جیسی ہی پگلی ہے۔ پگلا اور پگلی۔ دونوں کو سمجھانے کے لئے میری جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔ اسے تو کیا سمجھاؤں گا، تو ہی اکیلا کافی ہے میرے لئے۔‘‘ وہ بگڑ گیا۔

’’بابا۔‘‘ طاہر نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

’’دیکھ۔‘‘ درویش نرم پڑ گیا۔ ’’دیکھ پگلے۔ سیانے جو ہوتے ہیں ناں۔ انہیں سب معلوم ہو جاتا ہے اور یہ پھنس جاتے ہیں۔ جو جتنا سبق یاد کرتا ہے اسے اتنا ہی قابل سمجھا جاتا ہے۔ اور جو جتنا قابل ہوتا ہے اسے اتنی ہی بڑی ذمے داری نبھانا پڑتی ہے۔ پھر ان سیانوں کی کمر دوہری ہو جاتی ہے ذمے داری کے بوجھ سے۔ آزمائش اور امتحان کے کانٹوں بھرے طویل راستے پر احتیاط کا دامن چھٹنے نہ پائے، یہ احساس انہیں اس اکیلے کی طرح تنہا کر دیتا ہے جس کا عشق ان کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے۔ پھر بھی یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کب ان کا نتیجہ فیل ہونے کی صورت میں نکل آئے۔ اس کے مقابلے میں تجھ جیسے پگلے بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ اتنا ہی جانتے ہیں جس سے گزارا ہو جائے۔ بس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ سر جھکائے عشق کے سفر پر چل دیتے ہیں۔ دنیا بھی نبھ جاتی ہے اور مقصود بھی ہاتھ آ جاتا ہے۔ جہاں غلطی ہو جائے، کوتاہی ہو جائے، وہاں معافی بھی مل جاتی ہے، پگلا ہونے کا یہ سب سے بڑا فائدہ ہے۔ جبکہ سیانا بیچارہ معافی کے لفظ سے ہی ناآشنا ہو جاتا ہے۔

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا‘‘

کہہ کر درویش قلقاری مار کر ہنسا۔ طاہر اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ہر ہر بات ایک نیا بھید ایک نیا راز آشکار کر رہی ہو اور اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ ان رازوں کو ان بھیدوں کو کہاں سنبھال کر رکھے کہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔

”اسی لئے کہا تھا میں نے کہ اس پگلی کو چھوڑنے کا خیال بھی کبھی دل میں مت لانا۔ اس پر اپنے جذبے پر شک کر تو صرف اس لئے کہ تو اسے جی جان سے چاہتا ہے۔ اسے کھو دینے کا ڈر اس کے ساتھ کسی کا بھی نام آتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہ اچھا ہے۔ اس طرح تیرا اس سے عشق کا تعلق ”دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی“ جیسا ہو جائے گا۔۔۔ مگر کبھی اس پر شبہ نہ کرنا۔ شک اور شبے میں یہی بنیادی فرق ہے پگلے۔ عشق میں شک جائز بھی ہے اور ضروری بھی' اگر کھوٹ درمیان میں نہ آئے اور شبہ۔۔۔ الامان الحفیظ۔۔۔“ درویش نے کانوں کو لووں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”عشق میں شبہ در آئے تو پاک دامن بیوی بیسوا نظر آتی ہے۔ بستر کی شکنوں میں کسی باہر والے کا جسم لپٹا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بناؤ سنگھار کسی دوسرے کے لئے لگتا ہے۔ کاجل کی دھار' گناہ آلود راتوں کی طرح خیالات پر بال کھولے بین کرنے لگتی ہے۔ شبے سے ہمیشہ بچنا۔ اسے کبھی دل میں جگہ نہ دینا۔ پھر تو بچا رہے گا برباد ہونے سے۔“

”آپ روشن ضمیر ہیں بابا۔“ طاہر کے حواس لوٹ رہے تھے۔ ”آپ جانتے ہیں میں نے صفیہ کو کبھی شبے کی نظر سے نہیں دیکھا۔ جو پھانس تھی وہ کسی حد تک نکال دی ہے آپ نے۔“

”یعنی ابھی اس کی ٹیس کچھ باقی ہے دل میں؟“ درویش نے بھویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”بس اتنی سی بابا کہ اگر کبھی سرمد لوٹ آیا تو۔۔۔؟“ اس نے سر جھکا لیا۔

”تو۔۔۔“ درویش نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تو کیا ہو گا؟“

”یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا بابا۔“ وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے بولا۔ ”تب کیا ہو گا؟“

”تب کیا ہو گا' یہ تو میں نہیں بتا سکتا تجھے۔ اجازت نہیں ہے مجھے۔۔۔ مگر ایک بات تجھے ابھی سمجھا سکتا ہوں میں۔“

طاہر نے نظریں اٹھائیں۔ درویش اسے بڑی سرد نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”ایک پارسا تھا۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”اس کے گھر سے کھانا آتا تو وہ سالن میں پانی ملا کر کھایا کرتا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں کھانے کی لذت ختم کر کے کھاتا ہوں تاکہ میرا نفس مزہ لینے کی عیاشی نہ کر سکے اور میں اس کے بہکاوے میں نہ آ جاؤں۔ میں نے سنا تو اتنے بڑے بڑے پھکڑ تولے میں نے۔ اسے گالیاں دیں میں نے۔ جانتا ہے کیوں؟“

درویش نے انگلی اس کی جانب اٹھائی اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔

’’اس لئے کہ وہ میرے مالک کی نعمت کا کفران کر رہا تھا۔ میں نے کہا ارے بھڑوے۔ اگر لذت نہ دے کر نفس کو مارنا چاہتا ہے تو کھانا ہی پھیکا‘ بدمزہ اور بے لذت کیوں نہیں پکواتا۔ میرا رب تجھے اچھی نعمت دے رہا ہے اور تو اس میں خرابی پیدا کر کے کھاتا ہے۔ اس کی دی ہوئی چیز میں اپنی طرف سے مین میخ نکال کر خود کو پارسا ظاہر کر رہا ہے تاکہ لوگ تجھے نیکوکار سمجھیں یا کم از کم تیرا نفس تجھے اس بھول میں رکھے کہ تو بڑا اچھا کام کر رہا ہے۔ اس سے تیرا رب تجھ سے راضی ہو گا لیکن اگر رب نے پوچھ لیا کہ پاگل کے بچے۔ میں نے تجھے ایک نعمت دی کہ تو اس سے بہرہ ور ہو۔ اس سے لطف اٹھائے اور میرا شکر ادا کرے مگر تو نے اسے بدہیئت اور بدمزہ کیوں کیا؟ تو تیرے پاس اس کا کیا جواب ہو گا؟ تلا جائے گا یا نہیں اس وقت؟ تو بھی اس پارسا کی طرح اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کو آنے والے نادیدہ‘ مستقبل کی دھند میں لپٹے وقت کا پانی ڈال کر بدمزہ کرنے کا گناہ کر رہا ہے۔ یہ ریاکاری ہے میرے بچے۔ اللہ نے تجھے پاکیزہ لباس عطا کیا ہے‘ اسے وہم کا پیوند نہ لگا۔ اسے چوم چاٹ کر پہن۔ اسے کھونٹی پر ٹانگے رکھے گا تو وہ بوسیدہ ہو جائے گا۔ اس پر بے توجہی کا غبار جم جائے گا۔ گزرتے وقت کی ٹڈیاں اسے جگہ جگہ سے کتر ڈالیں گی۔ اور جب تجھے اس لباس کی اہمیت کا اندازہ ہو گا تب تک وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ تو اسے پہن سکے۔ پھر تجھ سے کفرانِ نعمت کا حساب لیا جائے گا۔ دے سکے گا تو اس کا حساب؟ سیانا نہ بن۔ پگلا بنا رہ۔ کوتاہی اور غلطی کی معافی مانگ کر لوٹ جا اپنی پگلی کے پاس۔ اسے پہن لے جا کر۔ اسے بوسیدہ ہونے سے پہلے پہن لے۔ ایسے پاکیزہ لباس کسی کسی کا نصیب ہوتے ہیں۔‘‘

درویش خاموش ہو گیا۔

طاہر کے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے عشق کے عین نے چھو لیا تھا کہ صفیہ اسے کس بلندی پر رکھ کر دیکھتی ہے۔ عشق کے شین کا فہم عطا ہو گیا تھا۔ ادراک ہو گیا تھا اسے کہ اس کا عشق صفیہ کے لئے کس مقام پر پہنچا ہوا تھا۔ صفیہ کے بارے میں تو وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے کیا جذبات رکھتی ہے مگر آج اسے اپنے بارے میں جو احساس ہوا تھا اس نے اس کے لئے ایک نئے جہان کے در وا کر دیے تھے۔ خودشناسی کے در کھلے تو اسے پتہ چلا کہ عشق ہوتا کیا ہے؟ عشق کا عین اور شین اس پر ادراک کے نئے نئے عالم آشکار کر رہے تھے۔

’’کیا سوچ رہا ہے؟ ابھی کوئی الجھن باقی ہے کیا؟‘‘ درویش نے اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

’’نہیں بابا۔‘‘ اس کے لبوں سے سرگوشی آزاد ہوئی۔ ’’اب کوئی الجھن نہیں۔۔۔ بس ایک خواہش چٹکیاں لے رہی ہے۔‘‘

’’خواہش۔۔۔؟‘‘ درویش نے اسے غور سے دیکھا۔

”ہاں بابا۔“ طاہر نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”عشق کا عین اور شین تو آپ نے سمجھا دیے۔ عشق کا قاف ابھی باقی ہے۔“

”توبہ کر توبہ۔“ درویش نے تڑپ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک دم وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی اور آواز ایسی پست ہو گئی جیسے کسی کنویں سے آ رہی ہو۔

”بابا۔۔۔“ طاہر نے کہنا چاہا۔

”سبق یاد ہو گیا تو چھٹی نہیں ملے گی۔ باز آ جا۔ اس بھید کو بھید ہی رہنے دے۔“ درویش کانپے جا رہا تھا۔

”نہیں بابا۔“ طاہر پر ضد سی سوار ہو گئی۔ ”میں اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کے بارے میں مکمل طور پر نہ جان سکوں، یہ بات مجھے چین سے مرنے بھی نہ دے گی۔“

”مکمل طور پر جاننا میرے تیرے لئے ممکن نہیں ہے پگلے۔“ درویش نے اٹھ جانا چاہا۔ ”ضد نہ کر۔“

”میں ضد کہاں کر رہا ہوں بابا۔“ طاہر بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں تو عرض کر رہا ہوں۔“

”مت بہکا مجھے۔“ درویش نے اسے جھڑک دیا۔ ”یوں چاپلوسی کرے گا تو میں پھسل جاؤں گا۔ چپ ہو جا۔“

”بابا۔“ طاہر نے اس کا راستہ روک لیا۔ ”اگر آپ نہیں بتائیں گے تو میں گھر نہیں جاؤں گا۔“

”تو نہ جا۔“ وہ بھڑک گیا۔ ”میرے باپ کے سر پر کیا احسان کرے گا جا کر۔ پوچھ تجھ سے ہو گی۔ جواب دینا پھر اسے۔“ اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔ ”میں تو کہہ دوں گا کہ میں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اب یہ جان بوجھ کر کفرانِ نعمت کرے تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”میں بھی کہہ دوں گا کہ آپ نے مجھے آدھی بات بتا کر ٹال دیا تھا۔“

”کیا۔۔۔کیا۔۔۔؟“ درویش نے کچی زمین پر اتر کر قدم روک لئے۔ ”میں نے تجھے آدھی بات بتائی۔ یہ کہا تو نے؟“ وہ غصے سے بولا۔

”ہاں تو اور کیا؟“ طاہر بچوں کی طرح مچلا۔ ”عشق کا تیسرا حرف کہاں سمجھایا آپ نے مجھے؟“

”تو سہہ نہیں پائے گا۔“ ایک دم وہ طاہر کو جیسے بہلانے پر آ گیا۔ ”ہر چیز کا ایک وزن ہوتا ہے پگلے۔ تو اٹھا نہیں سکے گا اس بوجھ کو۔“

”تو کیا ہو گا؟“ طاہر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ میں اس بوجھ تلے دب کر مر جاؤں گا۔ یہ منظور ہے مجھے مگر۔۔۔ نہ جاننے کا ناسور دل میں پال کر میں زندہ نہیں رہنا چاہتا بابا۔“

”تو پگلا کم اور سیانا زیادہ ہے۔“ درویش نے ایک آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں چاند مسکرا رہا تھا۔

چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ بابا شاہ مقیم کا مزار کسی بھید کی طرح ان کے سامنے بُکل مارے کھڑا تھا۔

”آپ جو بھی سمجھیں بابا۔“ طاہر نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ کچھ دیر بعد درویش نے آسمان سے نظریں ہٹائیں اور طاہر کی طرف دیکھ کر پھر ایک سرد آہ بھری۔ ”میں تجھے عشق کے قاف سے بھی ملا دوں گا مگر۔۔۔“ اس نے رک کر طاہر کی جانب ہاتھ کھڑا کیا۔ ”ابھی نہیں۔“

”ابھی کیوں نہیں بابا؟“ طاہر جلدی سے بولا۔

”ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے پگلے۔“ درویش پھر جھلا گیا۔ ”یہ امکانات کی دنیا ہے۔ مجھے یہ بھید تجھ پر کھولنے کا جب حکم ہوگا تو اس کے اسباب پہلے پیدا ہوں گے۔ اس کی تمثیل جنم لے گی۔ تیرے سامنے عین اور شین کی مثالیں موجود ہیں ناں۔ اسی لئے تجھے انہیں سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اس تیسرے بھید کے لئے بھی کچھ تو ایسا ہو جو تجھ پر فہم اور ادراک کے دروازے کھول سکے۔ جب بھی ایسا ہوگا۔ جب بھی مجھے حکم ہوگا' میں تجھے ضرور آگاہ کر دوں گا۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔“

”ٹھیک ہے بابا۔“ کچھ دیر تک اس کی آنکھوں میں کھوئے رہنے کے بعد طاہر نے دھیرے سے کہا۔ ”میں انتظار کروں گا۔“

”بے صبرا نہ ہو۔ میں نے کہا ناں۔ وقت آنے پر تجھے ضرور بتاؤں گا۔ اب تو جا۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو گئی ہے۔ کہیں وہ پگلی تیری تلاش میں نہ نکل پڑے۔“ درویش نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

”اچھا بابا۔“ طاہر نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میری گستاخی معاف کیجئے گا۔“

”پگلا ہے تو۔“ درویش ہنس پڑا۔ ”گستاخی کیسی؟ یہ تو تیرے نصیب کی بات ہے۔ اگر اس میں لکھا ہے کہ تو مکتبِ عشق میں داخلہ لے لے تو میں کون ہوتا ہوں تجھے روکنے یا چھٹی دینے والا۔“

طاہر نے درویش کا دایاں ہاتھ تھاما۔ دل سے لگایا۔ ماتھے سے چھوا اور آہستہ سے چھوڑ دیا۔ پھر الٹے پاؤں اپنی گاڑی تک آیا۔ دروازہ کھول کر اندر بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

درویش اسے وہیں کھڑا تب تک دیکھتا اور دایاں ہاتھ ہلاتا رہا جب تک اس کی گاڑی وجاہت آباد جانے والے راستے پر نہ مڑ گئی۔ پھر وہ آہستہ سے پلٹا اور مزار کی طرف چل پڑا۔

”عشق کا قاف۔ عشق کا قاف۔ پگلا ہے بالکل۔“ بڑبڑاتے ہوئے اچانک رک کر ایک دم اس نے مزار کی جانب نظر اٹھائی۔

’’خود آرام سے تماشا دیکھتے رہتے ہو۔ ساری مصیبت میری جان پر ڈال دی ہے۔‘‘ وہ جیسے بابا شاہ مقیم سے لڑنے لگا۔ ’’اسے یہاں رکنے ہی کیوں دیا تھا؟ آیا تھا تو اس کا رخ گھر کی طرف کر کے روانہ کر دیتے۔ مگر نہیں۔ تم ایسا کیوں کرو گے۔ تمہیں تو مزا آتا ہے مجھے تنگ کر کے۔‘‘ اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ پھر اس کی آواز بھرا گئی۔ ’’پگلا ہے وہ۔ بچوں کی طرح ضد کرتا ہے مجھ سے۔ کہتا ہے وہ اس سے کہہ دے گا کہ میں نے اسے پوری بات نہیں بتائی۔۔۔ پوری بات۔۔۔‘‘ ایک دم وہ جیسے روتے روتے ہنس پڑا۔ ’’پوری بات جاننا چاہتا ہے۔۔۔ پوری بات۔‘‘ اس کے حلق سے قہقہہ ابلا اور وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ ’’پوری بات۔۔۔‘‘ وہ کچی زمین پر گر پڑا۔ ’’پوری بات۔۔۔ دم نکل جائے گا اس پگلے کا پوری بات جان کر۔‘‘

وہ یوں خاک میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا جیسے پھولوں کے بستر پر مچل رہا ہو۔ رات کی تنہائی اس کی آواز سے گونج رہی تھی۔ سناٹا کان لگائے اسے سن رہا تھا۔ ہوا نے اپنے قدم آہستہ کر لئے کہ اس کی بات میں مخل نہ ہو۔ چاندنی اس کے گرد ہالہ بنائے ہاتھ باندھے دم بخود کھڑی تھی۔ ستاروں نے پلکیں جھپکنا چھوڑ دیا تھا اور چاند یوں ساکت ہو گیا تھا جیسے اپنا سفر بھول کر اس کے لبوں سے کسی انہونی واردات کا قصہ سننا چاہتا ہو۔

’’پوری بات۔۔۔ عشق کا قاف۔۔۔‘‘ درویش بڑبڑا رہا تھا۔ مچل رہا تھا۔ ہنس رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ ایک سیانا پگلا ہو گیا تھا۔

☆

صبح صادق طلوع ہو رہی تھی جب طاہر نے گاڑی حویلی کے پورچ میں روکی۔ گیٹ کھولنے والا ملازم گیٹ بند کر کے مڑا تو طاہر گاڑی سے اتر رہا تھا۔ ملازم اس کے پھٹے ہوئے کرتے اور مٹی میں اٹے جسم کو دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، مردانے سے ملک بلال نے باہر قدم رکھا۔

”چھوٹے مالک۔ کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر اس کے قریب چلا آیا۔

”کچھ نہیں۔“ طاہر نے مختصر سا جواب دیا اور اندر کو چلا۔

”مگر یہ۔۔۔“ ملک نے اس کے کپڑوں کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا؟“

”نہیں۔“ طاہر اس کے قریب سے گزر گیا۔

”آپ آ کہاں سے رہے ہیں چھوٹے مالک؟“ سارے لوگ آپ کے انتظار میں جاگ رہے ہیں۔ مالکن اس قدر پریشان ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ آپ تو بابا شاہ مقیم کا کہہ کر گئے تھے۔۔۔“

”میں وہیں سے آ رہا ہوں۔“ طاہر نے قدم برآمدے میں رکھا۔

”تو ساری رات آپ وہیں تھے؟“ ملک کی حیرت دوچند ہو گئی۔

”ہاں۔۔۔ اور اب بس۔“ طاہر ہال کمرے کے دروازے پر رکا۔ پلٹا اور ملک کی آنکھوں میں اس انداز سے دیکھا کہ ملک کو مزید کچھ کہنے کا یارا، نہ رہا۔ ”اور کوئی سوال نہیں۔ تم نے جو دیکھا، سمجھو نہیں دیکھا۔ سب کو سمجھا دو۔ دن میں ڈیرے پر ملاقات ہو گی۔“ وہ اندر داخل ہو گیا۔

ملک خاموش، منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوال مچل رہے تھے مگر اسے زبان بندی کا حکم دے کر طاہر جا چکا تھا۔ اسی وقت وہ ملازم تیز تیز قدموں سے اس کے پاس چلا آیا جس نے گیٹ کھولا تھا۔

”ملک صیب۔“ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ”کیا ہوا۔ چھوٹے مالک کا کسی سے جھگڑا ہو گیا کیا؟“

”آں۔۔۔“ ملک چونکا۔ اس کی نظر ملازم پر پڑی تو جیسے ہوش میں آ گیا۔ ”کیا کہا تو نے؟“

ملازم نے اپنی بات دہرائی تو ملک ایک دو لمحے اس کی جانب خالی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر اس کی

تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

’’گیٹ تو نے کھولا تھا؟‘‘ ملک کا لہجہ سخت پا کر ملازم گھبرا گیا۔

’’ج۔۔جی ہاں ملک صیب۔‘‘ وہ ہکلایا۔

’’اور کس نے چھوٹے مالک کو اس حال میں دیکھا ہے؟‘‘

’’کسی نے نہیں جی ملک صیب۔ باقی ملازم ڈیرے پر ہیں۔‘‘

’’تو بس۔‘‘ ملک نے ہاتھ اٹھا کر تحکم سے کہا۔ ’’چھوٹے مالک کو تو نے بھی نہیں دیکھا کہ وہ کس حال میں لوٹے ہیں۔ سمجھ گیا۔‘‘

’’سمجھ گیا جی۔ بالکل سمجھ گیا۔‘‘ ملازم نے زور زور سے سر ہلایا۔

’’زبان کو گانٹھ دے کر رکھنا۔ مجھے بات دہرانی نہ پڑے۔‘‘ کہہ کر ملک اندر جانے کے لئے پلٹا۔

’’جی ملک صیب۔‘‘ ملازم کا رنگ بدل گیا۔ ملک اس کی دگرگوں حالت کو نظر انداز کرتا ہوا ہال میں داخل ہو گیا جہاں اس کی توقع کے مطابق طاہر موجود نہیں تھا۔ وہ زنان خانے میں جا چکا تھا۔

☆

’’میرے مالک۔ ان کو اپنی امان میں رکھنا۔ انہیں ہر بلا سے محفوظ فرمانا۔ مجھے ان کا کوئی دُکھ نہ دکھانا۔ میرے معبود۔ انہیں حفاظت کے ساتھ گھر لے آ۔ ان کی آئی مجھے آ جائے۔ ان کی بلا مجھ پر پڑے۔ انہیں کچھ نہ ہو میرے مالک۔ انہیں کچھ نہ ہو۔ تجھے تیرے حبیب ﷺ کا واسطہ۔ مجھے میرے حبیب سے خیر و عافیت کے ساتھ ملانا۔‘‘

سجدے میں پڑی صفیہ زار زار روئے جا رہی تھی۔ اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوبی ٹوٹ ٹوٹ کر ابھر رہی تھی۔ اسے یوں بلکتا دیکھ کر دروازے میں کھڑا طاہر بے کل سا ہو گیا۔

کاریڈور میں قدم رکھا تو اس کی حالت پر حیرت زدہ فہمیدہ نے سلام کر کے کمرے کی طرف دوڑ لگانا چاہی۔ شاید وہ صفیہ کو طاہر کے آنے کی خبر سنانا چاہتی تھی مگر طاہر نے اسے روک دیا۔ اسے خاموشی سے چلے جانے کا کہہ کر وہ کمرے کی جانب بڑھا اور آہستہ سے کھلے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی گم خبری پر صفیہ کا کیا حال ہے؟ اور اب اسے یوں تڑپتا پا کر اس کا دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

’’صفو۔۔۔‘‘

آواز تھی یا نوید حیات۔ صفیہ کا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتا جسم ایک دم ساکت ہو گیا۔ ایک پل کو اسے لگا کہ یہ اس کی سماعت کا دھوکا ہے مگر دوسرے ہی پل اس نے سر سجدے سے اٹھایا اور دروازے کی جانب دیکھا۔

''طاہر۔۔۔'' شبنم میں دھلتا ہوا اس کا چہرہ دودھ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ دروازے میں کھڑے طاہر کی حالت دیکھ کر وہ سُن ہو گئی۔

''صفو۔۔۔'' طاہر کے بازو وا ہوئے۔

اب شبے کی گنجائش کہاں تھی؟

''طاہر۔۔۔'' وہ تڑپ کر جائے نماز سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اس کے سینے سے آ لگی۔ ''طاہر۔۔۔ طاہر۔۔۔'' وہ اس سے لپٹی سسک رہی تھی۔ ''یہ آپ کو کیا ہوا؟ کہاں تھے آپ اب تک؟ کہاں تھے؟''

''ششش۔۔۔'' طاہر نے اسے باہوں کے گھیرے میں لے کر بھینچ لیا۔ ''خاموش ہو جاؤ صفو۔ کچھ مت کہو۔ کچھ مت کہو۔'' اس کی زلفوں میں چہرہ چھپا کر طاہر نے سرگوشی کی۔

بچوں کی طرح ہچکیاں لیتی ہوئی صفیہ نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر لئے اور یوں لپٹ گئی جیسے جدا ہونا اس کے لئے ممکن نہ رہا ہو۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔

پھر طاہر نے اسے آہستہ سے اپنے آپ سے الگ کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس کی باہوں میں جھول گئی۔ وہ غش کھا گئی تھی۔

''صفو۔۔۔'' طاہر گھبرا گیا۔ اسے ہاتھوں پر اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ کمبل اوڑھایا اور بیڈ کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے چہرے کو والہانہ دیکھنے لگا' جو یوں پُرسکون تھا جیسے پریاں اس پر کہانیوں کے رنگ لے کر اتر رہی ہوں۔ چہرے کی سفیدی سُرخی میں بدلتے پا کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے چاہا کہ فہمیدہ کو آواز دے۔ پھر نجانے کیوں اس کا جی چاہا کہ بس ایک ٹک صفیہ کو دیکھتا رہے۔ کسی بھی تیسرے کا اس وقت وہاں آنے کا خیال اسے اچھا نہ لگا۔ آنسوؤں نے صفیہ کا چہرہ شبنم دھلے گلاب کا سا کر دیا تھا۔ بے اختیار وہ جھکا اور صفیہ کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیے۔

یکبارگی صفیہ کا سارا جسم لرز گیا۔ اس نے ہولے سے حرکت کی۔

''طاہر۔۔۔'' ہونٹ لرزے تو آہ نکلی۔

''صفو۔۔۔'' طاہر نے اس کے ہاتھ تھام لئے جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

''طاہر۔۔۔'' آہستہ سے پلکوں کو حرکت ہوئی۔

''صفو میری جان۔۔۔'' طاہر نے اس کے ہاتھ ہونٹوں سے لگا لئے۔

''طاہر۔۔۔'' پلکیں وا ہوئیں تو آنکھوں کے گوشوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔

”بس۔۔۔“ طاہر نے ہونٹوں سے وہ شفاف موتی چن لئے۔ ”بس۔ اب نہیں۔ کبھی نہیں۔“ اس نے گڑیا سی صفیہ کو کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ پھر پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگا۔ اس کی دیوانگی صفیہ کو رُلا رہی تھی۔ کھلا رہی تھی۔ بتا رہی تھی کہ اس کا صبر رنگ لے آیا ہے۔ اس کا طاہر لوٹ آیا ہے۔ وہ اس کے بازوؤں میں بے خودی پڑی اس دیوانگی کو سمیٹ سمیٹ کر دل کے نہاں خانے میں رکھتی رہی۔ سنبھالتی رہی۔ یہ وہ لمحے تھے جن کا وہ کب سے انتظار کر رہی تھی۔ بہار کے یہ پل جو اس کے لئے خواب ہو چکے تھے' خزاں ختم ہو جانے کی نوید لے کر لوٹے تو وہ سرتاپا گلاب ہو گئی۔ ایسا گلاب' جس کی شبنم قطرہ قطرہ طاہر کا غبار دھو رہی تھی۔ یقین اور اعتماد کا غسل دے رہی تھی۔ عشق کا عین' عشق کے شین کا ہاتھ تھامے اپنی پوری وضاحتوں کے ساتھ طاہر پر نازل ہو رہا تھا۔

☆

غسل کر کے طاہر باتھ روم سے نکلا تو صفیہ میز پر ناشتہ سجا چکی تھی۔

”جلدی آ جایئے۔ ایک دم بھوک حملہ آور ہو گئی ہے۔“ وہ اس کے لئے کرسی سرکاتے ہوئے بولی اور گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

”طاہر۔۔۔“ اس کے لبوں پر ایک لفظ مچلا اور وہ مسحور و حیران اسے تکتی رہ گئی۔ سفید شلوار کرتے میں دھلا دھلایا طاہر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر نہیں۔ یہ وہ طاہر تو نہیں تھا جو کل تک اس کے سامنے رہتا تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ ایک عجیب سا نورانی ہالہ جس کے چہرے کو چوم رہا تھا۔ ایک ناقابل برداشت چمک جس کی آنکھوں میں لو دے رہی تھی۔ ایک ملکوتی مسکراہٹ جس کے لبوں پر مہک رہی تھی۔ اسے لگا جیسے طاہر اس کے سامنے نہیں' بہت بلندی پر' بہت اونچی جگہ پر کھڑا اسے دیکھ رہا ہو۔ ایسی بلندی' جس کا اسے ادراک تو ہو رہا تھا' مگر جسے وہ کسی اور کو سمجھا نہ سکتی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ اس کا ذہن ریشمی تاروں میں الجھ کر رہ گیا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ طاہر اپنی جگہ سے اس کی طرف چل پڑا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ گڑبڑا سی گئی۔ گھبرا کر نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ مزید چند لمحے اسے یونہی دیکھتی رہی تو طاہر کو نظر لگ جائے گی۔ کرسی کی پشت پر ہاتھ ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک گہرا سانس لیا۔ جیسے وہ طاہر کی اس شبیہ کو اپنے دل میں' اپنی سانسوں میں' اپنی روح میں اتار لینا چاہتی ہو۔

تینوں ویکھیاں صبر نہ آوے
وے چناں تیرا گھٹ بھر لاں

اس کے اندر سے ایک صدا ابھری اور سارے وجود پر سرور بن کر چھا گئی۔

''کہاں کھو گئیں؟'' طاہر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''یہیں ہوں۔ آپ کے قدموں میں۔'' وہ نشے میں ڈوبی آواز میں بولی اور اس کے سینے میں سما گئی۔

''میری طرف دیکھو۔'' طاہر نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا۔

''نہیں۔'' صفیہ نے مچل کر کہا اور اس سے الگ ہوتے ہوئے چہرہ پھیر لیا۔

''کیوں؟'' طاہر ہولے سے ہنسا۔

''نظر لگ جائے گی آپ کو۔'' صفیہ نے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔

''تمہاری نظر۔۔۔'' طاہر نے مسکراتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ''اور مجھے لگ جائے گی؟'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے صفیہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی۔ ''اور اب بس۔ خاموشی سے ناشتہ کیجئے۔''

''جو حکم سرکار کا۔'' طاہر نے سر خم کیا اور دونوں ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

ناشتہ واقعی خاموشی سے کیا گیا۔ پھر فہمیدہ آئی اور برتن لے گئی۔

صفیہ نے اس کے پیروں سے چپل نکالی اور اسے بستر میں گھس جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے کوئی ہچر مچر نہ کی۔ صفیہ نے کمبل اسے خوب اچھی طرح اوڑھایا اور خود اس کے پاس پیروں کی جانب بیٹھ گئی۔

''میں جانتی ہوں آپ تھکے ہوئے ہیں اور اس وقت آپ کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز نیند ہے لیکن میرا ضبط اور صبر اب ختم ہو رہا ہے۔ مجھے بتائیے کہ کل کا سارا دن اور آج رات آپ کہاں رہے؟ جس حالت میں آپ لوٹے' وہ کوئی اچھی خبر نہ دے رہی تھی۔ مجھے ایک ایک بات بتائیے۔''

''ایک ایک بات۔'' طاہر نے کہا اور اس کی جانب بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''کیوں؟ بتانے کی بات نہیں ہے کیا؟'' صفیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔ پھر نظر ہٹا لی۔ ان بلور آنکھوں کی چمک اس سے سہی نہ گئی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں جو میں تم سے چھپاؤں۔ مگر صفو۔۔۔'' وہ ایک پل کو رکا۔ سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر دائیں ہاتھ سے ماتھا سہلانے لگا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے تو صفو نے زبان کھولی۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''سوچ رہا ہوں۔'' طاہر نے ایک گہرا سانس لیا اور ہاتھ ماتھے سے ہٹا لیا۔ ''تمہیں کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں؟ میں تو خود نہیں جانتا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ بس یوں لگتا ہے کہ میں کسی خواب میں گم ہو گیا تھا۔ جاگا ہوں تو سب کچھ یاد ہے مگر اسے بیان کرنا میرے لئے اتنا ہی مشکل ہے صفو جتنا کسی کو یہ بتانا کہ ہم جس کی عبادت کرتے ہیں وہ کیسا ہے؟ کہاں نہیں ہے؟''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' صفیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''آپ کل گھر سے بابا شاہ مقیم کے مزار پر گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ شام تک لوٹ آئیں گے۔ شام گئی۔ رات ہوئی۔ جب آدھی رات نے دم توڑا تو میرا حال برا ہو گیا۔ آپ کا موبائل بھی یہیں تھا۔ ملک نے بتایا کہ آپ تختی سے منع کر گئے ہیں کہ کوئی آپ کے پیچھے نہ آئے۔ حویلی کے سب لوگ پریشان تھے۔ سب جاگ رہے تھے۔ ملازم ڈیرے پر چلے گئے کہ جب بھی آپ لوٹے، وہ فوراً یہاں خبر کر دیں گے۔ ملک یہیں مردانے میں رک گیا۔ اس کی پریشانی میری وجہ سے دوچند ہو گئی تھی۔ جب مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے مصلہ پکڑ لیا۔ پھر مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کتنا وقت گزرا اور کیسے گزرا۔ آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے میرا بڑی شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ میں آپ کی تلاش میں بابا شاہ مقیم کے مزار کی طرف چل پڑوں۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ تمہاری اس حالت کی خبر ہے مجھے۔'' طاہر نے اس کی جانب نظر اٹھائی۔

''کیسے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''اس نے بتایا تھا۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اب تو گھر چلا جا ورنہ وہ تیری تلاش میں نکل پڑے گی۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟'' صفیہ نے اسے گھبرا کر دیکھا۔

''درویش کی۔'' طاہر ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ''وہ بابا شاہ مقیم کے مزار پر رہتا ہے۔ میں کل سارا دن اور آج رات اسی کے ساتھ تھا۔''

''درویش کے ساتھ؟'' صفیہ اچنبھے سے بولی۔

''ہاں۔ کل جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ مجھے حافظ عبداللہ اور سکینہ کے پاس لے گیا۔''

''حافظ عبداللہ؟ سکینہ؟'' صفیہ اور الجھ گئی۔۔۔ مگر ان دو ناموں کے ساتھ ہی جیسے بات کا سرا طاہر کے ہاتھ آ گیا۔

''ہاں۔'' وہ نیم دراز ہو گیا۔ ''میں تمہیں ان کی کہانی سناتا ہوں صفو۔ ایسی بات تم نے شاید اپنی زندگی میں کبھی نہ سنی ہو گی۔''

پھر وہ ہولے ہولے بولتا رہا۔ کبھی اس کی آواز بھیگ جاتی تو کبھی لہجے میں تھکن اتر آتی۔ کبھی آنکھوں کے گوشے نم ہو جاتے تو کبھی چہرہ لرزہ براندام ہو جاتا۔ بُت بنی صفیہ حافظ عبداللہ اور سکینہ کی داستان سنتی رہی اور ایک ایک پل ایک ایک گھڑی میں یوں سانس لیتی رہی، یوں جیتی رہی جیسے وہ خود سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔

’’اب وہ دونوں نور پور کی مسجد کے حجرے میں یک جان دو قالب بنے بیٹھے ہیں۔ ایک سانس لیتا ہے تو دوسرا زندہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک کا دل دھڑکتا ہے تو دوسرے کا سینہ متحرک لگتا ہے۔ درویش کہتا ہے یہ عشق کا عین ہے جس نے ان دونوں کو اپنی باہوں میں لے لیا ہے۔ عشق کا عین جو عاشق صادق کی عبادت سے شروع ہوتا ہے اور عقیدت تک پھیلا ہوا ہے۔‘‘

طاہر خاموش ہو گیا۔

صفیہ کتنی ہی دیر ایک کیف میں ڈوبی رہی۔ اس کا سارا جسم سنسنا رہا تھا۔ اس سنسناہٹ میں ایک لذت تھی۔ ایک سرور تھا۔ ایسی باتیں اس نے پہلے کب سنی تھیں مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ ان باتوں سے ہمیشہ سے آگاہ ہو۔ ان کا مفہوم اسے قطعاً اجنبی نہ لگا۔ طاہر نے جو کہا ایک ایک لفظ اس کے لئے آشنا نکلا۔ اس بات پر اسے حیرت بھی تھی مگر اس سے زیادہ وہ اس لذت میں گم تھی جس نے اس کے رگ و پے میں سفر شروع کر دیا تھا۔

’’ارے۔۔۔‘‘ آہستہ سے اس نے نظر اٹھائی تو بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔ ’’آپ رو رہے ہیں طاہر؟‘‘ آگے سرک کر وہ اس کے پہلو میں آ گئی۔

’’کہاں؟‘‘ طاہر نے دھیرے سے اپنی آنکھوں کو چھوا۔ اس کے ہاتھ نم ہو گئے تو وہ مسکرا دیا۔ ’’ارے واقعی۔۔۔ مگر کیوں؟ یہ آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟‘‘

’’یہ آنسو نہیں ہیں۔ موتی ہیں۔ گوہر ہیں۔‘‘ صفیہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں سے سارے موتی، سارے گوہر چوم چوم کر چُن لئے۔

طاہر نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لیں اور سر صفیہ کے سینے پر رکھ دیا جو اسے کسی بچے کی طرح سینے سے لگائے بیٹھ گئی۔

’’یہ تو ہوئی دن کی بات۔ رات کی بات ابھی باقی ہے۔ اب وہ سنایئے۔‘‘ وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

’’رات کی بات۔۔۔‘‘ طاہر آہستہ سے ہنسا۔ ’’اچھا کہا تم نے۔ رات کی بات۔‘‘ اس نے دہرایا۔ ’’کہتے ہیں رات گئی بات گئی۔۔۔ مگر صفو۔ لگتا ہے جو رات میں درویش کے ساتھ گزار کر آیا ہوں، اس کی بات تو شروع ہی اب ہوئی

ہے۔ ختم کب ہوگی، کون جانے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

صفیہ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ جب خاموشی طویل ہو گئی تو اس نے آہستہ سے طاہر کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ تو سکون سے سو رہا تھا۔ صفیہ اس کے چہرے کو وارفتگی سے تکتی رہی۔ جی ہی نہ بھر رہا تھا اسے دیکھ دیکھ کر۔ دھیرے سے اس نے طاہر کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ پھر دونوں رخساروں پر پیار کیا۔ آخر میں پیشانی کو نرم ہونٹوں سے چھوا اور اسے بستر پر آرام سے لٹایا اور بیڈ سوئچ دبا کر لائٹ آف کر دی۔ وہ طاہر کو خوب سونے دینا چاہتی تھی۔ کمبل اس پر اچھی طرح اوڑھا کر کے وہ اس کے پاؤں کی طرف سمٹ کر یوں لیٹ گئی کہ طاہر کے پاؤں اس کے بازوؤں کے حلقے میں سینے کے ساتھ بھنچے تھے اور ہونٹ تلووں کو چھو رہے تھے۔

کمرے کے نیم اندھیرے میں سکون نے آہستہ سے آنکھ کھولی اور کسی پہرے دار کی طرح ان کی رکھوالی کرنے لگا۔

☆

جدہ ایر پورٹ پر بیگم صاحبہ، اعجاز اور ڈاکٹر ہاشمی بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے بعد فلائٹ کی اناؤنسمنٹ کے انتظار میں لاؤنج میں چلے آئے۔

عمرہ کے بعد انہوں نے مدینہ شریف میں پورے دو ماہ گزارے تھے۔ اب مزید قیام بڑھوانا ممکن نہ رہا تو مجبوراً بیگم صاحبہ نے واپسی کی تیاری کر لی۔ طاہر اور صفیہ کے ساتھ ساتھ وسیلہ خاتون کو بھی واپسی کی اطلاع دو دن پہلے دی جا چکی تھی۔ فلائٹ کا وقت تین بجے کا تھا۔ ابھی دو بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔

بیگم صاحبہ، اعجاز اور ڈاکٹر ہاشمی آمنے سامنے گدیلے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں تسبیح چل رہی تھی جبکہ ڈاکٹر ہاشمی ایر پورٹ کی گہما گہمی کو نظروں میں تولتے ہوئے کاؤنٹر پر انگوٹھا چلا رہے تھے۔ رہ گیا اعجاز تو وہ سوائے بتیاں دیکھنے کے اور کیا کرتا۔

”ارے۔۔۔“ ایک دم بیگم صاحبہ کے ہونٹوں سے تحیر بھری آواز نکلی۔ وہ ڈاکٹر ہاشمی کے پچھلی طرف کسی کو دیکھ رہی تھیں۔

”کیا ہوا بیگم صاحبہ؟“ ڈاکٹر ہاشمی چونکے۔

”ڈاکٹر صاحب۔ یہ اپنا سرمد یہاں کیا کر رہا ہے؟“ وہ جلدی سے بولیں۔

”سرمد۔۔۔ اور یہاں؟“ ڈاکٹر ہاشمی نے حیرت سے کہا اور پلٹ کر دیکھا۔ ”ارے ہاں۔ یہ تو سرمد ہی ہے۔“ وہ اٹھ گئے۔ ”آپ بیٹھئے۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر جاتے سرمد کی طرف بڑھے جو احرام باندھے خارجی دروازے کی طرف چلا جا رہا تھا۔

”سرمد۔۔۔“ انہوں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

سر جھکائے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا سرمد رک گیا۔ بڑی آہستگی سے اس نے گردن گھمائی اور ڈاکٹر ہاشمی کی جانب دیکھا۔

ڈاکٹر ہاشمی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دونوں باپ بیٹا آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سرمد کندھے پر سفری بیگ

ڈالے بڑی سپاٹ سی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر ہاشمی اس کے سُتے ہوئے زرد اور بجھے بجھے چہرے کو حیرت سے جانچ رہے تھے۔

’’ارے ابو آپ۔۔۔‘‘ بڑی آہستگی سے سرمد کی آنکھوں میں شناسائی جاگی۔ جیسے اس نے انہیں پہچاننے میں بڑی دقت محسوس کی ہو۔

’’سرمد۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی اس کے کمزور سراپے کو نظروں سے کھنگالتے ہوئے بولے۔ ’’یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے بیٹے۔ تمہاری صحت کو کیا ہوا؟‘‘ انہوں سے سرمد کو گلے لگا لیا۔

’’صحت کو کیا ہوا ابو۔ اچھی بھلی تو ہے۔‘‘ وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا اور ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

’’خاک اچھی ہے۔ مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے اسے بھینچ لیا۔ پھر اس کی گردن پر بوسہ دیتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔

’’مجھے کچھ نہیں ہوا ابو۔ آپ کو وہم ہو رہا ہے۔‘‘ نم آنکھوں سے باپ کو دیکھ کر سرمد نے کہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ ماں جیسی شفقت لٹاتے باپ کے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئے۔ اتنا روئے کہ اندر رکا ہوا سارا غبار دھل جائے۔ جل تھل ہو جائے۔۔۔ مگر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

’’آپ عمرے سے فارغ ہو گئے اور میں کرنے جا رہا ہوں۔‘‘ سرمد نے باپ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

’’آؤ۔ ادھر آؤ۔ بیگم صاحبہ سے ملو۔‘‘ وہ اسے لئے ہوئے بیگم صاحبہ کے پاس چلے آئے۔ سرمد نے انہیں ادب سے سلام کیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اعجاز کو جیسے اس نے دیکھا ہی نہ تھا۔

’’ارے بیٹے۔ یہ تمہاری صحت کو کیا ہو گیا؟‘‘ بیگم صاحبہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

’’یہی ابو بھی کہہ رہے ہیں آنٹی۔‘‘ وہ ہنسا۔ ’’مگر میں تو خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔‘‘

’’ہم دونوں غلط کہہ رہے ہیں اور تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے خفگی سے کہا تو سرمد نے سر جھکا لیا۔

’’چلئے ابو۔ آپ ہی ٹھیک ہیں۔‘‘

’’تو اب سیدھے سیدھے بتا دو کہ تمہاری اس کمزوری اور خراب صحت کا سبب کیا ہے؟‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے تلخی سے کہا۔

’’کچھ خاص نہیں ابو۔ بس بخار نے یہ حالت کر دی۔ چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ واپس جاتے ہی اپنا

علاج باقاعدگی سے کراؤں گا۔“

”واپس کہاں؟“ ڈاکٹر ہاشمی نے سختی سے کہا۔ ”تم عمرہ کر کے سیدھے پاکستان آؤ گے۔ رزلٹ آ چکا ہے۔ اب واپس جانا ضروری نہیں ہے۔“

”مگر ابو۔ مجھے ساری کاغذی کارروائیاں پوری کرنا ہیں۔ اپنے رزلٹ ڈاکومنٹس وصول کرنا ہیں اور۔۔۔“

”کچھ نہیں سنوں گا میں۔“ ڈاکٹر ہاشمی نے اسی لہجے میں کہا۔ ان کا دل تڑپ رہا تھا۔ پھول جیسا بیٹا سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کوئی روگ اندر ہی اندر اسے چاٹ رہا ہے۔ انہوں نے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ مگر وہ سرمد سے بات کئے بغیر کسی نتیجے پر پہنچنا نہ چاہتے تھے۔ اور بات کرنے کے لئے یہ جگہ مناسب تھی نہ یہ ماحول۔

بیگم صاحبہ بھی اندر ہی اندر کسی سوچ کے گرد خیالوں کا جال بُن رہی تھیں۔ باپ بیٹے کی گفتگو میں انہوں نے کوئی دخل نہ دیا۔ تاہم اتنا تو وہ بھی سمجھ ہی سکتی تھیں کہ بخار جینے کی امنگ چھین لیتا ہے نہ زندگی کو بے رونق کر دیتا ہے۔ سرمد کی آنکھوں میں زندگی کی وہ علامت مفقود تھی جو چمک چمک کر انسان کو حالات کے سامنے سینہ سپر رکھتی ہے۔ اسے دیکھ کر تو لگتا تھا وہ جینا ہی نہیں چاہتا۔ بس کسی مجبور کی طرح سانس لے رہا ہے کہ موت آنے تک زندہ کہلا سکے۔ ان کا جی چاہا ڈاکٹر ہاشمی سے کہیں کہ سرمد کی اس حالت کا سبب ضرور کوئی جذباتی حادثہ ہے۔ طاہر کی ماں ہونے کے ناطے وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ محبت کی چوٹ سے بڑا کوئی ایسا حادثہ نہیں ہے جو انسان کو نیم جان کر دے مگر پھر انہوں نے بھی اس بات کو پاکستان پہنچنے تک کے لئے موقوف کر دیا۔

”تم عمرہ کر کے فوراً وطن پہنچو۔ اور اگر تمہارا ارادہ کسی گڑبڑ کا ہے تو میں کچھ بھی کر کے رک جاتا ہوں۔ تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔“ ڈاکٹر ہاشمی نے کہا تو سرمد گھبرا گیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں ابو۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے لندن نہیں جاؤں گا۔“

”لندن نہیں جاؤ گے اور پاکستان آؤ گے۔ یوں کہو۔“ ڈاکٹر ہاشمی نے لفظوں پر گرفت کمزور نہ ہونے دی۔

”جی ہاں۔ ایسا ہی ہو گا۔“ وہ بیچارگی سے ہنس پڑا۔

”پیسے ویسے ہیں؟“ انہوں نے جیب سے پرس نکالا۔

”وافر ہیں ابو۔ ضرورت ہوتی تو میں خود ہی کہہ دیتا۔“ اس نے انہیں روک دیا۔

”پھر بھی یہ رکھ لو۔“ انہوں نے ویزا کارڈ پرس سے نکال کر اسے تھما دیا۔

سرمد جانتا تھا ضد کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے اس نے خاموشی سے کارڈ بیگ کھول کر اندر رکھ لیا۔

اسی وقت پاکستان جانے والی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ کی جانے لگی۔

’’اپنا خیال رکھنا۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ اور سرمد بھی اٹھ گئے۔ انہوں نے کھینچ کر اسے پھر گلے سے لگا لیا۔ وہ بھی باپ کے سینے سے لگا ایسے سکون میں ڈوب گیا جس نے اس کی آنکھیں نم کر دیں۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ تب دونوں الگ ہوئے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے چشمہ اتارا۔ رومال سے آنکھیں خشک کیں۔ سرمد کی آنکھیں پونچھیں۔

’’ارے۔ آپ تو بچوں کی طرح جذباتی ہو گئے ڈاکٹر صاحب۔‘‘ بیگم صاحبہ نے صورتحال کو مزید گھمبیر ہونے سے بچانا چاہا۔

’’یہ میرا اکلوتا بچہ ہے بیگم صاحبہ اور میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان ویسے ہی بچہ بن جاتا ہے۔‘‘ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائے تو سنجیدگی میں خاصی کمی آ گئی۔

’’اچھا آنٹی۔ اللہ حافظ۔‘‘ سرمد نے سر جھکا دیا۔ بیگم صاحبہ نے اس کے سر پہ پیار دیا اور پیشانی چوم لی۔

’’جیتے رہو۔ جلدی پاکستان آ جانا۔ زیادہ انتظار نہ کرانا ہمارے ڈاکٹر صاحب کو۔‘‘

’’جی آنٹی۔‘‘ اس نے مختصراً کہا اور باپ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ’’اپنا خیال رکھئے گا ابو۔ میرا ابھی اور کون ہے آپ کے سوا۔‘‘

’’جلدی آ جانا۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ہونٹ دانتوں میں داب لیا۔ نجانے کیوں ابھی تک انہیں سرمد کے پاکستان چلے آنے کا یقین نہ ہو رہا تھا۔

’’جی ابو۔‘‘ اس نے باپ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تیزی سے پلٹا اور خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب تک وہ باہر نہ نکل گیا، ڈاکٹر ہاشمی اسے ایک ٹک دیکھتے رہے۔ پھر جب وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو بیگم صاحبہ کی طرف مڑے۔

’’نجانے کیا ہو گیا ہے اسے؟‘‘ وہ آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے بڑبڑائے۔

’’اسے پاکستان آ لینے دیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔‘‘ بیگم صاحبہ نے انہیں تسلی دی لیکن نجانے کیوں یہ الفاظ کہتے ہوئے ان کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔

’’آیئے۔ چلیں۔‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رن وے کی جانب کھلنے والے گیٹ کا رخ کیا۔ بیگم صاحبہ نے ایک نظر پلٹ کر اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے چند لمحے پہلے سرمد باہر گیا تھا۔ پھر انجاز کے ساتھ ڈاکٹر ہاشمی کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

☆

جس دن سرمد کی وسیلہ خاتون سے بات ہوئی' وہ اس کی زندگی میں مسکراہٹوں اور شگفتگی کا آخری دن تھا۔

ہنستا کھیلتا' زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتا سرمد ایک دم مرجھا گیا۔ اس کے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں اس کی حالت پر پہلے تو حیران ہوئے۔ اسے بہلانے اور کریدنے کی کوششیں کرتے رہے۔ اس کے لبوں سے چھن جانے والی ہنسی کی واپسی کے راستے ڈھونڈتے رہے لیکن جب انہیں اپنی ہر کوشش میں ناکامی ہوئی تو آہستہ آہستہ وہ اس سے دور ہوتے چلے گئے۔ لندن کی ہنگامہ خیز رُتوں میں کسی کے پاس اس پر ضائع کرنے کے لئے وقت نہ تھا۔ ایک انڈین لڑکی ریحا نے بڑے دنوں تک اس کا انتظار کیا۔ اس کے فلیٹ کے چکر کاٹے۔ دن رات کی پرواہ کئے بغیر اسے اپنے ماحول میں کھینچ لانے کے جتن کئے مگر جب سرمد کی اداسی بڑھتی ہی چلی گئی۔ صحت مسلسل گرنے لگی اور ہونٹوں پر سوائے آہوں کے کچھ نہ رہا تو وہ بھی مایوس ہو کر لوٹ گئی۔

رزلٹ کے بعد یہ مہینہ بھر کا وقت پارٹیوں' ہاؤ ہو اور مستی کا تھا۔ سرمد کے گروپ کے سبھی سٹوڈنٹ کامیاب ہوئے تھے۔ واپس اپنے اپنے ملک جانے سے پہلے وہ آخری دنوں کو یادگار بنا دینا چاہتے تھے۔ سرمد ان سے کٹتا کٹتا بالکل اکیلا ہو گیا تو وہ اسے بھولنے لگے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ پورا ایک ہفتہ اپنے فلیٹ میں پڑا بخار سے جنگ لڑتا رہا اور کوئی اسے ملنے بھی نہ آیا۔ اس دن کے بعد وہ خود ہی ان سب سے دور ہو گیا۔

وہ کرتا بھی کیا؟ اس نے اپنے حساب میں کوئی غلطی کی تھی نہ وقت ضائع کیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ اپنے طور پر کی ہوئی کمٹ منٹ نبھانے کے لئے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنا رزلٹ آنے تک وہ ان سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ جب اس کا رزلٹ نکلا تو اپنے آپ سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق اس نے سب سے پہلے انہیں یہ خوشخبری سنانا چاہی مگر ساتھ ہی اس خیال سے کہ اس اچھی خبر کے بعد وہ انہیں صفیہ کے رشتے کے لئے اس کے گھر جانے کو کہے گا' وسیلہ خاتون سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ اسے بظاہر اپنے لئے انکار کی کوئی وجہ نظر نہ آ رہی تھی' پھر بھی وہ ان کا عندیہ لے لینا چاہتا تھا۔ تاکہ کسی بھی قسم کی کوئی بدمزگی پیدا ہی نہ ہو۔ اس کی یہ احتیاط ایک طرف اگر اس کے لئے زندگی بھر کے زخم کا پیغام لے کر آئی تو دوسری طرف باپ سے اس بارے میں بات کر کے جو شرمندگی اس کے حصے میں آنے والی تھی' اس سے بچ گیا۔

سب باتیں اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت تھیں مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو دھڑکنا ہی بھولتا جا رہا تھا۔ صفیہ کا خیال اب اس کے لئے شجرِ ممنوعہ تھا مگر وہ اس کے خیال سے دامن چھڑاتا تو کیسے؟ اس کی راتیں بے خواب ہو گئیں۔ دن بے رونق ہو گئے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ ٹیس بنتا چلا گیا۔ سانس لیتا تو آہ نکلتی۔ آنکھ اٹھاتا تو ہر طرف اس دشمن جاں کی تصویر

بھی نظر آتی جو کبھی اس کی تھی ہی نہیں ۔ وہ اکیلا ہی اس آگ میں جلتا رہا تھا۔ اس نے صفیہ کے ساتھ گزرے ہوئے ایک ایک پل میں جھانکا۔ کسی جگہ اسے صفیہ کی جانب سے کوئی ہمت افزائی کا اشارہ نہ ملا۔ کہیں اس کی نظروں سے چھلکنے والا کوئی پیغام نہ تھا۔ وہ کس وہم کے سہارے زندگی میں اس کے تصور کو جینے کا بہانہ مان لیتا؟ اگر یہ عشق تھا تو یک طرفہ تھا۔ اگر یہ محبت تھی تو صرف اسی کی طرف سے تھی ۔ اگر یہ پیار تھا تو اس میں صفیہ کی رضا کہیں نہ تھی ۔

آہیں' آنسو' پچھتاوا۔ یہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ صفیہ کا خیال آتا تو آہ ہونٹوں پر مچل جاتی۔ اس کے طاہر کا ہو جانے کے بارے میں سوچتا تو آنسو دل کا دامن بھگو دیتے۔ اپنی طرف سے کی گئی دیر پچھتاوا بن کر دل مسل ڈالتی تو وہ تڑپ تڑپ جاتا۔ بڑی کوشش کی کہ کسی طرح خود کو سنبھال لے مگر عشق میں ناکامی کا داغ ایسی آسانی سے ڈھل جانے والا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ یہ ناسور تو ایسا تھا جو اندر کی جانب رستا تھا۔ اس کا سارا زہر سوچوں اور خیالوں میں اترتا اور وہیں پڑا چرکے لگایا کرتا۔ وہ چند ہفتوں ہی میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

ایک دن فلیٹ کے پتے پر خط آیا۔ کھولا تو یونیورسٹی کی طرف سے انویٹیشن تھا۔ یونیورسٹی والوں نے کامیاب طلبہ کے اعزاز میں ایک فنکشن ارینج کیا تھا جس میں انہیں ڈگریاں دی جانے والی تھیں۔ تب اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی تک باپ کو اپنی کامیابی کی اطلاع ہی نہیں دی۔ خود کو سنبھالا کہ باپ کہیں اس کی آواز اور لہجے سے اس کے دکھ کا بھید نہ جان لے۔ پھر اسے فون کیا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے اس کی آواز سن کر بیتابی سے پوچھا کہ اتنے دنوں تک رابطہ کیوں نہیں کیا۔ بتایا کہ وہ اسے وقفے وقفے سے کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر اس کا موبائل نہ مل رہا تھا۔ سرمد نے بہانہ کیا کہ موبائل خراب تھا اور وہ رزلٹ آنے پر ہی انہیں بتانا چاہتا تھا اس لئے جان بوجھ کر رابطہ نہیں کیا۔ وہ اس کی کامیابی کا سن کر پھولے نہ سمائے ۔ اس وقت سرمد کو پتہ چلا کہ وہ پاکستان میں نہیں' ارض حجاز پر ہیں۔

تقسیم اسناد کی تقریب میں شرکت کے لئے وہ عین وقت پر گیا اور ڈگری وصول کر کے نکل آیا۔ ریحا نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ لوٹ آیا۔

اب اس کا لندن میں کوئی کام نہ تھا۔ اہم امور نمٹانے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگ جاتا۔ اس کے بعد وہ وطن جا سکتا تھا مگر وہ وہاں نہ جانے کے بارے میں اپنا فیصلہ وسیلہ خاتون کو سنا چکا تھا۔ ویسے بھی وہ وہاں جا کر کیا کرتا؟ خود پر قابو نہ رکھ پاتا تو معمولی سی حرکت صفیہ کے لئے وبال جان بن سکتی تھی۔ اس نے عزم کر لیا کہ کبھی پاکستان نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر ہاشمی کو کس طرح سمجھایا جاتا' اس بات کو اس نے آنے والے وقت پر چھوڑ دیا۔

پندرہ دن پہلے آخری بار اس کی بات ڈاکٹر ہاشمی سے ہوئی۔ ان کا ارادہ ابھی مزید مدینہ شریف میں رکنے کا تھا۔ تین مہینے کا وقت پورا کئے بغیر وہ واپس پاکستان جانا چاہتے تھے نہ بیگم صاحبہ۔

اب پہلی بار وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پندرہ دن بعد جب ڈاکٹر ہاشمی کا ارضِ حجاز پر قیام ختم ہو جاتا تو وہ لازماً واپس چلے جاتے۔ پھر وہ لندن میں مزید رکنے کا کیا بہانہ کرتا؟

سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھوڑا بن گیا۔ ایک طرف صفیہ سے دور رہنے کا ارادہ اور دوسری طرف تنہائی کا مارا باپ۔ جو اس کے لئے گن گن کر دن گزار رہا تھا۔

اس شام ریحا اس سے ملنے آئی۔ دونوں کتنی ہی دیر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ وہ اس کی حالت پر بیحد دُکھی تھی۔

''سرمد۔'' خاموشی طویل ہو گئی تو ریحا نے لب کھولے۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔'' اس نے بجھی بجھی نظروں سے اس کے ملیح چہرے کو دیکھا۔

''مجھے تمہارے نجی معاملے میں دخل تو نہیں دینا چاہئے لیکن ہم نے ابھی تک بڑا اچھا وقت گزارا ہے۔ تم اسے دوستی کہہ لو مگر میں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں رکھتی کہ میں تم میں انٹرسٹڈ تھی۔ آں ہاں۔۔۔ چونکو مت۔'' ریحا نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''اسی لئے میں اب تک تمہارے لئے خوار ہو رہی ہوں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے تھے مگر میں ڈھیٹ بن کر تمہارے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم دونوں کا مذہب جدا ہے۔ کلچر جدا ہے۔ رہن سہن جدا ہے' میں اس آس پر تمہیں مائل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ تم لندن کے آزاد ماحول میں پل بڑھ رہے ہو۔ ہم کسی نہ کسی کمپرومائز پر پہنچ کر ایک ہو جائیں گے۔ تمہاری ایک دم بدل جانے کی کیفیت نے مجھے تم سے قریب رکھا جب میں نے پوری طرح جان لیا کہ ہماری یونیورسٹی کی یا باہر کی کسی لڑکی میں تم انٹرسٹڈ نہیں ہو۔ مگر تمہارے گریزاں رویے نے مجھے بددل کر دیا تو میں کچھ دنوں کے لئے تم سے دور چلی گئی۔ یہ سوچ کر کہ شاید میری دوری تمہیں میرے ہونے کا احساس دلائے اور تم مجھ سے ملنا چاہو مگر۔۔۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ''یہ میری بھول تھی۔ تم آج بھی ویسے ہی ہو جیسے چند ماہ پہلے پتھر ہو گئے۔ بہرحال۔۔۔'' اس نے اپنے بال جھٹکے سے چہرے سے ہٹائے اور اس کی حیران حیران آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ''آج میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا تمہاری یہ حالت کسی لڑکی کی وجہ سے ہے؟''

سرمد نے اس سے نظریں چرا لیں۔ اس کے لب کانپے اور سر جھک گیا۔

''خاموش مت رہو سرمد۔'' وہ اٹھی اور اس کے سامنے قالین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور اسے والہانہ دیکھنے لگی۔ ''یہ مت سوچو کہ تمہارے اقرار سے مجھے دُکھ ہو گا۔ ہو گا مگر اس سے زیادہ یہ ضروری ہے سرمد کہ میں حقیقت جان لوں تاکہ مجھے یہ پچھتاوا نہ رہے کہ میں نے تم سے اصل بات جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بولو سرمد۔ ویسے بھی جب تک تم اپنا دُکھ کسی کو بتاؤ گے نہیں' تمہارے غم کا مداوا نہ ہو سکے گا۔ یہی سوچ کر بولو سرمد کہ شاید

میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔"

بے اختیار سرمد کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور ریحا کے ہاتھوں پر گرے۔

"سرمد۔" بے چین ہو کر ریحا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا' جس پر کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو نے اداسی اور یاسیت ٹھونس دی تھی۔

"میں کیا بولوں ریحا؟" وہ یوں رو دیا جیسے اسے اب تک ریحا ہی کے کندھے کا انتظار تھا۔ ریحا اٹھی اور اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ سرمد نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور اس کی گود میں سر رکھ کر بلکنے لگا۔ ریحا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

جی بھر کر رو لیا تو سرمد کا من ہلکا ہو گیا۔ ریحا نے اس کا منہ ہاتھ دھلوایا۔ اصرار کر کے شیو کرائی۔ کپڑے بدلوائے اور اپنی ننھی سی ٹوسیٹر میں اسے ہل پارک میں لے آئی۔

شام ہونے کو تھی۔ آمنے سامنے گھاس کے فرش پر بیٹھے جب چند منٹ سکوت کے عالم میں گزر گئے تو ریحا نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر سہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو سرمد جی۔ اب کھل جائیے۔ ذرا بتائیے تو کہ وہ کون مہ وش ہے جس نے ہمارے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے؟"

"ڈاکہ؟" سرمد نے نظریں اٹھائیں اور مسکراتی ہوئی ریحا کو دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بھی ابھری۔ پھر یہ مسکراہٹ ایک سرد آہ میں بدل گئی۔

"وہ مجھ سے ٹیوشن پڑھا کرتی تھی ریحا۔۔۔" ہولے ہولے اس نے کہنا شروع کیا۔ ریحا سنتی رہی اور جب سرمد نے بات ختم کی تو ریحا کو اداسی پوری طرح گرفت میں لے چکی تھی۔

سرمد خاموش ہو گیا۔

ریحا سر جھکائے تنکے توڑتی رہی۔ لگا جیسے اسے سرمد کی بات ختم ہونے کا پتہ ہی نہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تب ہوا کے ایک سرد جھونکے نے انہیں کپکپا کر رکھ دیا۔

ریحا نے سر اٹھایا۔ شام اتر آئی تھی۔ پرندے چہچہانا ختم کر چکے تھے۔ پارک سے لوگ رخصت ہو رہے تھے۔

"تمہارا اداس ہونا سمجھ میں آتا ہے سرمد۔" ریحا نے ایک گہرا سانس لیا۔ "واقعی۔ بات ہی ایسی ہے کہ انسان اپنے قابو سے باہر ہو جاتا ہے' جیسے کہ تم۔۔۔ مگر اب کیا؟ ساری زندگی تو دکھ کی یہ چادر اوڑھ کر نہیں گزاری جا سکتی۔"

"گزاری جا سکتی ہے ریحا۔" پہلی بار سرمد کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ بکھری۔ "آج سے پہلے مجھے بھی

یہ زندگی بوجھل لگتی تھی۔ سانس جیسے سینے میں آرا بن کر چلتا تھا۔ چاہتا تھا کہ جیسے تیسے یہ جینا ختم کر کے دنیا سے چل دوں مگر۔۔۔'' اس نے بڑی محبت سے ریحا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آج تمہارے کندھے پر سر رکھ کر رولیا ہے تو لگتا ہے سانس لینا آسان ہو گیا ہے۔ میں تمہارا یہ احسان مرتے دم تک یاد رکھوں گا ریحا۔ تم نے میرا من دھو کر سارا غبار اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ اب صفیہ کا دُکھ دُکھ نہیں رہا۔ ایک نشہ بن گیا ہے۔ اس کی یاد اب نشتر نہیں چبھوتی' ٹیس بن کر درد جگاتی ہے۔ اس درد میں ایک لذت ہے ریحا۔ میں نے ایسی لذت کبھی محسوس ہی نہیں کی' جس سے آج گزر رہا ہوں۔ یاد ایسی مست بھی ہوتی ہے' مجھے اس سے تم نے آشنا کیا۔ یہ غم کا مزہ تمہاری دین ہے۔ صفیہ کے ساتھ تمہاری یاد جُڑ گئی ہے ریحا۔ اسے میں چاہوں بھی تو الگ نہیں کر سکتا۔''

''میں ایسی گہری اور مشکل باتیں نہ کر سکتی ہوں نہ سوچ سکتی ہوں سرمد۔'' ریحا نے مسکرا کر کہا۔ ''بس یہ جان کر خوش ہوں کہ اب تم زندگی کی طرف لوٹ رہے ہو۔ ساری بات سمجھ کر ایک امید کی جوت دل میں جگا لی ہے میں نے کہ شاید ایک دن تم میرے پاس آ جاؤ اور کہو کہ ریحا۔ مجھے اپنی باہوں میں لے لو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ آ ؤ مل کر ایک آشیانہ بنائیں جس میں۔۔۔''

''بس۔'' سرمد نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ''مجھ سے کوئی وعدہ نہ لینا ریحا۔ اگر تم میرا نصیب ہو تو ایسا ضرور ہو گا اور اگر میں تمہارا حصہ نہیں ہوں تو آرزو کا پودا پالنے سے کوئی کسی کو نہیں روک سکتا۔''

''جانتی ہوں۔'' ریحا نے اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور چوم لیا۔ ''تمہارا یہ بوسہ میرے لئے کافی ہے۔ تمہارا یہ لمس میری تمنا کے پودے کو سینچتا رہے گا سرمد۔ میں جب تک ممکن ہو سکا تمہارا انتظار ضرور کروں گی۔ زندگی کے آخری سانس تک انتظار کا وعدہ اس لئے نہیں کر سکتی کہ ماں باپ کی نافرمان نہیں ہونا چاہتی تاہم کوشش کروں گی کہ اس وقت تک کسی کی سیج نہ سجاؤں جب تک تمہاری طرف سے ناامیدی کی خزاں کا جھونکا میرے یقین کے گلشن میں نہ در آئے۔''

ایک عجیب سے وعدے اور امید کے دیپ دلوں میں جلا کر دونوں اٹھے اور چل پڑے۔ اسے فلیٹ پر چھوڑ کر ریحا نے باہر ہی سے رخصت چاہی تو سرمد کو پتہ چلا کہ وہ اگلے دن واپس انڈیا جا رہی ہے۔

''کبھی لوٹنا چاہو تو بڑا سیدھا سا پتہ ہے سرمد۔ سری نگر میں جموں کشمیر روڈ پر کوٹھی نمبر تین میرا گھر ہے۔ میرا موبائل نمبر تمہیں ازبر ہے۔ کوشش کرنا کہ یہ سیٹ تم بھی کبھی نہ بدلو جس کا نمبر میرے پاس ہے۔ اس پر میں اکثر تمہیں تنگ کرتی رہوں گی۔''

''واپس جا کر کیا کرو گی؟'' سرمد نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

’’سب سے پہلے ماں سیتا کے مندر جاؤں گی۔ ان سے تمہیں مانگوں گی۔ فرقت کا دُکھ وہ خوب سمجھتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر تم میرے نصیب میں نہیں بھی ہو تو وہ میرا نصیب بدل دیں گی۔ تمہیں ضرور میرے دامن میں ڈال دیں گی۔۔۔ اور جب تک ایسا ہو نہیں جاتا تب تک مجھے سکون اور سُکھ کا وردان ضرور دیں گی۔‘‘

ریحا نے اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگایا۔ آنکھوں سے مس کیا اور اس کی جانب دیکھے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہوگئی۔ شاید اس میں جاتے ہوئے سرمد کو چھوڑ جانے کے احساس سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ تھی۔

ریحا چلی گئی۔

مگر۔۔۔ وہ اپنی جگہ بُت بنا کھڑا تھا۔ اس کے دماغ میں بگولے سے چکرا رہے تھے۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ کیا کہہ گئی تھی ریحا؟ اس کا ایک بُت پر کیسا پختہ یقین تھا۔ اسے کیسا اعتماد تھا ایک پتھر پر کہ وہ اس کا مقدر بدل دے گا۔ اسے سکون اور اطمینان بخش دے گا۔ ہونی کو انہونی کر دکھائے گا۔ یہ ایک باطل مفروضے پر قائم مذہب نما ڈھکوسلے پر یقین رکھنے والی ریحا کا حال تھا اور وہ خود جو ایک آفاقی‘ ازلی و ابدی سچ کے حامل دین کا پیروکار تھا۔ جس کا ایمان ایک‘ اکیلے اور واحد اللہ پر تھا۔ اس کی سوچ اپنے معبود کی طرف گئی ہی نہ تھی جو اسے سب کچھ دے سکتا تھا۔ انہونی کو ہونی کر سکتا تھا۔ سکون اور سُکھ کے لئے جس کی طرف رجوع کر لینا ہی کافی تھا۔ وہ اس کے بارے میں اب تک غفلت کا شکار تھا۔

ندامت سے اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ جسم میں شرمندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ صفیہ تو اب اس کی نہ ہو سکتی تھی مگر اس نے اپنے خالق سے اس زخم کا تریاق مانگا ہی نہ تھا۔ تنہائی اوڑھ لی تھی۔ اداسی پہن لی تھی۔ نا امیدی کے رستے پر تھکے تھکے قدم اٹھاتا وہ زندگی کا لاشہ گھسیٹ رہا تھا۔ بھول گیا تھا کہ ہر غم‘ ہر دُکھ‘ ہر زخم کا مداوا جس کے پاس ہے وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کے پکار لینے کا ہر آن منتظر ہے۔

ایک بُت پرست نے اپنے دو فقروں سے اسے ملیامیٹ کر دیا۔ گرتا پڑتا وہ فلیٹ میں پہنچا اور قبلہ رخ ہو کر سجدے میں گر پڑا۔ کچھ نہ کہا۔ کچھ نہ بولا۔ بس روتا رہا۔ ہچکیاں لیتا رہا۔ سسکتا رہا۔ اس کے حضور ندامت کی سب سے اعلیٰ زبان آنسو ہیں اور آنسو اسے جس قدر پسند ہیں‘ اس کے بارے میں آنسو بہانے والا سب سے بہتر جانتا ہے۔ یہ آبگینے جب جب پھوٹتے ہیں تب تب اس کے دربار میں بیش قیمت ہوتے جاتے ہیں۔

دوسرے دن اس نے عمرے کے لئے ویزا اپلائی کر دیا۔ اس کے اندر ایک اور ہی شمع روشن ہوگئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا اُڑ کر حرم جا پہنچے۔ اپنے آقا ﷺ کے حضور جائے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ اسے شرم آتی تھی ریحا کے پتھر کے بے جان بھگوان کے بارے میں سوچ کر۔ جس کا ذکر کر کے ریحا نے اسے اس کے سچے خدا کی طرف رجوع کا ادراک

بہم پہنچایا تھا۔ ریحا کا یہ دوسرا احسان اس کے پہلے احسان سے بھی بڑا تھا جو اس نے سرمد کی ذات پر کیا تھا۔

* * *

ڈاکٹر ہاشمی سے رخصت ہوکر وہ ایئرپورٹ سے باہر نکلا اور مکہ کے لئے روانہ ہوگیا۔

ہوٹل میں سامان رکھ کر حرم پہنچا تو اس کی حالت غیر ہوگئی۔ جسم سے جان نکل گئی۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ وہ گرتا پڑتا صحن حرم میں داخل ہوا اور گر پڑا۔ اپنے رب کے گھر کے سامنے سجدے میں پڑا وہ سسک رہا تھا۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ اس کا سر اٹھانے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ پھر جیسے دل کو قرار سا آ گیا۔ سکون اس کا شانہ تھپک کر تسلی دیتا ہوا جسم و جان میں اتر گیا۔ آنسو خشک ہوگئے یا شاید ختم ہوگئے۔

اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ کعبۃ اپنے اللہ کے پہلے اور آخری گھر پر نظر ڈالی۔ اسے لگا' کعبہ اسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ باہیں پسارے اسے سینے سے لگانے کو اشارے کر رہا ہے۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور عمرے کے ارکان ادا کرنے لگا۔ حجرِ اسود کو چومنے کے لئے جھکا تو ایک خیال برق کی طرح اس کے دل و دماغ میں روشنی دے گیا۔

''اسے میرے آقا ﷺ نے بوسہ دیا ہے۔''

اس کے لئے حجرِ اسود کا بوسہ لینا مشکل ہوگیا۔ جس پتھر کو اس کے آقا ﷺ نے اپنے لبِ اطہر سے چوما تھا' وہ اسے کس ادب سے بوسہ دے؟ کس احترام سے ہونٹوں سے لگائے؟ لرزتے کانپتے ہوئے اس نے اس جنتی پتھر کو بوسہ دیا اور بادل نخواستہ پیچھے ہٹ گیا۔ طواف کرتے کرتے وہ جب بھی حجرِ اسود کے بوسے کے لئے رکا' اس کی یہی حالت ہوئی۔

وہ مکہ میں ارکان عمرہ سے فارغ ہوگیا۔ اب اسے مدینہ شریف جانا تھا۔ اپنے اللہ کے حبیب پاک ﷺ کے حضور حاضر ہونا تھا۔ اپنے آقا و مولا ﷺ کا خیال آتے ہی اس پر ایک کیف سا طاری ہوگیا۔ رات گزارنا اس کے لئے مشکل ہوگیا۔ ساری رات وہ حرم میں نفل پڑھتا رہا۔ اسے صبح صبح شہرِ نبی ﷺ کے لئے روانہ ہو جانا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس دوران نیند میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے۔

صبح آخری بار حرم کا طواف کر کے جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے۔ دل سے ایک خوشبو کا جھونکا نکلا اور حرم کی جانب روانہ ہوگیا۔

''میرے معبود۔ اسے سکھی رکھنا۔''

آمین کے لفظ کے ساتھ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حرم کو نگاہوں میں جذب کر لینا چاہا تو جدائی کا احساس رخصت ہونے کا غم اس کی آنکھوں کو دھندلا گیا مگر جانا تو تھا۔ اس نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ کسی غلام کی طرح

باندھ لئے اور قدم وداع ہونے کے لئے اٹھا دیا۔

☆

بیگم صاحبہ کا فون آیا تو طاہر نے صفیہ سے واپسی کی تیاری کرنے کا کہہ دیا۔ وہ دو دن بعد آ رہی تھیں۔

’’طاہر۔‘‘ جھجکتے ہوئے صفیہ نے کہنا چاہا۔

’’کہو ناں۔ رک کیوں گئیں؟‘‘ طاہر نے اسے باہوں میں لے لیا۔

’’واپسی سے پہلے ایک بار بابا شاہ مقیم کے مزار پر لے چلئے مجھے بھی۔‘‘ صفیہ نے اس کے سینے پر پیشانی ٹکا دی۔

’’تو پھر آج ہی چلو۔ صبح واپس جانا ہے۔ وقت نہیں ملے گا۔‘‘

’’تو چلئے۔ میں تیار ہوں۔‘‘ وہ کھل اٹھی۔

’’کرایہ دینا پڑے گا جانے آنے کا؟‘‘ شرارت سے طاہر نے اسے ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا۔

’’واپس آ کر۔‘‘ اس نے ہاتھ چھڑایا اور شرما کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ طاہر ہنسا اور وضو کرنے چلا گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ بابا شاہ مقیم کے مزار پر تھے۔ درویش برگد تلے دری بچھائے جیسے انہی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

’’سلام کر کے ادھر ہی آ جانا اللہ والیو۔‘‘ اس نے وہیں سے صدا لگائی۔ صفیہ نے خود کو چادر میں خوب اچھی طرح ملفوف کر رکھا تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر درویش کی جانب نظر اٹھائی جو سر جھکائے ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔

’’آ جاؤ۔ پہلے سلام کر لیں۔‘‘ طاہر اسے لئے ہوئے مزار کی جانب چل پڑا۔

سادہ سے مزار کے اندر داخل ہوتے ہی صفیہ کو ایک عجیب سے سکون نے گھیر لیا۔ جتنی دیر وہ طاہر کے ساتھ اندر کھڑی دعا کرتی رہی اس کا سارا جسم کسی نامعلوم احساس سے لرزتا رہا۔ اس کپکپاہٹ میں ایک ایسا سرور تھا‘ ایک ایسی لذت تھی‘ ایک ایسا کیف تھا‘ جسے وہ بیان نہ کر سکتی تھی۔

دعا کے بعد وہ دونوں باہر آئے اور درویش کے پاس دری پر جا بیٹھے۔ طاہر نے اس سے مصافحہ کیا اور اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ کوئی پیغام۔ کوئی سندیسہ۔

’’بیٹی آئی ہے۔‘‘ اس نے صفیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

’’جی بابا۔‘‘ صفیہ نے ادب سے جواب دیا۔

’’جیتی رہو۔ تمہارے سکھ کی دعا تو وہاں قبول ہوئی ہے جہاں ۔۔۔‘‘ کہتے کہتے درویش خاموش ہو

گیا۔ ''اس پگلے کا خیال رکھا کرو۔'' اس نے بات بدل دی۔

''اپنی سی کوشش تو کرتی ہوں بابا۔'' صفیہ نے آنکھ نہ اٹھائی۔

''کوشش ہی فرض ہے پگلی۔ اس کے بعد تو سب اس کی مرضی پر ہے۔'' درویش نے آسمان کی جانب دیکھا۔ ''اور کوشش کا پھل وہ ضرور دیتا ہے۔''

صفیہ خاموش رہی۔

''بابا۔ کل صبح ہم واپس جا رہے ہیں۔'' طاہر نے پہلی بار زبان کھولی۔

''خیر سے جاؤ اللہ والیو۔ خیر سے جاؤ۔ خیر سے رہو۔'' وہ جھوم کر بولا۔

''آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں بابا؟''

''یاد ہے۔ یاد ہے۔'' درویش نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا ''اتاولا نہ ہو۔ وقت آنے دے۔ وعدے سارے پورے ہوں گے اس کے حکم سے۔'' پھر اس نے پاس پڑی ایک کاغذ کی پڑیا اٹھائی اور صفیہ کی جانب بڑھا دی۔ ''یہ لے بیٹی۔ یہ بابے شاہ مقیم کا تبرک ہے۔ گھر جا کر دونوں چکھ لینا۔''

''جی بابا۔'' صفیہ نے پڑیا لے کر پرس میں رکھ لی۔

''بس اب جاؤ۔ اللہ کی پناہ۔ رسول کی امان۔'' درویش نے دونوں ہاتھوں سے صفیہ کے سر پر پیار دیا۔ طاہر سے ہاتھ ملایا۔ اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور دوزانو بیٹھا رہا۔

طاہر اور صفیہ اٹھے۔ الٹے پاؤں دری سے اترے۔ جوتے پہنے اور ایک بار پھر اسے سر خم کر کے سلام کر کے گاڑی میں آ بیٹھے۔ درویش آنکھیں بند کیے جھوم رہا تھا۔ طاہر نے گاڑی سٹارٹ کی تو درویش کے لبوں سے ایک مدھ بھری تان نکلی۔

پیلو پکیاں وے۔ پکیاں نی وے
آ چنوں رل یار

وہ جھوم جھوم کر گاتا رہا۔ طاہر نے بڑی خوابناک نظروں سے صفیہ کی طرف دیکھا جو درویش کی تان میں گم پلکیں موندے اس کے شانے سے لگی بیٹھی تھی۔ جسم میں پھریریاں لیتے سرور نے طاہر کو مست سا کر دیا۔ بے خودی کے عالم میں اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ نور پور کی حدود سے نکلنے تک درویش کی تان ان کا یوں پیچھا کرتی رہی جیسے انہیں رخصت کرنے کے لئے ان کے ساتھ محوِ سفر ہو۔

☆

بیگم صاحبہ' ڈاکٹر ہاشمی اور اعجاز کو طاہر' صفیہ' وسیلہ خاتون' نزدیکی رشتے دار اور طاہر کے آفس کے لوگ چھوٹے موٹے جلوس کی شکل میں کوٹھی لے کر آئے۔

یہاں طاہر نے نیاز کا اہتمام کر رکھا تھا جس کا انتظام پروفیسر قمر اور امبر کے سپرد تھا۔ عشا کے قریب فراغت ہوئی۔ رشتے داروں کے بعد ڈاکٹر ہاشمی اور وسیلہ خاتون رخصت ہو گئے تو پروفیسر قمر اور امبر نے بھی اجازت لی۔ رات کے آٹھ بجے تھے جب صفیہ اور طاہر بیگم صاحبہ کے کمرے میں ان کے دائیں بائیں بستر پر آ بیٹھے۔ بڑے سے ایرانی کمبل میں تینوں کا چھوٹا سا خاندان سما گیا۔ پھر مکہ اور مدینہ' حرم اور حرم والے۔ گنبدِ خضریٰ اور آقائے رحمت ﷺ کی باتیں شروع ہوئیں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ بیگم صاحبہ کا سارا طمطراق سادگی اور عاجزی میں بدل چکا تھا۔ شہرِ نبی ﷺ کی بات پر وہ بار بار پُرنم ہو جاتیں۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ واپس ہی نہ آتیں۔ وہیں مر مٹ جاتیں۔

دیوار گیر کلاک نے رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا تو بیگم صاحبہ نے انہیں جا کر سونے کو کہا۔ ”بس بیٹی۔ اب تم لوگ بھی جا کر سو جاؤ۔ رات آدھی ہونے کو ہے۔ اور صبح اٹھ کر نماز بھی پڑھا کرو۔“

”جی امی۔“ صفیہ نے شرارت سے طاہر کی جانب دیکھا۔ ”میں تو پڑھتی ہوں۔ انہیں کہیے۔“

”طاہر۔“ بیگم صاحبہ نے تسبیح تکیے تلے رکھتے ہوئے کہا۔ ”نماز پڑھا کرو بیٹے۔ اب تم بچے نہیں رہے۔“

”جی امی۔“ اس نے چوری چوری صفیہ پر آنکھیں نکالیں۔

پھر دونوں انہیں سلام کر کے اپنے کمرے میں آ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی طاہر نے اسے چھاپ لیا۔

”نماز نہیں پڑھتا میں۔ ہے ناں۔“

”ہاں تو اور کیا۔“ وہ اس کی باہوں میں مچلی۔ ”روز کہتی ہوں آپ سے۔ آپ سنتے ہی نہیں۔“

”وجہ کا تو پتہ ہے ناں تمہیں۔ کیوں نہیں پڑھتا میں؟“ طاہر نے اس کے رخسار پر چٹکی لی۔

”کوئی وجہ نہیں۔ صرف آپ کی سستی ہے۔“ وہ گال پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”وجہ ہے صفو جان۔“ طاہر نے اسے سینے پر ڈال لیا۔ ”نہ تم ساری رات جگاؤ نہ میری نماز رہ جایا کرے۔“

”کیا۔ کیا۔“ صفیہ نے پُرزور احتجاج کیا۔ ”میں جگاتی ہوں یا آپ نہیں سونے دیتے؟“

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ لاپروائی سے بولا۔

”بہرحال آج سے کوئی وجہ قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ صبح آپ وقت پر اٹھیں گے اور نماز پڑھیں گے۔“ وہ مچل کر

اس کی گرفت سے نکل گئی۔

”جیسے حکم سرکار کا۔“ طاہر نے ہار مان لی۔ ”اب سونے کی اجازت ہے یا نہیں؟“

”بالکل ہے۔ سو جایئے چپ چاپ۔“ اس نے کمبل کھول کر طاہر پر پھیلایا۔ طاہر نے اسے شریر نظروں سے گھور کر دیکھا۔ صفیہ نے شرما کر رخ پھیر لیا۔

”اب آ جاؤ۔ ورنہ میں جاگتا رہوں گا۔ پھر صبح وقت پر نہیں اٹھوں گا اور نماز رہ جائے گی۔“ بڑی معصومیت سے اس نے کہا تو صفیہ کی ہنسی نکل گئی۔ آہستہ سے وہ کمبل میں در آئی۔

”مطلب کے پورے پکے ہیں آپ۔“

”شش۔“ طاہر نے اس کے لبوں پر مہر محبت ثبت کر دی۔ ”بات کرنے کا نہیں۔ سونے کا ہے بابا۔“ اور ہاتھ بڑھا کر بیڈ سوئچ آف کر دیا۔

☆

مسجد نبوی ﷺ کے صحن میں بیٹھ کر گنبدِ خضریٰ کو تکتے رہنا سرمد کا سب سے پسندیدہ عمل تھا۔ وہ جب سے اپنے آقا ﷺ کے شہر میں آیا تھا اس نے نماز اور درود کے علاوہ اور کسی شے کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ہوٹل میں کپڑے بدلنے یا غسل کے لئے جاتا ورنہ اس کا سارا وقت وہیں گزرتا۔

اللہ کے حبیب ﷺ کے حضور حاضر ہو کر اس نے جو کیف پایا تھا' اس کا اظہار لفظوں میں ممکن ہی نہ تھا۔ دل کی دھڑکنیں زبان کے ساتھ صدا دیتی ہوئی' درود شریف کے ورد میں شامل رہتیں۔ ایک مہک تھی جو اسے ہر طرف رقصاں محسوس ہوتی۔ ایک نور تھا جو ہر شے پر محیط نظر آتا۔ ایک سکون تھا جو اسے ہواؤں میں تیرتا ملتا۔ آنکھیں بند کرتا تو اجالے بکھر جاتے۔ پلکیں وا کرتا تو قوسِ قزح کے رنگ چھلک پڑتے۔ آقا ﷺ کا خیال آتا تو نظر اشکوں سے وضو کرنے لگتی۔ واپس جانے کا خیال آتا تو جگر میں ایک ٹیس سی آنکھ کھول لیتی۔ مگر ہر ایک کیفیت میں مزا تھا۔ ایک لذت تھی۔ درد بھی اٹھتا تو سرور آمیز لگتا۔

آخری دن تھا جب وہ دربارِ نبوی ﷺ میں ہدیہ درود و سلام پیش کرنے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ زبان گنگ تھی۔ لب کانپ رہے تھے اور دعا کے الفاظ کہیں گم ہو چکے تھے۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ اس کے آنسو تھم ہی نہ رہے تھے۔ ہچکی بندھ گئی تو وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ آہستہ سے وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکنے لگا۔

”میرے آقا ﷺ۔ میرے مولا ﷺ۔ میں کیا مانگوں؟ کوئی طلب ہی نہیں رہی۔ آپ کے در پر آ گیا۔ اب اور کیا چاہوں؟ کس کے لئے چاہوں؟“

اور ”کس کے لئے“ کے الفاظ پر ایک دم اس کے تصور میں ایک چہرہ ابھرا۔

”ہاں۔ اس کے لئے سکھ عطا کیجئے۔“ دل سے ایک بار پھر مہک نکلی۔

”اپنے لئے بھی تو کچھ مانگ لیجئے۔“ ایک سرگوشی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ جس کی صدا تھی وہ کہیں نظر نہ آیا۔ لوگ اس سے دور دور تھے۔

’’اس در پر آ کر کچھ نہ مانگنا بدنصیبی ہے۔ کچھ مانگ لے۔ کچھ مانگ لے۔‘‘ کوئی اسے اکسا رہا تھا۔ اسے سجھا رہا تھا۔ مگر کون؟ اس نے بار بار تلاش کیا۔ کوئی دکھائی نہ دیا۔ تھک کر اس نے سر جھکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

’’کیا مانگوں؟‘‘ اب وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔ ’’کیا مانگوں؟ کیا مانگوں؟‘‘ اس کا رواں رواں پکار رہا تھا۔ پھر جیسے یہ سوال جواب میں بدل گیا۔ اسے اپنی زبان پر اختیار نہ رہا۔ اپنی طلب پر اختیار نہ رہا۔ اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔

’’میرے آقا ﷺ۔ میں خام ہوں۔ ناکام ہوں۔ مجھے وہ دیجئے۔ وہ عطا کیجئے جو مجھے کامیاب کر دے۔‘‘

ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی جیسے اس کی زبان پر تالا لگ گیا۔ اس کا سارا جسم ہلکا ہو گیا۔ ہوا سے بھی ہلکا۔ وہ بے وزن ہو گیا۔ اس نے بات ان کی مرضی پہ چھوڑ دی تھی جنہیں اللہ نے اپنا حبیب ﷺ بنایا اور لوح و قلم پر تصرف عطا کر دیا۔ مانگنے سے لوگ من کی مرادیں پاتے ہیں۔ بن مانگے ’اپنی مرضی سے وہ کیا عطا کر دیں‘ کون جان سکتا ہے؟ سرمد نے نفع کا سودا کر لیا تھا۔ ایسے نفع کا سودا‘ جس کے لئے اس کے پلے صرف اور صرف عشق کا زر تھا۔ عشق۔۔۔ جس سے اس کا ازلی و ابدی تعلق ظاہر ہو چکا تھا۔ عشق۔۔۔ جس نے اسے ہجر و فراق کی بھٹی میں تپا کر کندن بنانے کی ٹھان لی تھی۔

اپنے آقا و مولا ﷺ کے در کے بوسے لیتا ہوا وہ مسجد نبوی ﷺ سے رخصت ہوا۔ چوکھٹ کو چوم کر دل کو تسلی دی۔ حدودِ مدینہ سے نکلنے سے پہلے خاکِ مدینہ پر سجدہ کیا۔ اسے ہونٹوں اور ماتھے سے لگایا۔ پھر مٹھی بھر یہ پاکیزہ مٹی ایک رومال میں باندھ کر اپنی اوپر کی جیب میں رکھ لی۔ اس کے لئے یہ کائنات کا سب سے بڑا تحفہ تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے اپنا مختصر سامان سمیٹ کر اس نے سفری بیگ میں ڈالا اور چیک آؤٹ کے لئے کاؤنٹر پر چلا آیا۔

ٹیکسی نے اسے جدہ ایئر پورٹ کے باہر اتارا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اچانک وہ ایئر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوتے ہوتے رک گیا۔

’’کہاں جا رہا تھا وہ؟‘‘ اس نے خود سے سوال کیا۔

اس کی لندن واپسی کی ٹکٹ کنفرم تھی مگر اس نے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عمرے کے بعد لندن نہیں جائے گا‘ پاکستان آئے گا۔ سوچوں نے اس پر یلغار کر دی۔ اس کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ کیا کرے؟ پاکستان جانا تو اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا اور لندن جانے کا راستہ اس نے ڈاکٹر ہاشمی سے وعدے کی صورت میں بند کر لیا تھا۔ وہ خیالوں میں ڈوبا ہوا ایئر پورٹ میں داخل ہوا اور پتھر کے ایک بنچ پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔

اس کی پشت پر دوسری جانب اسی بنچ پر دو نوجوان بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے سرمد کو بیٹھتے دیکھا تو

خاموش ہو گئے۔ چند لمحے سر جھکائے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ سے گردن گھما کر سرمد کی طرف دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ چند لمحے اس کا جائزہ لیتے رہنے کے بعد اس نوجوان نے‘ جس کی عمر بائیس تیئیس سال سے زیادہ نہ تھی‘ اپنے پچیس چھبیس سالہ ساتھی کی طرف دیکھا جو اس عرصے میں وہاں موجود باقی تمام نشستوں کا جائزہ لے چکا تھا۔ کوئی بھی جگہ خالی نہ پا کر اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ پہلے نوجوان نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سرمد کی طرف سے اطمینان دلایا۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر سرگوشیاں کرنے لگے۔

’’آج آخری دن ہے حسین۔ اگر آج بھی طلال نہ پہنچا تو ہم دونوں کو روانہ ہو جانا پڑے گا۔ مزید وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو حمزہ بھائی مگر طلال اکیلا کیسے کمانڈر تک پہنچ پائے گا۔‘‘ چھوٹی عمر کے نوجوان نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’وہ بعد میں دیکھیں گے۔ کل کے بعد ہمیں کمانڈر تک لے جانے والا شخص پھر ایک ماہ بعد مل پائے گا۔ اور یہ سارا عرصہ ہم سوائے دعائیں مانگنے کے اور کیسے گزاریں گے۔‘‘ حمزہ کی سرگوشی تیز ہو گئی۔

’’ہوں۔‘‘ حسین نے کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ’’تو پھر پروگرام کیا رہا؟‘‘

’’ابھی عراق سے آنے والی فلائٹ چیک کریں گے۔ اگر طلال آ گیا تو ٹھیک۔ ورنہ آج رات نو بجے صبح کی فلائٹ کے لئے ٹکٹیں کنفرم کرا لیں گے۔‘‘

’’سیدھا دہلی اور وہاں سے سرینگر۔۔۔‘‘

’’شش۔۔۔‘‘ حمزہ نے حسین کا ہاتھ دبا دیا۔ ’’نام مت لو کسی جگہ کا۔‘‘ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

’’سوری بھائی۔‘‘ حسین نے معذرت خواہانہ آواز میں کہا۔

’’تمہاری یہ سوری کسی دن ایسا کام دکھائے گی کہ۔۔۔‘‘ حمزہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھٹکا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اسی وقت عراق کے شہر نجف سے آنے والی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ حمزہ اور حسین ایک ساتھ اٹھے اور داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے قدم اٹھا رہے تھے۔ ان کی چال میں کسی قسم کا اضطراب نہ تھا۔ اضطراب تو وہ بُت بنے بیٹھے سرمد کی جھولی میں ڈال گئے تھے جو کہنیاں گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے ان دونوں کو دزدیدہ نگاہوں سے جاتا دیکھ رہا تھا۔

ان کی گفتگو نے سرمد کے قلب و ذہن میں جوار بھاٹا پیدا کر دیا تھا۔ اسے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ خشک

ہوتے حلق کو اس نے تھوک نگل کر تر کیا اور جب نجف سے آنے والی فلائٹ کے پہلے مسافر نے کلیرنس کے بعد لاؤنج میں قدم رکھا تو اس نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

اسے کہاں جانا تھا' فیصلہ ہو چکا تھا۔ راستہ دکھایا جا چکا تھا۔ اب تو اسے صرف قدم بڑھانا تھا اور منزل تک پہنچنا تھا۔

☆

آدھ گھنٹے بعد وہ جدہ کے ہوٹل الخامص کے دوسرے فلور پر کمرہ نمبر تین سو تیرہ کے باہر کھڑا تھا۔ سفری بیگ اس نے خوب سنبھال کر کندھے پر درست کیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کاریڈور بالکل خالی تھا۔ اس کا ہاتھ دستک کے لئے اٹھا ۔

''کون؟'' اندر سے حمزہ کی آواز ابھری۔

جواب میں اس نے پھر ہولے سے دستک دی۔ فوراً ہی کسی کے دروازے کی طرف چل پڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔

''تم؟'' سامنے کھڑے حمزہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''کون ہے حمزہ بھائی؟'' حسین نے پوچھا۔ پھر وہ بھی اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ سرمد کو دیکھ کر اس کا حال بھی حمزہ سے مختلف نہ رہا۔

''کیا آپ مجھے اندر آنے کے لئے نہ کہیں گے؟'' سرمد مسکرایا۔

''یہ تو وہی ہے جو۔۔۔'' حسین نے کہنا چاہا۔

''جی ہاں۔ میں ایرپورٹ پر موجود تھا'' سرمد نے اخلاق سے کہا۔

''اندر آ جاؤ۔'' اچانک حمزہ نے کہا اور ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ پھر جب تک سرمد سمجھ پاتا' دروازہ بند ہو گیا اور ایک سیاہ ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر آ ٹکی۔ حسین نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

''کون ہو تم؟'' حمزہ کا لہجہ بیحد سرد تھا۔

''اس کے بغیر بھی پوچھیں گے تو میں سچ سچ بتا دوں گا۔'' سرمد نے اچھل کر حلق میں آ جانے والے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔

''بکواس نہیں۔'' حمزہ نے اسی لہجے میں کہا۔ ''تم یہاں تک پہنچے کیسے؟''

''ٹیکسی میں آپ کا پیچھا کرتے ہوئے۔'' سرمد نے بیگ کندھے سے فرش پر گرا دیا۔ اسی وقت حسین نے

پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں بازو ڈال کر گرفت میں لے لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے سرمد کا دایاں ہاتھ مروڑ کر کمر سے لگا دیا۔

''میرا پہلا سوال ابھی جواب طلب ہے۔ کون ہو تم؟'' حمزہ نے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے پھر پوچھا۔

''ایک پاکستانی۔'' سرمد نے مختصراً کہا۔

''فرشتے نہیں ہوتے پاکستانی۔'' حمزہ نے تلخی سے کہا۔ ''تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟''

''یہ ذرا تفصیل طلب بات ہے اور اس حالت میں تو میں وضاحت نہ کر سکوں گا۔'' سرمد نے آنکھ کے اشارے سے حسین کی جانب اشارہ کیا۔

''ہوں۔'' حمزہ بڑی سرد نظروں سے چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے ریوالور اس کی پیشانی سے ہٹا لیا۔ ''چھوڑ دو اسے۔''

حسین نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا اور سرمد اس کے دھکے سے بستر پر جا گرا۔ حمزہ کرسی گھما کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ریوالور اس پر تان لیا۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں اسے نشانہ بنا سکتا ہے۔

''حسین۔ باہر کا جائزہ لو۔ یہ اکیلا ہے یا۔۔۔''

جواب میں حسین نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور پر ہاتھ جماتے ہوئے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا۔ دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھا۔ پھر باہر نکل گیا۔ تقریباً دو منٹ بعد لوٹا تو اس کے چہرے کی وحشت غائب ہو چکی تھی۔

''لگتا ہے یہ اکیلا ہی ہے حمزہ بھائی۔'' وہ دروازہ لاک کر کے دوسری کرسی پر آ بیٹھا۔

''ہوں۔'' حمزہ نے سرمد کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ''اب کھل جاؤ بچے۔ کون ہو اور کیوں آئے ہو؟ اور بولنے سے پہلے یہ سمجھ لو کہ ہمارے پاس تمہارے سچ جھوٹ کو جانچنے کے لئے وقت ہے نہ کوئی جواز۔ اس سے کم وقت میں ہم تمہاری لاش کو باتھ روم میں بند کر کے نکل جائیں گے۔ اس لئے جلدی' کم اور سچ بولو۔''

''میرا نام سرمد ہاشمی ہے۔ پاکستانی ہوں۔ یہاں عمرہ کرنے آیا تو زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ واپس جا رہا تھا تو آپ دونوں کی باتیں کان پڑیں۔ لگا جیسے راستہ مل گیا ہے۔ اب بے مقصد جینے سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''کیا مطلب؟'' حمزہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہماری باتوں سے کیا جان لیا تم نے؟''

''یہ کہ آپ کسی بڑے مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اس میں شامل کر لیجئے۔'' سرمد نے تمہیدیں

باندھنے سے گریز کیا۔

''او بھائی۔ کیا سمجھ رہے ہو تم؟'' حمزہ ہنسا۔ ''ہم کسی خاص مقصد کے لئے کوئی بڑا کام نہیں کر رہے۔ ہم تو سیدھے سادے اردنی ہیں۔''

''اردنی؟'' اب سرمد کے حیران ہونے کی باری تھی۔ ''مگر آپ تو بڑی روانی سے اردو بول رہے ہیں۔''

''تو اس میں کیا ہے۔ کیا تم لوگ ہماری طرح عربی نہیں بول لیتے؟'' حمزہ نے لاپرواہی سے کہا۔ ''بہر حال۔ تم نے جو سمجھا غلط سمجھا اور یہاں آ کر اس سے بھی بڑی غلطی کی۔ اب جب تک ہم جدہ سے نکل نہیں جاتے' تم یہاں قید رہو گے۔''

''بالکل نہیں۔ میں چاہوں گا کہ آپ طلال کی جگہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔''

''طلال؟'' حمزہ کے ساتھ حسین بھی اچھل پڑا۔ ''اس کے بارے میں تم کیسے اور کیا جانتے ہو؟''

''صرف یہ کہ آپ دونوں اس کے نجف سے آنے کے منتظر تھے۔ اور آج بھی اس کے نہ آنے پر اب آپ اکیلے ہی انڈیا کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔''

بھک سے جیسے حمزہ کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ اس نے ایسی نظروں سے حسین کی طرف دیکھا جن سے بے اعتباری مترشح تھی۔

''یہ تو ہماری ساری باتیں سن چکا ہے حمزہ بھائی۔ اب اس کا زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔'' اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔

''رکو۔'' حمزہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کسی بھی اقدام سے منع کر دیا۔ پھر اس نے سرمد کی جانب دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم لوگ کون ہیں اور کس کام میں لگے ہیں؟''

''میرا اندازہ ہے۔'' سرمد بازو سہلاتا ہوا بولا۔ ''آپ لوگ انڈیا میں کسی ایسی تحریک سے وابستہ ہیں جو حربی کارروائیوں میں مصروف ہے۔ آپ کے پاس یہ اسلحہ اور آپ کی گفتگو میں کمانڈر اور سرینگر کا لفظ یہی بتاتا ہے اور۔۔۔''

''اور۔۔۔'' حمزہ کا سانس رکنے لگا۔

''اور یہ کہ۔۔۔'' سرمد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''انڈیا میں صرف ایک ہی حربی تحریک چل رہی ہے۔ کشمیر کی۔۔۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اس تحریک کے درست اور نادرست ہونے کے بارے میں؟''

”میں اسے جہادی تحریک سمجھتا ہوں۔ “ سرمد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”حمزہ بھائی۔ اس کی باتوں میں نہ آیئے۔ یہ کوئی بڑی گیم کھیل رہا ہے۔ “ حسین نے بیتابی سے بات میں دخل دیا۔

”ہوں۔ “ حمزہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی تیز اور اندر تک چھید کرتی نگاہوں نے سرمد کا سر سے پاؤں تک ایک بار بھرپور جائزہ لیا۔ پھر اس کے چہرے پر رک گئیں۔

”تو تم ہمارے ساتھ اس لئے شامل ہونا چاہتے ہو کہ تم کسی مقصد کے لئے جینا چاہتے ہو؟“ اب حمزہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”مرنا بھی اسی مقصد کے لئے چاہتا ہوں۔ “ سرمد کے لہجے سے عجیب سا عزم جھلک رہا تھا۔

”اور تمہارا خیال ہے کہ ہمیں تمہاری بات پر یقین آ جائے گا؟“ تمسخر سے حمزہ نے پوچھا۔

”آ تو جانا چاہیے۔ “ سرمد نے گھبرائے بغیر جواب دیا۔

”وہ کیوں؟“ حمزہ نے اسی لہجے میں پوچھا۔

”اس لئے کہ میں جس جگہ اپنی بے مقصد زندگی سے نجات کی دعا کر کے آ رہا ہوں‘ وہاں جھوٹ کو اجازت ہی نہیں کہ پر مار سکے۔ “

”کہاں سے آ رہے ہو تم؟“ حمزہ ایک دم حیران ہوا۔

”اپنے آقا و مولا ﷺ کے در اقدس سے۔ “

اور حمزہ کا ہاتھ بے جان ہو کر نیچے ہو گیا۔ ریوالور چھوٹ کر فرش پر جا پڑا۔ ایسا لگا‘ کسی انجانی طاقت نے ایک جھٹکے سے اسے کرسی سے کھڑا کر دیا ہو۔ حسین کا ریوالور والا ہاتھ بھی جھک گیا۔ بالکل ساکت کھڑا حمزہ چند لمحے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”میں قربان جاؤں اس نام پر۔ “ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ”مجھے اب تک گناہ گار کیوں کر رہے تھے تم سرمد ہاشمی؟ ارے۔ تم آتے ہی بتا دیتے کہ تمہیں میرے آقا ﷺ نے بھیجا ہے۔ آ جاؤ۔ سینے سے لگو۔ ٹھنڈی ڈالو۔ میرے آقا ﷺ کے بھیجے ہوئے۔ میری پلکوں پر تشریف رکھو۔ میرے دل میں قیام کرو۔ میرے سینے پر اترو مرشد۔ “

حمزہ نے بازو پسار دیے۔ سرمد آہستہ سے اٹھا۔ پھر لپک کر اس کے سینے سے جا لگا۔ حسین ان دونوں سے آ کر لپٹ گیا۔

وہ تینوں سسکیاں بھر رہے تھے۔ انہیں اپنی منزل پر اپنے آقا ﷺ کی رحمت‘ رضا اور خوشنودی کا سایہ

چھاؤں کرتا دکھائی دے گیا تھا۔

* * *

''ہم دونوں کشمیری ہیں سرمد۔'' حمزہ بتا رہا تھا۔ ''وہاں اس وقت جتنی بھی جماعتیں جہاد کے نام پر سرگرم عمل ہیں ہم ان میں سے کسی ایک سے بھی تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ کہیں نہ کہیں ان کے سیاسی مفادات اصل مقصد سے ٹکراتے ہیں۔ کمانڈر کے نام سے ہم جسے پکارتے ہیں ایک اللہ کا بندہ ہے جس کے دل میں اپنے غلام وطن کا درد ٹیس بن کر دھڑکتا ہے۔ اس کا کسی جہادی جماعت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ وہ گوریلا کارروائیوں سے جس طرح کا نقصان پہنچا رہا ہے وہ دن بدن بھارتی فوجوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس مجاہد کا تعلق کس کس علاقے اور کس کس فرد سے ہے لیکن یہ جانتے ہیں کہ اس کے گروپ میں شامل ہونے والے لاوارث مرتے ہیں نہ ان کی لاشوں کے سودے کئے جاتے ہیں۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی میتیں ان کے اپنے علاقوں میں پہنچائی جاتی ہیں۔ کیسے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ کمانڈر کے گروپ کا نام ''عشاق'' ہے۔ وہ اللہ کے عاشق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے عاشق ہیں اور بس۔ ان کا ایک ہی نعرہ ہے ''عزت کی آزاد زندگی یا شہادت۔'' گروپ میں ہر شامل ہونے والے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ عمرہ کرے۔ اللہ کے گھر میں حاضری دینے کے بعد اپنے آقا ﷺ کے در پر پہنچے۔ اپنے تن من کو قبولیت کا غسل دے۔ اس کے بعد گروپ میں شمولیت کے لئے کمانڈر کے خاص آدمی سے رابطہ کرے۔ ایک ماہ کی گوریلا ٹریننگ کے بعد معرکوں میں شمولیت کے لئے ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ پھر یہ اپنا اپنا نصیب ہے کہ شہادت ملتی ہے یا مجاہدانہ حیات۔''

''تو آپ دونوں بھی یہاں۔۔۔''

''ہاں۔'' حمزہ نے سرمد کی بات اچک لی۔ ''ہم پہلے کشمیری مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ وابستہ رہ چکے ہیں۔ ٹریننگ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہم عمرہ کی شرط پوری کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔''

''اور طلال کون ہے؟''

''یہ ہمارا عراقی ساتھی ہے۔ عشاق میں دنیا بھر سے جذبہ شہادت سے سرشار لوگ جوق در جوق شامل ہو رہے ہیں۔ ہمیں کل تک بہر صورت سرینگر پہنچنا ہے۔ طلال نہ آیا تو ہم دونوں اس کے بغیر رخصت ہو جائیں گے۔''

''لیکن اب مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' سرمد نے جلدی سے کہا۔

''تم عمرہ کر چکے ہو۔ اور نجانے کیوں مجھے تمہاری باتوں میں سچائی نظر آتی ہے۔ کیوں حسین۔'' حمزہ نے گردن گھمائی۔ ''کیا خیال ہے؟''

’’میں آپ سے متفق ہوں بھائی۔‘‘ حسین نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ’’سرمد ہمارے آقا ﷺ کے در پر حاضری دے کر آ رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اس کی نیت پر شک کرنا چاہئے۔‘‘

’’لیکن سرمد۔‘‘ حمزہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ’’تمہارے گھر والے۔۔۔‘‘

’’ان کے علم میں نہیں ہے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میں چاہتا بھی نہیں کہ ان سے بحث و تمحیص کے بعد اس راہ پر قدم رکھوں جو مجھے میرے آقا ﷺ کے در سے تفویض ہوئی ہے۔‘‘

’’شادی ہو چکی ہے تمہاری؟‘‘ حمزہ نے پوچھا۔

’’عاشقوں کی شادیاں ان کے مقصد سے ہو چکی ہوتی ہیں حمزہ بھائی۔‘‘ سرمد نے گول مول جواب دیا۔ ایک پل کے لئے ایک معصوم سا چہرہ اس کے تصور میں ابھرا‘ جسے اس نے فوراً ہی تیز ہوتی دھڑکن کے پردے میں چھپا لیا۔

’’یہ تو تم نے سچ کہا۔‘‘ حمزہ اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ ’’پھر بھی عشاق کے منشور میں ہے کہ ساری معلومات سچی اور صاف صاف بہم پہنچائی جائیں۔‘‘

’’اس کے لئے میں تیار ہوں۔ میری دنیا میں سوائے اپنے والد کے اور کوئی نہیں ہے۔ انہیں معاشی طور پر میری مدد کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ بڑے نامور ڈاکٹر ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انہیں میرے اس اقدام کے بارے میں تب پتہ چلے جب میں کچھ کر کے دکھاؤں تاکہ وہ مجھ پر فخر کر سکیں۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ حمزہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ’’اپنا پاسپورٹ دو۔‘‘

سرمد نے قالین پر پڑا بیگ کھولا۔ پاسپورٹ نکال کر حمزہ کے حوالے کیا‘ جسے وہ کھول کر دیکھنے لگا۔

’’سرمد۔ آخری بار سوچ لو۔ اس کے بعد تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکو۔‘‘

’’سوچ لیا حمزہ بھائی۔‘‘ ایک عزم سے سرمد نے کہا۔ ’’فیصلہ تو میرے آقا ﷺ نے فرما دیا۔ مجھے تو اس پر صرف عمل کرنا ہے۔‘‘

’’تو ٹھیک ہے۔‘‘ حمزہ اٹھ گیا۔ ’’تم حسین کے ساتھ چلے جاؤ۔ اپنی تمام چیزیں جن سے تمہاری شناخت ہو سکے‘ یا تو ضائع کر دو‘ یا اپنے گھر پاکستان کوریئر کر دو۔ صرف یہ پاسپورٹ اور آئیڈنٹی کارڈ ہے جو تمہاری پہچان رہے گا‘ وہ بھی سرینگر تک۔ اس کے بعد یہ بھی تمہارے لئے بیکار ہو جائے گا۔‘‘

’’میرے پاس ویزا کارڈ اور کریڈٹ کارڈ کے علاوہ سعودی کرنسی بھی ہے حمزہ بھائی۔ اس کا کیا کروں؟‘‘ سرمد نے بیگ سے چیزیں نکالتے ہوئے پوچھا۔

’’اگر تم چاہو تو عشاق کو عطیہ کر سکتے ہو لیکن یہ تمہاری خوشی پر منحصر ہے۔ اس کے لئے کمانڈر کی طرف سے کوئی

ڈیمانڈ نہیں ہے۔’’

‘‘تو یہ لیجئے۔ یہ میری طرف سے عشاق کو عطیہ کر دیجئے۔’’ سرمد نے اپنا کریڈٹ کارڈ' ڈاکٹر ہاشمی کا دیا ہوا ویزا کارڈ اور سعودی کرنسی حمزہ کے حوالے کر دی۔ بیگ سے اس نے تمام کاغذات نکال لئے۔ ان کا ایک پیکٹ بنایا۔ اس پر گھر کا پتہ لکھا اور حسین کے حوالے کر دیا۔

‘‘حسین بھائی۔ یہ کوریئر کرا دینا۔ میرا جانا ضروری تو نہیں ہے اس کے لئے۔’’

‘‘ٹھیک ہے۔’’ حمزہ نے حسین کو اشارہ کیا۔ اس نے پیکٹ لے لیا۔ ‘‘تم یہیں رکو۔ حسین کچھ دیر میں لوٹ آئے گا۔ مجھے واپسی میں تین چار گھنٹے لگیں گے۔’’

‘‘ٹھیک ہے حمزہ بھائی۔’’ سرمد ان کے ساتھ دروازے تک آیا۔

‘‘کسی بھی انجان شخص کے لئے دروازہ کھولنے کی ضرورت ہے نہ کسی سے بات کرنے کی۔ میں تمہارے لئے کافی اور کچھ کھانے کو بھجواتا ہوں۔’’

جواب میں سرمد نے محض سر ہلا دیا۔ وہ دونوں کمرے سے نکلے تو اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ کچھ دیر وہ سوچ میں ڈوبا رہا پھر موبائل جیب سے نکال کر ایک نمبر ملایا۔

‘‘ہیلو۔ ریحا از ہیئر۔’’ دوسری جانب سے وہ بیتابی سے چہکی۔ ‘‘اچھے تو ہو سرمد؟’’

‘‘ہاں ہاں۔’’ وہ ہولے سے مسکرایا۔ ‘‘میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔’’

‘‘میں بھی ٹھیک ہوں۔ سنو سرمد۔ کیا تم یقین کرو گے' آج صبح سے میں چاہ رہی تھی کہ تم مجھے فون کرو۔ اور دیکھو تم نے فون کر دیا۔’’ وہ ہنسے جا رہی تھی۔ کھلی جا رہی تھی۔

‘‘دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ریحا۔’’ وہ بے اختیار کہہ گیا۔

‘‘اچھا۔’’ حیرت سے اس نے کہا۔ ‘‘تمہارے دل کو بھی میرے دل سے راہ ہو گئی سرمد۔’’

‘‘میں تو محاورتاً کہہ رہا تھا پگلی۔’’ سرمد کو اپنے الفاظ کی نزاکت کا احساس ہوا۔

‘‘چلو۔ ہم محاورے ہی میں سہی' تمہارے دل کے قریب تو آئے۔ اچھا یہ کہو۔ خیریت سے فون کیا؟’’ اس نے خود ہی بات بدل دی۔ شاید اس ڈر سے کہ سرمد کا اگلا فقرہ' حقیقت کا آئینہ دکھا کر اس سے یہ چھوٹی سی خوشی بھی چھین نہ لے۔

‘‘ہاں۔’’ سرمد نے جھجک کر کہا۔ ‘‘ایک چھوٹا سا کام تھا ریحا۔’’

‘‘تو کہو ناں۔ جھجک کیوں رہے ہو؟ سرمد۔ یقین کرو اگر مجھے زندگی میں تم سے کوئی کام پڑا ناں۔ تو میں تمہیں

حکم دوں گی۔ درخواست نہیں کروں گی۔ ارے ہمارا ایک دوسرے پر جو حق ہے اسے کھل کر استعمال کرو یار۔ نفع نقصان لینا دینا' تعلق کو ناپ تول کر کیش کرنا' یہ تو ہم ہندو ساہوکاروں کی بدنامیاں ہیں۔ تم مسلمان ہو کر اس چکر میں کیسے پڑ گئے؟“ وہ اس کے لتے لے رہی تھی۔

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ریحا۔“ وہ جھینپ گیا۔

”تو پھر جلدی سے کہہ ڈالو۔ کیا کام ہے؟“

”ریحا“ اس نے سارے تکلفات بالائے طاق رکھنے کی ہمت کر ڈالی۔ ”تمہیں ایک بار لندن جانا پڑے گا۔“

”تم آ رہے ہو وہاں تو میں ہزار بار لندن جانے کو تیار ہوں سرمد۔“ ریحا ایک دم بے چین ہو گئی۔

”نہیں۔ میں نہیں آ رہا لندن۔“

”تو پھر۔“ وہ حیران ہوئی۔

”تم وہاں میرے فلیٹ پر چلی جانا۔ دروازے کے سامنے اوپر جاتی سیڑھیاں ہیں۔ ساتویں زینے کے کارپٹ کے نیچے فلیٹ کی چابی ہے۔ اندر میری رائٹنگ ٹیبل کے نچلے دراز میں میرے تمام ڈاکومنٹس' رزلٹ کارڈ اور ڈگری ایک لفافے میں بند پڑے ہیں۔ وہ میرے گھر کے پتے پر میرے پاپا کے نام کوریئر کر دینا پلیز۔“

”مگر۔۔۔“

”دو مہینے کا کرایہ میرے ایڈوانس میں ابھی باقی ہے۔ میرے لینڈ لارڈ سے مل کر میرا حساب چکا دینا۔ سامان جسے چاہے دے دینا۔ مجھے کسی چیز سے کچھ لینا دینا نہیں۔“ اس نے ریحا کی بات کاٹ کر کہا۔

”وہ تو میں سب کر دوں گی۔ مگر تم ہو کہاں؟“

”میں۔۔۔“ ایک پل کو سرمد رکا۔ پھر بولا۔ ”میں سعودی عرب میں ہوں ریحا۔ عمرہ کرنے آیا تھا یہاں۔“

”تو واپسی کب تک ہے تمہاری؟“

”جلد ہی۔“ اس نے بات گول کر دی۔

”وہاں سے پاکستان جاؤ گے کیا؟“

”شاید۔“ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ ”ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن لندن نہ جانے کا میں اپنے پاپا سے وعدہ کر چکا ہوں ریحا۔ اس لئے تمہیں تکلیف دے رہا ہوں۔“

”وہ تکلیف تو میں اٹھا لوں گی سرمد لیکن مجھ سے وعدہ کرو تم جہاں بھی رہو گے مجھ سے رابطہ رکھو گے۔“

”ہاں۔“ کچھ سوچ کر سرمد نے کہا۔ ”اگر ممکن ہوا تو۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”اور جب بھی ہو سکا مجھ سے ملو گے بھی۔“ اس نے مزید پاؤں پھیلائے۔

”ہاں۔ ضرور۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ ”میں ایک دو روز میں لندن چلی جاؤں گی۔ پھر تمہیں بتاؤں گی کہ تمہارا کام ہو گیا۔“ وہ اس سے رابطے کا بہانہ محفوظ کر رہی تھی۔

”میں خود تم سے بات کروں گا ریحا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”چلو۔ جو پہلے بات کر لے وہی سکندر۔“ ریحا کا موڈ بیحد خوشگوار ہو رہا تھا۔ وہ سرمد کے ہنس کر بول لینے ہی پر فدا ہوئی جا رہی تھی۔

”اچھا ریحا۔ اب اجازت۔“

”کس دل سے کہوں کہ ہاں۔“ وہ جذباتی ہو گئی۔ ”مگر ہو گا تو وہی جو طے ہے۔ اس لئے گڈ بائی سرمد۔ آل دی بیسٹ۔“

”خوش رہو ریحا۔ سلامت رہو۔“ سرمد نے بٹن دبا دیا۔ وہ مزید اس پگلی کو باتیں کرنے کا موقع دے کر اس کے خواب کا دورانیہ طویل نہ کرنا چاہتا تھا۔ موبائل جیب میں رکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر کسی گہری سوچ میں گم بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

سوچتے سوچتے ریحا کی جگہ موجودہ صورتحال نے لے لی اور بے اختیار اس کے رگ و پے میں ایک سکون سا بھر گیا تھا۔ یوں لگتا تھا' وہ جس مقصد کے لئے یہاں آیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔

”عشاق۔“ اچانک اس کے ذہن کے پردے پر ایک لفظ ابھرا۔ کمانڈر نے کیسا بامقصد لفظ اپنے گروپ کے لئے چنا تھا۔ اسے اپنے بارے میں خیال آیا تو لگا' یہ لفظ اس کے لئے ہی منتخب کیا گیا ہے۔ وہ جو ایک ناکام عاشق تھا۔ اسے ایک کامیاب راستے کی نوید دے کر اس کے آقا ﷺ نے رخصت کر دیا تھا۔ صفیہ کے عشق نے' عشق مجازی نے اس کا ہاتھ عشق حقیقی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

☆

تقریباً ایک گھنٹے بعد حسین لوٹا۔ اس نے ڈاکٹر ہاشمی کے پتے پر سرمد کا پیکٹ کوریئر کرا دیا تھا۔ رسید سرمد کو دے کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ سرمد رسید ہاتھ میں لئے کچھ دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ حسین نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا اور خاموشی سے صوفے پر آ بیٹھا۔ دوپہر کا کھانا ان

دونوں نے اکٹھے کھایا۔ حمزہ شام کے قریب لوٹا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”کام ہوگیا؟“ حسین نے بیتابی سے پوچھا۔

”ہاں۔ بڑی مشکل سے ہوا مگر ہوگیا۔“ حمزہ نے تین پاسپورٹ نکال کر اس کی طرف اچھالے اور خود بستر پر گر پڑا۔

”ویری گڈ۔“ حسین نے تیسرا پاسپورٹ دیکھ کر حیرت بھرے تحسین آمیز لہجے میں کہا اور پاسپورٹ سرمد کے ہاتھ میں دے دیا۔

سرمد نے اپنا پاسپورٹ کھول کر دیکھا اور اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ ”ارے“ کہتے ہوئے اس نے حمزہ کی جانب دیکھا۔ ”یہ کیسے ہوا حمزہ بھائی؟“

”بس ہوگیا۔ اب تم لوگ تیار رہو۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم لوگ چیک آؤٹ کر جائیں گے۔ نو بجے کی فلائٹ ہے۔ میں ٹکٹ کنفرم کرالایا ہوں۔“

سرمد نے مزید کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور پاسپورٹ جیب میں رکھ لیا جس پر حمزہ نے بھارت کا ویزہ لگوا لیا تھا۔

ٹھیک پونے نو بجے وہ لوگ ایرپورٹ پر تھے۔ ان کے پاس سوائے ایک ایک ہینڈ بیگ کے اب کوئی سامان نہ تھا۔ ریوالور اور فالتو سامان ہوٹل کے کمرے ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہینڈ بیگز میں ان کا ایک ایک کپڑوں کا جوڑا' چند اشیائے ضرورت اور پاسپورٹ تھے۔

پورے نو بجے گلف ایرلائن کے طیارے نے دہلی کے لئے رن وے چھوڑ دیا۔ کھڑکی کے قریب بیٹھے سرمد نے جدہ ایرپورٹ کی جلتی بجھتی روشنیوں پر نظر ڈالی۔ پھر فضا میں جہاز سیدھا ہوا تو ان لوگوں نے سیفٹی بیلٹس کھول دیں۔ بے اختیار سرمد نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس کا دل بڑے زور سے پھڑ پھڑایا۔ گنبدِ خضریٰ ﷺ اس کی نگاہوں میں دمکا اور غیر اختیاری طور پر اس کے لبوں پر درود شریف مہک اٹھا۔ سارا جسم ایک بار تن کر یوں ٹوٹا جیسے ساری تھکان' ساری کلفتیں' ساری اداسیاں ہوا ہوگئی ہوں۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ حمزہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ سرمد کے لب ہولے ہولے ہل رہے ہیں۔ اس نے کان لگا کر سنا اور عقیدت سے اس کا دل بھر آیا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ سرمد کے ہونٹوں پر خالق کون ومکاں کا پسندیدہ وظیفہ جاری تھا۔

”صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔“

”عشاق“ کے لئے اس سے بڑا اور کیا ہوسکتا ہے۔“ اس نے سوچا اور بے ساختہ اس کے ہونٹ بھی متحرک

ہو گئے۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

اور وہاں سے ہزاروں میل دور' نور پور گاؤں کے قریب' بابا شاہ مقیم کے مزار کے باہر کھڑے درویش نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا۔ ہواؤں میں کچھ سونگھا اور پکار اٹھا۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔" پھر وہ مزار کی طرف بھاگا۔ "بابا۔ او بابا شاہ مقیم۔ دیکھ۔ وہ چل دیا ہے۔ اپنی منزل کی جانب۔ دیکھ۔ اسے میرے آقا ﷺ نے قبول کر لیا ہے۔ اس کا عشق اسے مہکا رہا ہے بابا شاہ مقیم۔ اسے دہکا رہا ہے۔ اسے صلی اللہ علیہ وسلم کے پر عطا کر دیے گئے ہیں۔ وہ اڑ رہا ہے۔ اس کی پرواز شروع ہو گئی بابا۔ دیکھ۔ اس نے اپنے خالق' اپنے معبود کی رضا' اپنے مقصود' اپنی منزل کی جانب سفر شروع کر دیا ہے۔ دیکھ۔ دیکھ۔ بابا شاہ مقیم دیکھ۔"

درویش پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا اٹھا کر اشارے کر رہا تھا۔ مزار والے کو بتا رہا تھا۔ وہ بچوں کی طرح خوش تھا۔ قلقاریاں مار رہا تھا۔ ہواؤں میں اڑنے کو پر کھول رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک دم وہ مزار کے باہر ایک جگہ رک گیا۔ بایاں بازو موڑ کر کمر پر رکھا۔ دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے دھیرے ہلکورے لینے لگا۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

وہ جھوم رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا۔ رقص کر رہا تھا۔ چک پھیریاں لے رہا تھا۔ ہوا اس کے ساتھ محو رقص تھی۔ فضا اس کے ساتھ بے خود تھی۔ درختوں کے پتے تال دے رہے تھے۔ شاخیں سر دھن رہی تھیں۔ مٹی سوندھی سوندھی خوشبو سے مستی پھیلا رہی تھی۔ آسمان پر فرشتے اپنے رب کے حضور گا رہے تھے۔ تارے چمک چمک کر صدائیں دے رہے تھے۔ کائنات وجد میں تھی۔ جلوت وخلوت کے لبوں پر ایک ہی گیت تھا۔ ہر طرف ایک ہی نغمہ سرور بانٹ رہا تھا۔

صلی اللہ علیہ وسلم۔
صلی اللہ علیہ وسلم۔
صلی اللہ علیہ وسلم۔

☆

ڈاکٹر ہاشمی کے سامنے سعودی عرب اور لندن سے آنے والے دونوں پیکٹ کھلے پڑے تھے۔ ایک سے سرمد کے ضروری کاغذات اور دوسرے سے اس کی ایم بی اے کی ڈگری' رزلٹ کارڈ اور یونیورسٹی کے دیگر ڈاکومنٹس برآمد ہوئے تھے۔ دونوں کے ساتھ ہی سرمد کے طرف سے کوئی خط یا دوسری تحریر نہ تھی۔

ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سرمد نے انہیں یہ سب کچھ ارسال کیا تو کیوں؟ وہ خود کہاں ہے؟ اپنا ٹھکانہ نہ بتایا تو اس کا سبب کیا ہے؟ ان کے حساب سے سرمد کو کئی دن پہلے واپس ان کے پاس لوٹ آنا چاہئے تھا مگر اس کے بجائے اس کے کاغذات آئے تھے اور بس۔ مزید نہ کوئی خیر خبر نہ اطلاع۔

سوچ سوچ کر ان کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ اپنی الجھن دور کرنے کے لئے انہوں نے آخری بار پیکٹ کے ریپر کا جائزہ لیا۔ اس پر بھیجنے والے کا نام سرمد ہاشمی تحریر تھا۔ یہ پیکٹ جدہ سے بھیجا گیا تھا۔ جبکہ لندن سے آنے والے پیکٹ پر کسی لڑکی ریحا کا نام اور پتہ سرمد کے فلیٹ کا تحریر تھا۔

کچھ سوچ کر انہوں نے لندن یونیورسٹی کے انکوائری آفس کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا مگر وہاں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اور بھی فکرمند کر دینے والی تھیں۔ آفس والوں نے بتایا کہ سرمد عمرے کے لئے گیا اور واپس نہیں آیا۔ انہیں جس لڑکی ریحا نے سرمد کے ڈاکومنٹس ارسال کئے' وہ سرمد کی کلاس فیلو تھی۔ بھارت کی رہنے والی اور واپس انڈیا جا چکی تھی۔ وہ دوبارہ کب لندن آئی؟ اور کب اس نے سرمد کے ڈاکومنٹس ڈاکٹر ہاشمی کو کوریئر کئے' اس سے یونیورسٹی والے لاعلم تھے۔

ڈاکٹر ہاشمی کا دل گھبرا گیا۔ ان کا اکلوتا بیٹا کہاں تھا' کیا کر رہا تھا اور کس حال میں تھا؟ انہیں اس بارے میں ایک فیصد بھی علم نہ ہو پایا تھا۔ یہ بے خبری ان کے لئے سوہان روح بنتی جا رہی تھی۔ اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔ ایک دم انہوں نے سامنے پڑا موبائل اٹھایا اور سرمد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے موبائل سرمد نے رسپانڈ نہ کیا۔ وہ بار بار ٹرائی کرتے رہے۔ پہلے مسلسل۔ پھر وقفے وقفے سے مگر کوئی رسپانس نہ پا کر ان کی بے چینی آخری حدوں کو چھونے لگی۔

انہوں نے لندن کے پیکٹ سے ریحا کا کوئی رابطہ جاننا چاہا مگر اس پر ریحا نے اپنا فون نمبر نہ لکھا تھا اور پتہ وہ دیکھ چکے

تھے کہ سرمد کے فلیٹ کا تھا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

انہیں سرمد کی حالت یاد آئی۔ وہ جس دگرگوں حال میں انہیں جدہ ایرپورٹ پر ملا تھا وہ اس کی ذہنی پریشانی کا منہ بولتا ثبوت تھی مگر انہوں نے اس کے پاکستان آ جانے پر معاملہ چھوڑ کر غلطی کی۔ اس کا احساس انہیں اب ہو رہا تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہیں اس سے ساری بات جاننے کی کوشش کرتے یا اسے ساتھ لے کر لوٹتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

ان کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔ انہوں نے سرمد کو باپ بن کر کم اور ماں بن کر زیادہ پالا تھا۔ اس کی اچانک گمشدگی اور غیر خبری ان کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔

آج صبح سے انہوں نے کوئی مریض نہ دیکھا تھا۔ اپنے کمرے میں آتے ہی انہیں دونوں پیکٹ مل گئے اور انہوں نے چپراسی سے کہہ دیا کہ مریضوں کو ڈاکٹر جمشید کے کمرے میں بھجوا دے۔ ڈاکٹر جمشید کو انٹرکام پر مریض دیکھنے کی ہدایت دے کر انہوں نے پیکٹ کھولے اور اب چکر کھاتے ہوئے دماغ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

ان کا دماغ کسی ایسے ہمدرد کو تلاش کرنے میں ناکام رہا جو اس صورتحال میں انہیں صحیح راستہ دکھا سکے یا ان کی پریشانی کم کرنے کے لئے کچھ کر سکے۔ سوچتے سوچتے انہیں طاہر کا خیال آیا۔ وہ ان سے کافی بے تکلف بھی تھا۔ اس کے زندگی بھر کے معاملات ان کے سامنے، اور اکثر انہی کے ہاتھوں طے ہوئے تھے حتیٰ کہ اس کی شادی تک ان کی مرہون منت تھی۔ اس کے تعلقات ہر شعبہ حیات میں تھے۔ THE PROUD کے حوالے سے وہ دنیا کے کئی ممالک میں جانا جاتا تھا۔

انہوں نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا اور تیزی سے طاہر کا نمبر ملایا۔ نمبر ملاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

”یس۔ انکل۔ طاہر بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے آواز ابھری تو ڈاکٹر ہاشمی کا خشک ہوتا ہوا گلا درد سے بھر گیا۔

”طاہر۔۔۔ بیٹے۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”کیا بات ہے انکل؟“ وہ چونک پڑا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”پتہ نہیں بیٹے۔“ وہ بے بس سے ہو گئے۔

”انکل۔ انکل۔“ طاہر بیتابی سے بولا۔ ”خیریت تو ہے ناں۔ کیا بات ہے آپ پریشان لگتے ہیں۔“

”بیٹے۔ وہ سرمد۔۔۔ سرمد۔۔۔“ ان کی آواز ٹوٹ گئی۔

”کیا ہوا سرمد کو؟“ طاہر کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ”انکل۔۔۔“

”پتہ نہیں بیٹے۔۔۔“ وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”سرمد کا کوئی پتہ نہیں چل رہا۔“

”پتہ نہیں چل رہا؟“ حیرت سے طاہر نے کہا۔ ”انکل۔ وہ لندن میں ہے ناں۔۔۔“

”نہیں۔ وہ وہاں نہیں ہے۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو وہ ہمیں جدہ ایر پورٹ پر ملا تھا اور بہت پریشان تھا۔ میں نے اسے عمرہ کر کے سیدھا واپس پاکستان آنے کو کہا تھا مگر۔۔۔“

ڈاکٹر ہاشمی کہہ رہے تھے اور طاہر بُت بنا ان کی بات سن رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی گونج رہی تھیں۔ اسے ڈاکٹر ہاشمی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب کچھ سمجھ میں بھی آ رہا تھا مگر جواب دینے کے لئے اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل رہا تھا۔ حواس جیسے پتھرا گئے تھے۔

”اب بتاؤ میں کیا کروں طاہر بیٹے۔ میرا سرمد کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کوئی نہیں بتاتا مجھے۔“ وہ بچوں کی طرح رو پڑے۔

”انکل“ ایک دم اسے ہوش آ گیا۔ ”آپ۔۔۔ آپ گھبرایئے نہیں۔ میں آ رہا ہوں آپ کے پاس۔ فکر کی کوئی بات نہیں انکل۔ ہم مل کر سرمد کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں آپ کے پاس۔“

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک بار صفیہ اور سرمد کے واسطے سے خیال آیا‘ جسے سر جھٹک کر اس نے دور پھینک دیا۔ اس بارے میں درویش نے اس کا من یوں دھو ڈالا تھا کہ کیا کوئی تیزاب سنگ مرمر کو دھوتا ہوگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے آفس سے نکلا اور چند لمحوں کے بعد اس کی گاڑی ڈاکٹر ہاشمی کے ہاسپٹل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

☆

حمزہ حسین اور سرمد دہلی ایر پورٹ پر اترے تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ سردیوں کی صبح کا سورج طلوع ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

خاصی سخت چیکنگ کے بعد وہ عمارت سے باہر نکلے۔ حمزہ نے ایر پورٹ سے باہر کھڑی ٹیکسیوں میں سے کسی کو لفٹ نہ کرائی اور ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے ایر پورٹ کی حدود سے باہر نکل آیا۔ جونہی اس نے ایر پورٹ بس سٹاپ پر قدم روکے ایک آٹو رکشا ان کے قریب آ رکا۔

”خاص گنج چلیں گے صاحب؟“ دبلے پتلے ڈرائیور نے گردن باہر نکالی۔

”ضرور چلیں گے بھائی۔“ حمزہ نے خوشدلی سے کہا۔ ”بیٹھو بھئی۔“ اس نے حسین اور سرمد کو اشارہ کیا۔ تینوں پھنس پھنسا کر ہینڈ بیگز گود میں رکھے رکشا میں سوار ہوئے اور ڈرائیور نے رکشا آگے بڑھا دیا۔

”ناشتہ؟“ اچانک ایک موڑ مڑتے ہوئے ڈرائیور نے پوچھا۔

”گھر چل کر کریں گے۔“ حمزہ نے مختصر جواب دیا اور تب سرمد کو پتہ چلا کہ رکشا والا ان کا اپنا آدمی ہے۔

تقریباً بیس منٹ بعد رکشا خاص گنج کی گنجان آبادی میں داخل ہوا اور ایک دو منزلہ مکان کے سامنے رک گیا۔

حمزہ نے اتر کر دروازے پر دستک دی۔ حسین اور سرمد اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ سرمد نے ایک طائرانہ نگاہ سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ پاکستان کی کسی اندرون شہر کی آبادی سے ملتا جلتا ماحول تھا۔ دکانیں اور مکان بھی ویسے ہی تھے۔ بھیڑ کا بھی وہی عالم تھا۔ ڈرائیور انہیں اتار کر رکشا وہیں چھوڑ کر کسی طرف نکل گیا۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا اور کسی نے انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔ سرمد نے اندر قدم رکھا تو دروازہ کھولنے والے باریش نوجوان نے دروازہ بھیڑ دیا۔

”قاسم کہاں ہے؟“ اس نے حمزہ سے پوچھا۔

”شاید ناشتہ لینے گیا ہے۔“ حمزہ نے بتایا اور وہ ڈیوڑھی سے گزر کر صحن میں آ گئے۔

”کب روانگی ہے؟“ بیٹھک نما کمرے کے دروازے پر جوتیاں اتار کر وہ اندر آئے تو فرشی نشست پر بیٹھتے ہوئے حمزہ نے پوچھا۔

”شام چھ بجے۔“ نوجوان نے کہا۔ پھر اس کی نظر سرمد سے ہٹ کر حمزہ پر ٹھہر گئی۔ ”یہ کون ہیں؟“

”اپنے ہی ساتھی ہیں۔ عمرے کے بعد وہیں مل گئے تھے۔“

”داؤد کو خبر ہے؟“

”نہیں۔ میں خود بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نوجوان نے بات ختم کر دی۔ پھر اس نے سرمد کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”خالد کمال۔“

”سرمد۔“ اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت قاسم ناشتے کا سامان لئے ہوئے کمرے کے دروازے پر آ رکا۔ ”خالد۔ یہ سنبھالو۔ میں ذرا داؤد کو خبر کر آؤں۔“

خالد نے دونوں شاپر اس کے ہاتھ سے لے لئے تو وہ وہیں سے لوٹ گیا۔ خالد نے جب تک حلوہ پوڑی چنے اور بالائی کے دونے پلیٹوں میں نکال کر رکھے' اتنی دیر میں ان تینوں نے باری باری اٹیچ باتھ روم میں جا کر رفع حاجت کی۔ منہ ہاتھ دھویا اور پھر ناشتے کے لئے بیٹھ گئے۔

''تم ناشتہ کر چکے کیا؟'' حمزہ نے خالد سے پوچھا۔

''نہیں۔ تم لوگ کرو۔ میں اتنی دیر میں چائے بنا لوں۔'' وہ باہر نکل گیا۔

سرمد ان دونوں کے ساتھ ناشتے میں مشغول ہو گیا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بات جتنی بھی تھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی اور جو نہ آ رہی تھی' اس کے بارے میں وہ سوال کرنا نہ چاہتا تھا۔ ناشتے کے بعد چائے کا دور چلا۔ کپ خالی ہوئے ہی تھے کہ قاسم لوٹ آیا۔

''داؤد کو خبر کر دی ہے میں نے۔ وہ ٹھیک چھ بجے ٹاٹا بس سٹینڈ آگرہ روڈ پر ہمارا انتظار کرے گا۔''

حمزہ نے جواب دینے کے بجائے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اب تم لوگ آرام کرو۔ سرینگر تک کا سفر بڑا تھکا دینے والا ہے۔'' قاسم' خالد کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

حمزہ اور حسین نے تکیے سر کے نیچے رکھے اور کمبل اوڑھ لئے۔ سرمد نے تکیہ دیوار کے سہارے کھڑا کیا اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کمبل اس نے کمر تک کھینچ لیا۔

''سونے کی کوشش کرو سرمد۔ ورنہ سفر میں دشواری ہو گی۔''

''آپ فکر نہ کریں حمزہ بھائی۔'' سرمد مسکرایا۔ ''میں جاگنے کا ایکسپرٹ ہوں۔ نیند آئی تو سو جاؤں گا۔''

حمزہ نے اس سے بحث نہ کی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ حسین اتنی ہی دیر میں خراٹے نشر کرنے لگا تھا۔

اب سرمد انہیں کیا بتاتا کہ سرینگر کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں ریحا اتر آئی تھی۔ وہ سرینگر میں جموں کشمیر روڈ پر رہتی تھی۔ انہیں بھی کشمیر جانا تھا۔ سوچیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ اس نے پلکیں موند لیں اور ایک دم ریحا کا تصور دھواں ہو گیا۔

اب گنبدِ خضریٰ سامنے تھا۔ سکون نے اسے باہوں میں لے لیا۔ ایک دم اسے کوئی خیال آیا اور سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ پھر یقین نے جیسے اس کے خیال پر مہر ثبت کر دی۔ وہ بے حس و حرکت پڑا رہ گیا۔ وہ خیال کیا تھا ایک خوشبو تھی جو اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ جب سے جدہ ایر پورٹ سے روانہ ہوا تھا' وہ جب بھی آنکھیں موندتا' گنبدِ خضریٰ اس کے تصور کے پردے پر ابھر آتا اور زبان پر درود تو ہر وقت جاری رہنے لگا تھا۔ جب وہ زبان سے کوئی بات کرنے لگتا تو دل اس وظیفے کو چومنے

لگتا۔ اس وقت بھی اس نے پلکیں موندیں تو گنبدِ خضریٰ سامنے آ گیا اور زبان، وہ تو جیسے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ اس کے ہولے ہولے ہلتے ہونٹ بے آواز درود پڑھ رہے تھے اور دز دیدہ نگاہوں سے حمزہ اسے دیکھ کر رشک محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سرمد ہر وقت درود شریف کے ورد میں محو رہتا ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ دیکھ کر وہ خود بھی درود پڑھنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی جب اس نے سرمد کے ہونٹ ہلتے دیکھے تو بے اختیار خود بھی دل ہی دل میں درود پڑھنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سرمد کو پتہ چلے کہ وہ اس کی تقلید کر رہا ہے۔ وہ اس مہک کو اپنے تک محدود رکھنا چاہتا تھا جس نے اس کے اندر عقیدت کا پودا لگا دیا تھا۔ وہ اس پودے کو چپ چاپ، خاموشی اور رازداری سے سینچنا چاہتا تھا۔

☆

داؤد تیس بتیس سال کا ایک قوی الجثہ کلین شیو آدمی تھا۔ سادہ شلوار قمیض میں بھی وہ بیحد اچھا لگ رہا تھا۔

خالد کے گھر سے چلے تو ان تینوں نے بھی یہی لباس زیبِ تن کیا جو استعمال شدہ تھوڑے سے مسلے ہوئے شلوار قمیض اور گرم واسکٹوں پر مشتمل تھا۔ سروں پر گرم اونی ٹوپیاں پہن لی گئیں اور ہینڈ بیگز وہیں چھوڑ دیے گئے۔

ٹاٹا بس سٹینڈ پر جب حمزہ نے سرمد کا تعارف داؤد سے کرایا تو اس نے چند لمحوں تک بڑی گھورتی ہوئی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ ہنس کر اس نے سرمد کو گلے لگا لیا۔ سرمد نے محسوس کیا کہ جتنی دیر وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا، اس کے جسم میں سوئیاں چبھتی رہیں۔ لگتا تھا اس کی نگاہوں سے ایکسریز خارج ہو رہی ہیں جو اس کے دل میں چھپا خیال تک جان لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ٹاٹا کی آرام دہ بس سے جب وہ چاروں سرینگر کے لئے روانہ ہوئے تو شام ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ حمزہ اور حسین کے بائیں ہاتھ دوسری جانب سرمد اور داؤد کی سیٹیں تھیں۔ راستے میں دو جگہ رک کر صبح سات بجے بس نے انہیں سرینگر لا اتارا۔ سارا سفر بڑی خاموشی سے کٹا۔ ایک جگہ کھانے اور دوسری جگہ چائے کے دوران چند رسمی سی باتیں ہوئیں اور بس۔

اڈے سے نکل کر وہ چاروں ایک قہوہ خانے پر آ رکے۔ قہوہ خانے کا مالک ایک کشمیری تھا۔ سردی زوروں پر تھی اور پندرہ بیس لوگ گرم گرم قہوے سے شغل کر رہے تھے۔

وہ چاروں ایک خالی لمبے بنچ پر بیٹھ گئے، جس کے آگے ٹوٹی پھوٹی ایک میز نما شے پڑی تھی۔ دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا ان کے لئے قہوے کے گلاس لے آیا۔ لمبی قمیض گھٹنوں سے اونچی شلوار اور ہوائی چپل پہنے ہوئے ناک سے شوں شوں کرتا وہ انہیں دو پھیروں میں قہوہ سرو کر کے جانے لگا تو داؤد نے اس کی

جانب دیکھا۔

''آدھ گھنٹے بعد ٹرک جا رہا ہے۔'' اس نے میز صاف کرتے ہوئے جھک کر یوں کہا کہ شاید ہی کسی تیسرے نے سنا ہو۔ ''کھائی پار موڑ پر۔''

داؤد خاموشی سے قہوے کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ قہوہ ختم کرتے ہی وہ اٹھ گئے۔ داؤد نے لڑکے کو چند چھوٹے نوٹ تھمائے اور وہ چاروں جیکٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سرخ مٹی سے آلودہ راستے پر چل پڑے۔ تھوڑی دور سیدھا چلنے کے بعد وہ ایک موڑ پر پہنچے اور ایک دم داؤد انہیں لے کر نیچے سبزے میں اتر گیا۔ سڑک اوپر رہ گئی۔ لمبی لمبی گھاس میں ان کے جسم گم سے ہو گئے۔ تقریباً دس منٹ تک جھک کر چلتے رہنے کے بعد وہ پھر اوپر چڑھ کر دوسری جانب کی سڑک پر آ گئے۔ موڑ مڑے تو دیکھا سامنے سے ایک ٹرک چلا آ رہا تھا' جس پر آرمی سپلائی کی تختی دور سے نظر آ رہی تھی۔

وہ ایک سائڈ پر ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ٹرک ان کے قریب آ کر رکا۔ ڈرائیور ایک بوڑھا مگر مضبوط بدن کا آدمی تھا۔

''جلدی کرو۔'' اس نے ان چاروں پر نظر ڈالی۔

داؤد ان تینوں کے ساتھ ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہوا اور ترپال گرا دی۔ وہ راشن کی بوریوں پر جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔

خاموشی ان کے لئے یوں ضروری ہو گئی تھی جیسے وہ بولیں گے تو سزا ملے گی۔ ٹرک اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ موڑ کاٹتا رہا۔ جھٹکے کھاتا رہا۔ سرمد کو جہاں جگہ ملی' وہاں سے کبھی کبھی ترپال ہلتے ہوئے ہٹ جاتی تھی اور سڑک کا منظر دکھ جاتا تھا۔ وہ ہلتے ہونٹوں پر اپنا ورد سجائے باہر دیکھ رہا تھا۔ گیارہ بج رہے تھے جب ڈرائیور نے ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ انہیں ہوشیار کیا۔

''خاموش بیٹھے رہنا۔ چیک پوسٹ ہے۔'' داؤد نے سرگوشی کی۔ باقیوں کا تو پتہ نہیں' سرمد کا سارا خون سمٹ کر اس کی کنپٹیوں میں آ گیا۔ دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ داؤد نے اس کا ہاتھ تھام کر زور سے دبایا اور شانہ تھپکا۔ اس سے آنکھیں ملتے ہی اسے حوصلہ سا ہوا۔ خشک لبوں پر زبان پھیر کر اس نے تھوک نگلا۔

''کسی کی طرف مت دیکھنا۔ بس سر جھکائے بیٹھے رہو۔'' داؤد نے دھیرے سے کہا۔ جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت ٹرک رک گیا۔ فوجی بوٹوں کی آہٹیں گونجیں اور ٹرک کو چاروں طرف سے سنگین آلود رائفلوں نے گھیر لیا۔ ایک جھٹکے سے کسی نے ترپال اٹھا دی۔ ان کے سامنے کتنے ہی فوجی رائفلیں تانے کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔

’’او رحیم خان۔‘‘ اچانک سب سے اگلے فوجی نے ان چاروں پر خشمناک نگاہ ڈال کر زور سے پکار کر کہا۔

’’جی جی کیپٹن صاب۔ جی جی۔‘‘ بوڑھا ڈرائیور لپک کر اس کے پاس چلا آیا۔

’’اس بار پھر تم چار مزدور لے کر آ گئے ہو۔ تم اپنی بے ایمانی سے باز نہیں آتے۔‘‘ وہ کڑک کر بولا۔

’’بے ایمانی کیسی کیپٹن صاب۔‘‘ رحیم خان لجاجت سے بولا۔ ’’کام بھی جلدی ہو جاتا ہے اور ان بیچاروں کو دو وقت کی روٹی بھی مل جاتی ہے۔ آپ کا کیا جاتا ہے۔‘‘

’’اچھا زیادہ بڑ بڑ نہ کر۔‘‘ وہ جھڑک کر بولا۔ پھر اس کے ہاتھ سے ایک بوسیدہ سی کاپی چھین لی۔ ’’میں دستخط کر رہا ہوں ان چاروں کے انٹری پاس اور تمہارے کلیرنس پیپرز پر۔ چلو تم لوگ۔ سب ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے فوجیوں کو اشارہ کیا اور رائفلیں جھک گئیں۔ سپاہی انہیں کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے پلٹ گئے۔

’’مہربانی صاب جی۔‘‘ رحیم خان نے دانت نکال دیے۔

’’میری چیز لائے ہو؟‘‘ کیپٹن نے بہت آہستہ آواز میں پوچھا۔

’’جی جی۔‘‘ آواز دبا کر رحیم خان نے کہا اور ادھر ادھر دیکھ کر واسکٹ کی سائڈ پاکٹ سے ایک نیلا لفافہ نکال کر آہستہ سے کیپٹن کی جیب میں سرکا دیا۔

سرمد نے صاف دیکھا‘ کیپٹن کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ اس کا سانولا پن سرخی میں ڈھل گیا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اس نے کاپی رحیم خان کو تھمائی اور اس سے نظر ملائے بغیر رخ پھیر لیا۔

’’رحیم خان۔‘‘ بڑی آہستہ سے اس نے کہا۔ ’’میں تمہارا ہمیشہ آبھاری رہوں گا۔‘‘ اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

رحیم خان نے ان کی جانب ایک نظر دیکھ کر ترپال نیچے گرائی اور ٹرک کے اگلے حصے کی جانب بڑھ گیا۔

ٹرک چل پڑا۔ سرمد نے ہلتی جلتی ترپال کے باہر دیکھا۔ چیک پوسٹ سے بیریئر ہٹا کر ٹرک کو کلیرنس دے دی گئی تھی۔ فوجی دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر جا کر کھڑے ہو گئے تھے مگر ان کی نظروں میں چھلکتی نفرت سرمد سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ بھارتی فوج راشن سپلائی کے لئے انہی کشمیریوں کی محتاج تھی جن پر وہ سالوں سے بارود برسا رہی تھی۔

’’جانتے ہو رحیم کاکا نے کیپٹن اجے کو کیا چیز دی ہے؟‘‘ ٹرک کافی دور نکل آیا تو داؤد نے سوچ میں ڈوبے

سرمد سے پوچھا۔

جواب میں اس نے داؤد کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”بھارتی فوجیوں کو کشمیر میں ڈیوٹی دیتے ہوئے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ دو ماہ میں ایک سے زیادہ خط اپنے گھر لکھ سکیں یا وہاں سے انہیں کوئی خط آ سکے۔ ڈاک پر سنسر بہت سخت ہے۔ کوئی ایسی بات ان تک نہیں پہنچنے دی جاتی جس سے وہ ڈیوٹی کے دوران ڈسٹرب ہو جائیں۔ واپس جانے کے لئے بیتاب ہو جائیں۔ یا چھٹی کی ڈیمانڈ شدت سے کرنے لگیں۔ کیپٹن اجے کے گھر سے رحیم کاکا اس کی بیوی کا دستی خط لایا ہے۔ ساتھ اس کی تین سالہ بچی کا فوٹو ہے، جسے اس نے دو سال سے نہیں دیکھا۔“

سرمد سنتا رہا اور اس کا دل کانپتا رہا۔

”ہم کشمیریوں پر ان فوجیوں کے مظالم کی، ہم سے نفرت کی ایک یہ بھی بہت بڑی وجہ ہے کہ ہم جیسے بھی ہیں، جس حال میں بھی ہیں، اپنے گھر والوں کے پاس ہیں یا ہمارے ان سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہم پر ظلم کر کے یہ اپنی اس محرومی کا بدلہ بھی لیتے ہیں اور حکومت کی نظر میں قابل فخر بھی بن جاتے ہیں۔“

سرمد نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر نجانے کیا سوچ کر خاموش ہو رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے داؤد کی جانب دیکھا جو حمزہ اور حسین سے کوئی بات کر کے سیدھا ہوا تھا۔

”ہم اب کہاں جا رہے ہیں؟“

”کشمیر کے وسطی علاقے میں بھارتی فوج کی ایک بڑی چھاؤنی ہے جہاں رحیم کاکا راشن سپلائی کرتا ہے۔ وہاں ہم راشن کی یہ بوریاں اتاریں گے۔ واپسی پر ہم ایک جگہ رات گزارنے کے لئے رکیں گے۔ وہاں تم تینوں کو کمانڈر کے حوالے کر کے میں رحیم کاکا کے ساتھ لوٹ آؤں گا۔“

”مگر واپسی پر آپ اکیلے ہوں گے تو چیک پوسٹ پر۔۔۔“ سرمد نے کہنا چاہا۔

”تمہاری جگہ تین ساتھی میرے ساتھ وہاں سے واپس آئیں گے، جن کے ذمے سرینگر اور دہلی میں مختلف کام لگائے گئے ہیں۔“

بات سرمد کی سمجھ میں آ گئی۔ زیادہ جاننے کی خواہش ہی نہیں تھی۔ حمزہ اور حسین ہلکی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ داؤد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ سرمد خاموش ہو کر اپنے ورد میں لگ گیا۔

☆

طاہر نے ڈاکٹر ہاشمی کے دکھ کو یوں سینے سے لگایا کہ وہ کسی حد تک سنبھل گئے۔ اس نے فوری طور پر سعودی

عرب اپنے دو چار ملنے والوں سے رابطہ کیا۔ THE PROUD کے حوالے سے اس کا ایک نام تھا۔ اس نے اپنا نام کیش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ امبر نے اپنے طور پر کوشش کی۔ اس ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں انہیں یہ علم ہو گیا کہ سرمد سعودی عرب سے لندن واپس نہیں گیا بلکہ اس نے انڈیا کا ویزا لگوایا اور دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

''انڈیا؟'' ڈاکٹر ہاشمی طاہر کی زبان سے سن کر چونکے۔

''جی انکل۔'' طاہر نے ملازم کو کافی کا مگ ان کے آگے رکھنے کا اشارہ کیا اور اپنا مگ تھام لیا۔ ''میں بھی وہی سوچ رہا ہوں جو آپ سوچ رہے ہیں۔''

''کہیں اس لڑکی ریحا کا کوئی تعلق تو نہیں اس سارے قصے سے؟'' وہ بیتاب ہو گئے۔

''ہو بھی سکتا ہے انکل۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ مگر اس کا اندر نہیں مان رہا تھا کہ سرمد کسی لڑکی کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔ اس کا جو کیریکٹر اس کے سامنے آیا تھا۔ اس نے جو کچھ صفیہ کے حوالے سے اس کی زبان سے سنا تھا۔ اس کے بعد سرمد کے لئے کسی اور طرف دیکھنا سمجھ میں آنے اور یقین کرنے والی بات نہ تھی۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں انڈین ایمبیسی سے رابطہ کرنا پڑے گا۔''

''ابھی نہیں انکل۔ ہمیں پہلے پورے طور پر یقین ہو جانا چاہئے کہ سرمد اسی لڑکی یعنی ریحا کے چکر میں انڈیا گیا ہے۔''

''بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو طاہر۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے مگ کے کنڈے سے کھیلتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ '' سرمد کے ڈاکومنٹس ریحا نے مجھے بھیجے ہیں جو انڈین ہے۔ سرمد سعودیہ سے پاکستان آنے کے بجائے انڈیا چلا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ ریحا سے بنتا ہے یا نہیں؟''

''بنتا ہے انکل لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سرمد نے ہی ریحا سے کہا ہو کہ اس کے ڈاکومنٹس آپ کو بھیج دے کیونکہ آپ کے بقول آپ نے اسے لندن جانے سے منع کر دیا تھا اور اس نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لندن نہیں جائے گا' پاکستان آئے گا۔''

''تو پھر وہ یہاں آنے کے بجائے انڈیا کیوں چلا گیا؟'' ڈاکٹر ہاشمی کا دماغ اور الجھ گیا۔

''یہی تو سوچنے کی بات ہے کہ جو لڑکا آپ سے کئے ہوئے وعدے کا اتنا پابند ہے کہ اس نے خود لندن جا کر ڈاکومنٹس لانے سے گریز کیا وہ آپ کے پاس لوٹ آنے کے بجائے انڈیا کیوں چلا گیا؟''

طاہر نے کہا اور ایک خیال اسے بے چین کر گیا۔ اسے وسیلہ خاتون سے سرمد کی گفتگو یاد آ گئی جس میں اس نے کبھی پاکستان نہ آنے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ کیا وہ اپنی اسی بات کو نبھانے کے لئے غائب ہو گیا؟ اس کے دل میں ایک

کسک سی جاگی۔ بات جتنی سمجھ میں آتی تھی اس سے زیادہ سمجھ سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ کسی بھی حتمی نتیجے پر پہنچنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی تک یہ سارا معاملہ انہی دونوں کے بیچ تھا۔ صفیہ اور بیگم صاحبہ کو ان دونوں نے باہمی رضامندی سے اس معاملے سے الگ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ ان کے ساتھ وہ بھی پریشان نہ ہو جائیں۔ تیسری ہستی جو اس ساری الجھن سے واقف تھی وہ تھی امبر، جسے طاہر نے صاف منع کر دیا تھا کہ اس بات کا تذکرہ پروفیسر قمر سے بھی نہ کرے۔ امبر نے اس کے لہجے سے معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا اور کرید کے بجائے اس کے ساتھ صورتحال کو سلجھانے میں شریک ہو گئی۔

''ابھی آپ انڈین ایمبیسی سے کنٹیکٹ کرنے کی بات کر رہے تھے۔'' اچانک طاہر نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ہاں۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کافی کا خالی مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''میرا خیال ہے اس کے بجائے ہم خود انڈیا چلیں گے اگر ضرورت پڑی۔''

تمہارا مطلب ہے ہمیں وہاں نہ جانا پڑے، ایسا بھی ممکن ہے؟'' امید بھرے لہجے میں انہوں نے پوچھا۔

''بالکل ممکن ہے انکل۔'' طاہر نے وثوق سے جواب دیا۔ ''میں اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اور اس معاملے میں تو مجھے بہت زیادہ بہتری کی امید ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سرمد جیسا بیٹا آپ کو پریشانی سے بچانے کے لئے تو کچھ بھی کر سکتا ہے مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ آپ کو پریشان کرنے کے لئے کوئی الٹی سیدھی حرکت کرے گا۔ بات کچھ اور ہی ہے جس تک فی الحال ہماری رسائی نہیں ہو رہی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ چند دن حالات کے رخ کا اندازہ کرنے کے لئے انتظار کیا جائے۔ سرمد سے رابطے کی مسلسل کوشش کی جائے اور دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مشکل سے نجات دے۔''

''طاہر۔۔۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ ''میرا جی چاہتا ہے میں تمہاری بات پر یقین کر لوں بیٹے مگر یہ دل۔۔۔'' وہ آبدیدہ ہو گئے۔

''میں سمجھتا ہوں انکل۔'' طاہر نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ ''ماں باپ کا دل تو ان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، یہ کسی اور کی بات کیسے مان سکتا ہے۔ تاہم میں یہی کہوں گا کہ آپ ذرا حوصلے سے کام لیں۔ اک ذرا انتظار کر لیں۔۔۔''

''میں کوشش کروں گا بیٹے۔'' انہوں نے آنسو پینے کی کوشش کی۔ ''بہر حال تمہاری باتوں نے میرا دکھ بانٹ

لیا ہے۔"

"میرا بس چلے انکل تو میں آپ کا دکھ اپنے دامن میں ڈال لوں۔" طاہر نے خلوص سے کہا۔ "آپ نے ساری زندگی مجھے جس شفقت اور دوستی سے نوازا ہے میں اس کا مول چکا ہی نہیں سکتا۔"

"شکریہ بیٹے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا اور ہاتھ کھینچ لئے۔ آہستہ آہستہ آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھے اور کچھ دور صوفے پر جا بیٹھے۔ طاہر کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ جان گیا کہ وہ اپنے آنسو چھپا رہے ہیں۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ مسلسل ذہنی گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ کسی طرح بات کا سرا اس کے ہاتھ آ جائے تو وہ سرمد کو ڈھونڈ نکالے۔

☆

کئی مربع میل پر پھیلی ہوئی فوجی چھاؤنی نمبر سینتالیس تک پہنچتے پہنچتے انہیں چار چیک پوسٹوں پر رکنا پڑا لیکن پہلی چیک پوسٹ کے کیپٹن اجے کی کلیرنس نے ان کے لئے ہر جگہ آسانی پیدا کر دی۔

ٹرک سے راشن کی بوریاں اَن لوڈ کی گئیں۔ فارغ ہوتے ہوتے انہیں رات کے آٹھ بج گئے۔ وصولی کے کاغذات پر چھاؤنی کے سٹور کیپر کے سائن لے کر رحیم خان نے کام ختم کیا۔ واؤچر بنوا کر جیب میں ڈالا اور باریک بین نگاہوں سے چاروں طرف پھیلے فوجیوں اور ایمونیشن ڈپو کا جائزہ لیتا ہوا ان چاروں کے ساتھ ٹرک میں واپس چل پڑا۔

اب داؤد اور سرمد اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ حمزہ اور حسین پچھلے حصے میں ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے جواب بالکل خالی تھا۔ ان دونوں کا تو پتہ نہیں مگر سرمد کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اتنا بوجھ اس نے زندگی میں پہلے کب اٹھایا تھا؟

رات کی تاریکی میں ٹرک چھاؤنی کی حدود سے باہر نکلا۔ ان کے انٹری پاس چیک کئے گئے۔ پھر بیریئر اٹھا کر جانے کا اشارہ کیا گیا۔ ٹرک کو کچے پر موڑتے ہوئے رحیم خان نے داؤد کی جانب ایک نظر دیکھا پھر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے دیکھنے لگا۔

’’عقوبت خانے کا اندازہ ہوا کچھ؟‘‘

’’میرے کانوں میں ابھی تک وہ چیخیں گونج رہی ہیں رحیم کاکا، جو دیواریں چیر کر مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔‘‘ داؤد نے دکھی لہجے میں کہا مگر اس کی آواز میں ایک آگ بھڑک رہی تھی جس میں وہ دشمن کو جلا کر خاک کر دینا چاہتا تھا۔ سرمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم میں خون کا دوران تیز ہو گیا تھا۔

’’میرے گاؤں کی تین جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لائے ہیں یہ درندے۔ ارد گرد کے علاقے سے ہر روز درجنوں نوجوانوں کو تفتیش کے نام پر یہاں لایا جاتا ہے جنہیں زندہ واپس جانا نصیب نہیں ہوتا۔ کل تک یہاں درندگی کا نشانہ بننے کے بعد خود کشی کر لینے والی بچیوں کی تعداد ایک سو سترہ ہو چکی ہے۔‘‘

’’بس رحیم کاکا بس۔‘‘ داؤد نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

’’کان بند کر لینے سے کچھ نہیں ہوگا بچے۔‘‘ رحیم خان نے دُکھ سے کہا۔ ’’یہ چھاؤنی نہیں ایک عذاب ہے اس علاقے میں۔ یقین کرو اگر اس کا وجود مٹ جائے تو ارد گرد کا ستر اسی میل کا علاقہ ان درندوں کے جبر سے محفوظ ہو جائے گا۔‘‘

’’میں آج کمانڈر سے اسی بارے میں بات کرنے والا ہوں کاکا۔‘‘ داؤد نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔

’’ایسے اور کتنے عقوبت خانے ہیں کشمیر میں؟‘‘ سرمد نے اچانک پوچھا۔

’’گنتی ممکن نہیں سرمد۔‘‘ داؤد نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ’’سات لاکھ انڈین فوج کی ہزاروں چھاؤنیاں ہیں یہاں۔ اور ہر چھاؤنی اپنی جگہ ایک عذاب خانہ ہے۔‘‘

’’آپ لوگوں نے اب تک کیا کیا اس سلسلے میں؟‘‘

’’اپنی سی کرتے رہتے ہیں۔‘‘ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ داؤد نے کہا۔ ’’لیکن ایسی بڑی چھاؤنی اگر تباہ کر دی جائے تو بہت فرق پڑ سکتا ہے۔ بے شمار لوگوں کی زندگیاں اور عزتیں کتنی ہی مدت تک محفوظ ہو سکتی ہیں۔‘‘

اسی وقت رحیم خان نے ٹرک ایک سائڈ پر روک دیا۔ ’’تم لوگ اب نکل جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے تینوں آدمیوں کو لے کر یہیں پہنچ جانا۔‘‘

ٹھیک ہے کاکا۔‘‘ سرمد اور داؤد کے بعد حمزہ اور حسین بھی پچھلے حصے سے اتر آئے۔ رحیم کاکا نے انہیں بڑی گرمجوشی سے گلے لگا کر دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ واپسی کے لئے تیسری چیک پوسٹ یہاں سے تقریباً تین میل دور تھی۔

داؤد آگے آگے اور وہ تینوں اس کے پیچھے پیچھے رات کے اندھیرے میں سڑک سے ڈھلوان پر اترتے ہوئے سرسراتی گھاس میں غائب ہو گئے۔ داؤد یوں ان کی رہنمائی کرتا ہوا چلا جا رہا تھا جیسے وہ ان راستوں پر پیدائش کے بعد ہی سے سفر کرتا رہا ہو۔ انہیں شروع میں تھوڑی بہت دقت ہوئی' پھر سرمد بھی حمزہ اور حسین کی طرح بے جگری سے قدم بڑھانے لگا تو جھجک اور اس کے باعث پیدا ہونے والی تھکان نے دم توڑ دیا۔ تاہم اس کا ذہن مسلسل داؤد اور رحیم خان کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ اخباروں میں پڑھی ہوئی یا ٹی وی پر دیکھی ہوئی فلموں اور اپنے مشاہدے میں جو فرق تھا' اس نے سرمد کے جسم میں ایک الاؤ دہکا دیا تھا' جس کی تپش وہ اپنے پاؤں کے تلووں سے سر کے بالوں تک میں محسوس کر رہا تھا۔

گھاس کے ڈھلوانی میدان کو عبور کر کے وہ ایک ذخیرے میں داخل ہوئے تو داؤد نے قدم روک لئے۔ چند منٹ تک وہ سب بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ داؤد سُن گن لیتا رہا۔ پھر جیسے وہ مطمئن ہو گیا۔ انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ ہلکے پیروں سے چلنے لگا۔ ذخیرے سے باہر نکلے تو چاندنی میں انہوں نے خود کو ایک چٹانی سلسلے کے سامنے پایا۔ اونچی نیچی بڑی چھوٹی سرخ اور بھوری چٹانیں انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

داؤد نے ایک بار پھر اپنے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر جیب سے موبائل نکالا اور اس پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔

’’عزت۔‘‘ دوسری جانب سے سلسلہ ملتے ہی ایک نسوانی مگر دبنگ آواز سنائی دی۔

’’یا شہادت کی موت۔‘‘ داؤد نے فوراً کہا۔

’’ہیلو داؤد۔ پہنچ گئے کیا؟‘‘

’’ہاں خانم۔ پہنچ گئے۔‘‘ داؤد نے ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے جواب دیا۔

’’کہاں ہو اس وقت؟‘‘ پوچھا گیا۔

’’پڑاؤ پر۔‘‘

’’اوکے۔ چلے آؤ۔ میں کمانڈر کو خبر کرتی ہوں۔‘‘

داؤد انہیں لئے ہوئے چٹانوں پر چڑھا۔ دوسری طرف اترے تو سامنے ایک بہت بڑی قدرتی جھیل دکھائی دی۔ جھیل کا پاٹ کسی چھوٹے موٹے دریا سے کم نہ تھا' جس میں کافی دور ایک بڑا شکارا تیر رہا تھا۔ وہ چاروں اپنا رخ شکارے کی طرف کر کے کھڑے ہو گئے۔ شکارے نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا رخ پھیرا اور ان کی طرف بڑھنے لگا۔ سرمد کا دل سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی نظریں شکارے پر جمی تھیں جو لحہ بہ لحہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ نجانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کمانڈر اسی شکارے میں ہے۔

☆

شکارا کیا تھا' ایک بڑی لانچ تھی' جس کے درمیان میں ایک بہت بڑا لکڑی سے تعمیر شدہ کمرہ تھا۔ کشمیریوں کی روایتی صناعی اس میں پوری طرح کارفرما دکھائی دے رہی تھی۔

شکارا کنارے پر آن لگا۔ پہلے داؤد' پھر سرمد' حمزہ اور حسین باری باری شکارے پر چلے گئے۔ سامنے روایتی کشمیری لباس میں اپنی پوری سج دھج کے ساتھ ایک خوبصورت دوشیزہ چہرے پر باریک سا نقاب ڈالے کھڑی انہیں بغور دیکھ رہی تھی۔ چاندنی اس کے چہرے پر اپنا پرتو ڈال رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ چاندنی رات کا ایک حصہ ہو۔

اگر وہ پردے میں چلی گئی تو رات کا حسن ادھورا پڑ جائے گا۔ وہ جس جگہ کھڑی تھی اس کے بائیں پہلو میں سٹیرنگ دکھائی دے رہا تھا۔ یعنی وہ حقیقتاً ایک لانچ تھی جسے شکارا بنالیا گیا تھا۔

’’خانم۔‘‘ داؤد نے ذرا سا سر خم کر کے اسے تعظیم دی۔ اس کی پیروی میں حمزہ اور حسین کے بعد سرمد نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے معمولی سی سر کی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دیا۔

’’کمانڈر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔‘‘ اس نے ابرو سے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

داؤد خاموشی سے کمرے کے کھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تینوں اس کے عقب میں تھے۔

وہ کم و بیش بارہ ضرب چوبیس کا ہال کمرہ تھا جس میں ایک سجے سجائے بیڈ سے لے کر ریموٹ کنٹرول ٹی وی تک موجود تھا۔ کشمیر کے شکارے جن دیومالائی داستانوں کے حوالے سے مشہور ہیں، یہاں ان داستانوں کے سارے لوازمات مہیا تھے۔

لکڑی کے فرش پر کشمیری نمدہ بچھا تھا۔ فرش پر آلتی پالتی مارے کوئی شخص نمدے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ فانوس اور قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں وہ قدیم قصے کہانیوں کا کوئی کردار لگ رہا تھا۔

داؤد نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر فوجی انداز میں سیلوٹ کیا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ حمزہ، حسین اور سرمد نے بھی اس کی تقلید کی۔ جب وہ چاروں اس کے سامنے ایک قطار میں بیٹھ گئے تو آہستہ سے کمانڈر نے سر اٹھایا۔

سرمد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی سرخ انگارہ آنکھوں سے جیسے برقی رو کی لہریں نکل رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھنا یا اس سے نظر ملانا ممکن نہ تھا۔ اس نے بھی گھبرا کر باقیوں کی طرح نظر چرالی۔ ہاں، یہ اس نے دیکھ لیا کہ کمانڈر کی عمر بمشکل تیس برس تھی۔ وہ بہت زیادہ حسین نہ تھا مگر یہ طے تھا کہ سرمد نے اس جیسا دلفریب چہرہ پہلے کم کم دیکھا تھا۔ اس میں ایک ایسی کشش تھی، جسے کوئی نام دینا مشکل تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سیاہ داڑھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

’’کیسے ہو داؤد؟‘‘ کمانڈر بولا تو ایسا لگا کوئی شیر ہولے سے غرایا ہو۔

’’بالکل ٹھیک ہوں کمانڈر۔ اور آپ؟‘‘ داؤد نے ادب سے جواب دیا۔

’’میں۔۔۔؟‘‘ جیسے کوئی درندہ ہنسا ہو۔ ’’میں تو ہمیشہ انتظار میں رہتا ہوں داؤد۔ دشمن کی بربادی اور اپنوں کے سکھ کی خبر کے انتظار میں۔ کہو۔ کوئی اچھی خبر لائے ہو کیا؟‘‘

’’میں آج چھاؤنی نمبر سینتالیس کے اندر سے ہو کر آ رہا ہوں کمانڈر۔‘‘

’’اوہ۔۔۔‘‘ وہ چوکنا ہو گیا۔ ’’پھر کیا رہا؟‘‘ اس کی دہکتی ہوئی نظریں داؤد کے چہرے پر متحرک ہو گئیں۔

”اب میں اس کا نقشہ بنا سکتا ہوں کمانڈر۔“

جواب میں کچھ کہے بغیر کمانڈر نے اپنے پہلو میں پڑے کاغذوں کا چھوٹا سا ڈھیر اور قلم اس کی طرف سرکا دیا۔

داؤد نے ایک سفید کاغذ پر چھاؤنی کا اندرونی نقشہ بنانا شروع کیا۔ یہ کام اس نے بمشکل سات آٹھ منٹ میں کرلیا۔ اس دوران کمانڈر اس کے متحرک ہاتھ پر نظر جمائے خاموش بیٹھا رہا۔

”یہ ہے ایمونیشن ڈپو کمانڈر۔“ داؤد نے کہنا شروع کیا اور قلم کی نوک ایک جگہ پر ٹکا دی۔ پھر وہ کہتا رہا اور کمانڈر کے ساتھ ساتھ وہ تینوں بھی سنتے رہے۔ سرمد بڑی یکسوئی سے داؤد کے بیانئے کو سن رہا تھا۔

”اور ایمونیشن ڈپو کے عقب میں تقریباً بیس گز دور یہ ہے وہ عقوبت خانہ کمانڈر جہاں اس وقت بھی ہماری کم از کم بائیس بہنیں ان درندوں کی ہوس کا نشانہ بن رہی ہیں۔ یہیں وہ مظلوم بھائی بھی ہیں جن کے سامنے ان کی بہنوں کی عزتیں تارتار کی جاتی ہیں۔“

”بس۔۔۔“ کمانڈر تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی آواز میں بجلیاں مچل رہی تھیں۔ ”داؤد۔ یہ ایک ٹارچر سیل نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر ایسے تشدد خانے موجود ہیں جن کے بارے میں سن کر روح کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ تاہم رحیم خان کی یہ بات درست ہے کہ اگر اس ایک ٹارچر سیل کا خاتمہ ہوجائے تو ہم ان بھارتی درندوں کے مظالم کا دائرہ کافی حد تک محدود کرسکتے ہیں۔“

”تو پلان فائنل کیجئے کمانڈر۔“ کمانڈر کے ساتھ ہی داؤد اور وہ تینوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”تھوڑا وقت لگے گا داؤد۔ یہ کشمیر کی سب سے بڑی پانچ چھاؤنیوں میں سے ایک ہے۔ ہر وقت یہاں چالیس سے پچاس ہزار فوجی موجود رہتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ جب ہم یہاں اٹیک کریں تو ایک بھی بھارتی درندہ بچنا نہیں چاہئے۔“

”ایسا ہی ہوگا کمانڈر۔“ داؤد نے ایک عزم سے کہا۔

”انشاءاللہ۔“ کمانڈر کے لہجے میں بجلی کی سی کڑک تھی۔

”انشاءاللہ۔“ حمزہ حسین اور سرمد کے لبوں سے بھی بے اختیار نکلا۔

اپنے آپ پر قابو پاتے پاتے کمانڈر کو چند منٹ لگ گئے۔ پھر اس کا لال بھبوکا چہرہ نارمل ہوا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس کے سامنے ادب سے کھڑے تھے۔

”ان تینوں کا تعارف نہیں کرایا تم نے ابھی تک داؤد۔“

”یہ دونوں حمزہ اور حسین تو حریت کانفرنس سے ٹوٹ کر آئے ہیں کمانڈر اور یہ ہے سرمد۔۔۔“

”آں ہاں۔۔۔“ کمانڈر نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”خانم کو بتایا تھا تم نے اس کے بارے میں۔“

”جی ہاں۔“

”ہوں۔۔۔“ کمانڈر نے سرمد کو بغور اور بڑی دلچسپی بھری نظروں سے دیکھا۔ سرمد کو اس کی نگاہیں جسم کے آر پار ہوتی لگیں مگر وہ بڑی ہمت سے اس کے سامنے سر جھکائے ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا رہا۔

”اسے صرف پندرہ دن کی ٹریننگ کراؤ داؤد۔ یہ خشک لکڑی ہے۔ اسے صرف چنگاری دکھانے کی ضرورت ہے۔“

”جو حکم کمانڈر۔“ داؤد نے سر خم کیا۔ ”اور یہ دونوں۔۔۔“

”انہیں فرنٹ پر بھیج دو۔ ایسے پُر خلوص جوانوں کی وہاں بہت ضرورت ہے۔ یہ دشمن کو جتنا زیادہ اور جتنی تیزی سے نقصان پہنچا سکیں' اتنا ہی اچھا ہے۔ تاہم چھاؤنی نمبر سینتالیس کے مشن میں یہ تمہارے ساتھ ہوں گے۔“

”شکریہ کمانڈر۔“ حمزہ اور حسین کے لبوں سے ایک ساتھ جذبات سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔ ”ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔“

”میں جانتا ہوں حمزہ۔ تم اپنی بہن کا بدلہ لینا چاہتے ہو اور حسین اپنی منگیتر کا۔ لیکن میرے بیٹو۔ میرے بھائیو۔ یاد رکھو۔ ہمارے جذبے میں' ہماری نیت میں جہاد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کسی ذاتی سبب کو لے کر ہماری جنگ جاری نہیں رہ سکتی۔ یہ محدود ہو جائے گی۔ اسے اللہ کے نام پر لڑو۔ اسے رسول ﷺ کی ناموس کی خاطر آفاق گیر کر دو۔ ہمارے اتحاد کا نام ”عشاق“ اسی لئے رکھا گیا ہے کہ ہم اللہ' اس کے حبیب ﷺ اور اس کے دین کے عاشق ہیں۔ کسی اور شے کو ہمارے عشق میں در آنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں' کوئی بھی سبب اس عشق کو مہمیز کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن ہماری بنیاد وہی ہے۔ عشق الٰہی۔ عشق رسول ﷺ۔ اس سے کم پر مانو نہیں اور اس سے زیادہ کچھ ہے نہیں۔“

”یس کمانڈر۔“ حمزہ کی آنکھوں میں شمع سی جلی۔

”یس کمانڈر۔“ حسین کی آواز میں شعلے کی سی لپک ابھری۔

”تو جاؤ۔ اپنے عشق کی آگ سے دشمن کا خرمن خاک کر دو۔“ کمانڈر کی آواز میں بجلی کی سی کڑک تھی۔ ”مجھے تمہاری طرف سے بہت سی خوشخبریاں چاہئیں۔“

”ایسا ہی ہوگا کمانڈر۔“ وہ دونوں سیلوٹ کر کے دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

’’اور سرمد۔۔۔‘‘ کمانڈر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ’’تمہیں تو یہ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں کہ عشق کیا چاہتا ہے؟ سرمد تو سر دینا جانتا ہے۔ تاریخ عشق گواہ ہے کہ جب جب کوئی سرمد آیا' عشق کے رخ سے ایک نیا پرت اترا ہے۔ تمہیں بھی اپنے عشق کی ایک نئی تاریخ لکھنی ہے۔ اپنے لہو میں اپنا موئے قلم ڈبونے کو تیار ہو جاؤ سرمد۔ میں دیکھ رہا ہوں تم سرخرو ہو کر رہو گے۔‘‘

’’کمانڈر۔‘‘ سرمد نے بے اختیار جھک کر اس کا ہاتھ تھاما اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور کمانڈر کے ہاتھ کی پشت پر گرے۔

’’اپنے اشکوں میں دہکتی یہ آگ بجھنے مت دینا سرمد۔ اسی آگ سے تمہیں وضو بھی کرنا ہے اور نماز بھی ادا کرنی ہے۔ نمازِ عشق تمہاری امامت کی منتظر ہے۔‘‘ کمانڈر نے اپنا ہاتھ بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور رخ پھیر لیا۔

’’داؤد۔ اسے لے جاؤ۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسے جلدی سے جلدی ضروری مراحل طے کرا دو۔‘‘ نجانے کیوں کمانڈر کی آواز بھرا گئی۔ ’’یہ ہمارا بڑا لاڈلا مہمان ہے۔‘‘

’’یس کمانڈر۔‘‘ داؤد نے سیلوٹ کیا اور ان تینوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

’’میرے آقا ﷺ۔ مہمان بھیجا بھی تو اتنی کم مدت کے لئے۔ میں تو اس کے ناز بھی نہ اٹھا سکوں گا اتنی دیر میں۔‘‘ کمانڈر ہاتھ باندھے مدینہ کی طرف رخ کئے کھڑا سسک رہا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر موتیوں کی طرح بکھر رہے تھے۔

☆

طاہر کے کہنے پر ڈاکٹر ہاشمی نے انتظار کرنا گوارا تو کر لیا مگر ان کے دل کا حال کچھ وہی جانتے تھے۔ جوان اور اکلوتے بیٹے کی گمشدگی اور مفقود الخبری نے انہیں ایک دم بوڑھا کر دیا۔ ان کی قابل رشک صحت کو جیسے نظر لگ گئی۔ ہاسپٹل میں بیٹھنا بالکل ختم کر کے وہ طاہر کے آفس کے ہو کر رہ گئے۔ امبر انہیں روزانہ فون کر کے تسلی و تشفی دیتی۔ پروفیسر قمر ان کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ رہ گیا طاہر' تو اس نے کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے زیادہ وقت آفس میں گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے طور پر لندن' سعودیہ اور انڈیا میں موجود اپنے واقف کار مختلف لوگوں سے رابطہ کر رکھا تھا۔ مگر نتیجہ ابھی تک ڈھاک کے تین پات ہی تھا۔

اس دن طاہر نے سوچ کر ایک فیصلہ کیا۔ اپنا پاسپورٹ امبر کو بھجوایا اور فون پر اسے خاص انسٹرکشنز دیں۔ امبر نے اس سے بحث نہیں کی' صرف یہ کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اسے ساتھ لے جائے مگر طاہر نے اسے نرمی

سے ٹال دیا۔ رات سونے سے پہلے صفیہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”مجھے چند دنوں کے لئے انڈیا جانا ہے۔“

”کب؟“ صفیہ نے چونک کر پوچھا۔ ”اور کیوں؟“

”ایک خاص کام سے جانا ہے اور کیا مجھے وہاں فلم میں کام کرنا ہے؟“ طاہر نے محبت سے کہا۔

”ویسے آپ کسی ہیرو سے کم بھی نہیں ہیں۔“ صفیہ نے شرارت سے اس کی جانب دیکھا۔ ”مگر اس سے پہلے آپ کبھی ایسے ٹور پر گئے تو نہیں؟“

”یہ بھی اچھی رہی۔“ طاہر نے ہنس کر کہا۔ ”ارے بھئی اب تم نے ہمیں اپنے پلو سے باندھ لیا ہے تو اور بات ہے ورنہ تو میرے مہینے میں بیس دن ملک سے باہر گزرتے تھے۔“

”اچھا۔“ صفیہ مسکرائی۔ ”تو اکیلے جا رہے ہیں کیا؟“

”ہاں۔“ طاہر نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”کتنے دن کے لئے جا رہے ہیں؟“ بستر پر لیٹی ہوئی وہ اس کے کالر سے کھیلتے ہوئے بولی۔

”دو دن بھی لگ سکتے ہیں اور دو ہفتے بھی۔ یہ تو کام ختم ہونے پر منحصر ہے۔“

”اور جانا کب ہے؟“ وہ اداس ہو رہی تھی۔

”کل شام۔“

”مجھے روزانہ فون کرنا ہوگا۔“ صفیہ نے کہا اور اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔

”ایک بات کہوں صفو۔ برا نہ ماننا۔“ طاہر نے اس کا چہرہ سامنے لانا چاہا مگر وہ زور لگا کے اس کے سینے میں گھسی رہی۔

”میں سن رہی ہوں۔“ اس نے وہیں سے جواب دیا۔

”میں وہاں جا کر تمہیں ہرگز فون نہیں کروں گا۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے چہرہ اٹھایا۔

”میں جس کام سے جا رہا ہوں ناں صفو۔ اس میں تمہاری یاد ضروری ہے۔ جو ہر وقت میرے ساتھ رہے گی۔ تم سے رابطہ کروں گا تو بے چینی لگ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی پہلو سے اس کام میں مجھے ڈسٹربنس ہو اور میں جلدی لوٹ آنے کے چکر میں پڑ جاؤں۔ اس لئے میری جان۔۔۔ فون پر کوئی رابطہ نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے پھر چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔

’’ارے۔ پاگل ہوئی ہو۔‘‘ اسے اپنے سینے پر صفیہ کی نم آنکھوں کا احساس ہوتو بے چین ہوگیا۔ ’’اگر تم ایسے کروگی تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔‘‘

’’یہ میں نے کب کہا؟‘‘ وہ وہیں سے بولی۔ ’’بس آپ جلدی آجایئے گا۔‘‘

طاہر نے اسے باہوں کے حلقے میں کس لیا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

☆

اس دن صبح ڈاکٹر ہاشمی طاہر کے آفس پہنچے تو منیجر نے انہیں کافی وغیرہ پلانے کے بعد طاہر کی طرف سے ایک لفافہ دیا۔ انہوں نے چشمہ درست کرتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے خط نکلا۔ لکھا تھا۔

’’انکل۔

میں انڈیا جا رہا ہوں۔ سرمد کے بارے میں کچھ نہ کچھ ہے جو ہمیں وہیں سے مل سکتا ہے۔ میں نے لندن یونیورسٹی سے ریحا کا ایڈریس لے لیا ہے۔ اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔ آپ کا ساتھ نہ جانا اس لئے بہتر ہے کہ جس دُکھ کی حالت اور عمر کے حصے میں آپ ہیں وہاں بیٹے کا فرض بنتا ہے کہ آپ کو آرام کرنے کو کہے اور خود آپ کے لئے سکھ کی تلاش میں نکلے۔ میں بھی ایسا ہی کر رہا ہوں۔ سرمد کے ساتھ میں بھی آپ کا بیٹا ہی ہوں۔ میں بھی سمجھتا ہوں اور آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں' یہ کہنے کی بات نہیں۔ روزانہ آفس آتے رہئے گا۔ کافی' سینڈوچ اور کریم پف آپ کا انتظار کرتے ملیں گے آپ کو۔ دعا صرف یہ کیجئے گا کہ میں آپ کے لئے خوشی کی خبر بن کر واپس آؤں۔

آپ کا: طاہر

ڈاکٹر ہاشمی نے خط میز پر ڈال دیا اور کسی سوچ میں ڈوبے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ انہیں نجانے کیوں لگ رہا تھا کہ طاہر نے انہیں ساتھ نہ لے جا کر غلط نہیں کیا۔

☆

پندرہ دن کا وقت پر لگا کر اُڑ گیا۔

داؤد نے سرمد کو ٹریننگ کیمپ میں زین خان کے حوالے کیا۔ اسے کمانڈر کے حکم سے آگاہ کیا اور خود تین ساتھیوں کے ساتھ لوٹ گیا تھا۔

ٹریننگ کیمپ کشمیر کی اترائی میں ایک ایسی جگہ قائم تھا جہاں سے آزاد کشمیر کو جانے والا ایک محفوظ تر خفیہ راستہ موجود تھا۔ بھارتی افواج کی نگاہوں سے یہ مقام اس لئے بھی پوشیدہ تھا کہ اوپر سے یہ گہری کھائی لگتا تھا' جس میں اترنا بظاہر محال مگر بباطن بیحد آسان تھا۔ آسان ان کے لئے جو اس اترائی میں جانے والی قد آدم گھاس میں چھپی اس پگڈنڈی سے واقف تھے جو اپنے مسافروں کے قدموں کے نشان اس طرح اپنی آغوش میں چھپا لیتی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کے عیب پر پردہ ڈال لیتی ہے۔

زین خان نے پندرہ دن میں سرمد کو کلاشنکوف' ریوالور اور راکٹ لانچر چلانے میں طاق کر دیا۔ گوریلا ٹریننگ کے باقی مراحل میں اس نے سرمد کو خاص خاص باتوں سے واقف کرایا اور سولھویں دن رات کو وہ پھر شکارے پر کمانڈر کے سامنے موجود تھا۔

''بیٹھو سرمد۔'' کمانڈر نے زین خان کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔ سرمد کمانڈر کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ آج وہ گوریلا یونیفارم میں تھا۔ سر پر سفید رومال بندھا تھا جو سر پر کفن باندھ کر راہ خدا میں نکل پڑنے کی علامت تھا۔ کمانڈر کچھ دیر فرش کو گھورتے سرمد کی جانب بڑی گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ابھری۔

''کوئی الجھن؟ کوئی پچھتاوا؟ کوئی بے چینی سرمد؟''

''نہیں کمانڈر۔'' سرمد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس یوں لگتا ہے جیسے میں کہیں جانا چاہتا ہوں۔ کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ یہ مرحلہ طے نہیں ہو رہا۔''

”ہاں۔“ کمانڈر کے چہرے پر سنجیدگی نے جنم لیا۔ ”یہ ہوتا ہے۔ جب تم جیسے سچے جذبوں والے سر پر کفن باندھ لیتے ہیں تب ایسا ہی ہوتا ہے۔ بلاوا آ جاتا ہے تو انتظار مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک بات ذہن میں بٹھا لو سرمد۔ جس مشن کے لئے میں نے تمہیں چنا ہے‘ اس کی کامیابی اور ناکامی سے زیادہ یہ بات اہم ہے کہ تم اس میں کیا کردار ادا کرتے ہو؟ کشتیاں جلا کر جانا ہو گا تمہیں۔ واپسی کس روپ میں ہو گی‘ کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن یہ طے ہے کہ تم جس پکار پر جا رہے ہو اس کے لئے جان لینا اور جان دینا‘ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔“

”مجھے صرف اس بات کی پروا ہے کمانڈر کہ میں جس تڑپ کے ہاتھوں بے حال ہو رہا ہوں اسے قرار کب ملے گا؟ کیسے ملے گا؟“ سرمد نے نظر اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈوروں سے مستی سی چھلک رہی تھی۔

”عشاق میں شامل ہوئے ہو سرمد۔ عشق تم پر نازل ہو چکا ہے۔ فصل پک چکی ہے۔ اب تو پھل پانے کا موسم ہے۔ اپنی بے قراری کو مہمیز کرتے رہو۔ یہ ضروری ہے۔ تمہارے لبوں پر جو ورد جاری ہوا ہے اس کا کوئی مقصد ہے۔ کوئی اشارہ ہے اس میں۔ کوئی رمز ہے اس کے اندر۔“

سرمد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ کمانڈر کیسے جانتا ہے کہ وہ ہر وقت درود پڑھتا رہتا ہے؟ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

”سوالوں میں نہ الجھو سرمد۔ جواب کی طرف دھیان دو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تم اس مہم سے زندہ لوٹو گے یا شہادت کا جام تمہارا منتظر ہے لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ جہاں سے تمہاری ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کا حکم جاری ہوا ہے‘ وہاں سے کبھی کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا۔ تم بھی لوٹو گے تو کامیاب ہو کر۔ انشاءاللہ۔“

”انشاءاللہ۔“ بے اختیار سرمد کہہ اٹھا۔

”داؤد‘ حمزہ‘ حسین اور تم سمیت بیس سرفروش اس مہم پر آج رات جا رہے ہیں۔“ کمانڈر نے اپنی جگہ چھوڑ دی تو سرمد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں تمہیں کوئی ہدایت نہیں دوں گا۔ تم عشق کا سبق پڑھ چکے ہو۔ اب تو اسے سنانے کا وقت ہے۔۔۔ اور سنانے میں کہیں اٹکنا مت سرمد۔ کہیں زبان کو لڑکھڑانے مت دینا۔ جاؤ اور سرخرو ہو جاؤ۔“ کمانڈر نے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے۔ پھر پیشانی پر بوسہ دیا اور کھینچ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ”ان سے کہنا۔ میں تمہارا کوئی ناز نہیں اٹھا سکا۔ مجھے معاف فرما دیں۔“ اس نے سرمد کے کان میں سرگوشی کی۔

ایک دم جیسے سرمد کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ ایک کیف سا رگ و پے میں دوڑ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا جسم ایک بار پھر ہوا سے ہلکا‘ بے وزن ہو گیا ہے۔ کمانڈر نے کس کے بارے میں یہ بات کہی؟ اس نے سوچنا ہی نہ چاہا۔ جیسے اسے سمجھ آ گیا ہو۔ جیسے اس نے سب جان لیا ہو مگر اس کا بولنے کو جی ہی نہ چاہا۔ وہ بے زبان ہو گیا۔ سبق یاد ہو جانے کی بات اس

کے دل سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ کمانڈر کا پیغام اسے لوریاں دے رہا تھا۔

کمانڈر نے اسے خود سے الگ کیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کے چہرے کو اپنی برق لٹاتی نم آنکھوں سے دیکھا اور بے اختیار اس کے دائیں گال پر پیار کر لیا۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹا اور سرمد کی مست نگاہی نے دیکھا کہ دونوں پاؤں جوڑ کر کمانڈر نے اسے ایک زوردار سیلوٹ کیا۔ جواب میں وہ بھی ایک قدم پیچھے ہٹا اور کمانڈر کو سیلوٹ کر کے واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

وہ جا چکا تھا مگر کمانڈر اسی طرح اپنی تین انگلیوں سے پیشانی چھوئے ہوئے دروازے کو گھور رہا تھا۔ بھیگی ہوئی دھند تھی کہ آنکھوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔ لو دیتی شبنم تھی کہ تن من کو بھگو رہی تھی اور جھومتا ہوا دل تھا کہ ایک ہی ورد الاپ رہا تھا۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

☆

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔

داؤد کی کمان میں وہ انیس سرفروش تاروں کی باڑ کاٹ کر زمین پر رینگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ چھاؤنی نمبر سینتالیس کے اندر اپنے اپنے ٹارگٹ پر ریموٹ کنٹرول بم نصب کئے۔ پھر سانپ کی سی تیزی سے اپنا کام ختم کر کے اپنی اپنی جگہ دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ سرچ لائٹ سے بچ بچا کر کام کرنا بہت مشکل تھا مگر وہ مشکل کو نہیں، ناممکن کو ممکن کر دکھانے آئے تھے۔

مشن کا پہلا مرحلہ طے ہو گیا تو اپنی اپنی جگہ سے انہوں نے بڑی ترتیب کے ساتھ چھاؤنی کے اندر مختلف جگہوں کو تاک لیا۔ داؤد، حسن اور سرمد کے حصے میں ٹارچر سیل سے قیدیوں کو رہا کرانے کی ذمہ داری آئی۔ حمزہ نے سات ساتھیوں کے ساتھ ایمونیشن ڈپو اڑانے کا کام سنبھالا۔ قاسم اور اس کے چار ساتھیوں کو چھاؤنی کا دایاں اور خالد اور اس کے چار ساتھیوں کو بایاں حصہ تباہ کرنا تھا۔

سب سے پہلے قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اپنے ساتھیوں سمیت سامنے آ گیا۔ ریموٹ کا بٹن دباتے ہی چھاؤنی کی سرچ لائٹ والا حصہ دھماکوں کی زد میں آ گیا۔ چیخیں، شور، دھماکے، فائرنگ۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ بیس سیکنڈ بعد ان کی تقلید میں خالد نے بایاں حصہ اڑا دیا اور اب وہ دس کے دس سرفروش بھارتی فوجیوں کے لئے جہنم کے دہانے کھولے میدان میں پھیلے ہوئے انہیں گولیوں سے بھون رہے تھے۔

اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے داؤد، سرمد اور حسن ٹارچر سیل کے قریب پہنچ گئے۔ ہر طرف دھول اڑ رہی

تھی۔ اپنے پرائے کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔ سرچ لائٹ کی تباہی نے بھارتی فوجیوں کے لئے بڑی مشکل کھڑی کر دی تھی۔ اندھیرے میں انہیں اچانک شب خون نے دوہری تباہی سے دوچار کر دیا تھا۔ ان کے اکثر فوجی ان کی اپنی ہی فائرنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ پھر کسی کو عقل آئی اور اس نے چیخ کر جگہ جگہ کھڑی جیپوں اور دوسری فوجی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن کرنے کے لئے کاشن دیا۔ مگر انہیں دیر ہو چکی تھی۔ خالد اور قاسم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرعت کے ساتھ حرکت کی اور ساری چھاؤنی میں بھاگتے دوڑتے ہوئے گاڑیوں پر راکٹ لانچروں کی برسات کر دی۔ تب وہاں روشنی کا سیلاب آ گیا۔ ہاں۔ بھارتی فوجیوں کی اپنی ہی جلتی ہوئی گاڑیوں سے اٹھتے شعلوں نے ہر طرف چراغاں کر دیا مگر یہ چراغاں انہیں بہت مہنگا پڑا۔ پٹرول بموں نے انہیں زندہ جلانے کا کام شروع کر دیا اور وہ جوابی حملے کے بجائے چیختے چلاتے اپنی جانیں بچانے کے لئے دوڑنے لگے۔ بھاگنے لگے۔ تب خالد، قاسم اور ان کے ساتھیوں کے لئے ان کا شکار اور بھی آسان ہو گیا۔

داؤد سرمد کے ساتھ فائرنگ کرتا ہوا ٹارچر سیل کی سیڑھیاں اترتا جا رہا تھا اور وہاں موجود بھارتی فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا کام بڑی تیزی سے مکمل کر رہا تھا۔ حسن تہ خانے کے گیٹ کے اندر کھڑا رہ کر دشمنوں کی خبر لینے لگا۔ اس کی کلاشنکوف کے برسٹ بھارتیوں کے لئے موت کا راگ الاپ رہے تھے۔

بمشکل ڈیڑھ منٹ میں وہاں موجود تمام درندوں کا صفایا ہو گیا۔ تب انہیں اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لینا پڑے۔

انہوں نے ادھر ادھر سے چادریں، پتلونیں اور قمیصیں اٹھا اٹھا کر تباہی و بربادی کی ان داستانوں پر ڈالنا شروع کیں جو انہیں ویران ویران نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ان کے برہنہ جسم ان کہی کہانیاں سنا رہے تھے۔ جسموں پر نشتروں، سگریٹوں اور بھنبھوڑنے کے نشانات درندگی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ زنجیروں اور لوہے کے حلقوں میں جکڑے دیواروں کے ساتھ بازوؤں کے سہارے اور الٹے لٹکائے گئے زخمی نوجوانوں کو آزاد کرانے میں انہیں تین چار منٹ لگ گئے۔ نوجوانوں میں سے جو تھوڑا بہت بھی ہوش رکھتے تھے، انہوں نے کتوں کی طرح مرے پڑے بھارتی فوجیوں کی کلاشنکوفیں، رائفلیں اور دوسرا اسلحہ اٹھایا اور گرتے پڑتے باہر کو بھاگے۔ حسن نے انہیں قطعاً نہ روکا۔ ان کے انتقام کی آگ میں بھارتی درندوں کو جل جانے دینا اس وقت بہت ضروری تھا۔

سات بےحد نازک حالت میں زخمی آدمی تھے جنہیں باری باری حمزہ اور سرمد نے باہر پہنچایا جہاں انہیں ان کے ایک ساتھی نے ایک بڑی جیپ میں ڈالا اور چھاؤنی کے خارجی راستے کی طرف طوفانی رفتار سے روانہ ہو گیا۔

تیرہ لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو اپنے عریاں جسموں کو چیتھڑوں، فوجی وردیوں اور چادروں میں سمیٹے باہر نکلیں اور دوسری جیپ میں سوار کر کے انہیں بھی پہلی جیپ کے تعاقب میں روانہ کر دیا گیا۔ اس وقت تک بھارتیوں کو سنبھلنے کا

کچھ موقع مل گیا۔ انہوں نے دونوں جیپوں کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر جیپوں کے عقبی حصے میں سوار خالد اور قاسم نے ان پر وہ دھواں دھار فائرنگ کی کہ انہیں جان بچانے کے لئے بھاگتے ہی بنی۔ ہوا یہ تھا کہ اچانک حملے اور اندھیرے کے باعث ایک تو بوکھلاہٹ میں انہوں نے اپنے بے شمار فوجی مار ڈالے۔ دوسرے ان کے نقصان کا ایک بڑا سبب یہ بنا کہ ایک دن پہلے وہاں سے تقریباً تیس ہزار فوجیوں کی نفری چھاؤنی نمبر انتیس میں منتقل کی گئی تھی۔ ان کی جگہ نئے فوجی دستے پہنچنے میں ابھی بارہ گھنٹے باقی تھے کہ ان پر یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ بیالیس ہزار کی جگہ اس وقت وہاں صرف بارہ ہزار فوجی تھے جن کا صفایا ایسے شبخون میں ذرا سی سمجھداری سے مشکل تو تھا ناممکن نہیں۔

ٹارچر سیل سے فارغ ہو کر سرمد، داؤد اور حسن بھی حمزہ کے ساتھ آ ملے۔ دھماکوں، چیخوں اور فائرنگ کا سلسلہ اب بھی جوبن پر تھا۔ وہ لوگ ایک گڑھے نما مورچے میں چھپے بیٹھے باہر پھیلتی تباہی کا نظارہ کر رہے تھے۔

"اپنے کتنے ساتھی کام آئے؟" داؤد نے آواز دبا کر حمزہ سے پوچھا۔

"سات۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "ان کی لاشیں ابھی ابھی نکلوائی ہیں یہاں سے میں نے۔"

"اب ہم یہاں کل کتنے لوگ ہیں؟"

"چار۔" حمزہ کے لبوں پر بڑی ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "باقی سب کو روانہ کر دیا ہے میں نے جیپوں اور لاشوں کے ساتھ۔"

سرمد بے چینی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے ایمونیشن ڈپو پر پڑیں تو اس نے چونک کر داؤد کی توجہ اس طرف دلائی۔ تین چار بھارتی فوجی ڈپو کا بڑا سا لوہے کا گیٹ کھول رہے تھے۔

"یہ کیا کرنے جا رہے ہیں؟" داؤد سرسرایا۔

"میرا خیال ہے اسلحے کے ساتھ ریزرو گاڑیاں بھی اندر ہوں گی۔ باہر موجود تقریباً تمام گاڑیاں تو بیکار ہو چکی ہیں۔" حمزہ نے جواب دیا۔

"ایمونیشن ڈپو کے گرد کتنے بم نصب کئے گئے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔" حمزہ نے جواب دیا تو داؤد کے ساتھ ساتھ سرمد اور حسن بھی چونک پڑے۔

"وہ کیوں؟" داؤد نے تیزی سے پوچھا۔

"بم نوید کے پاس تھے اور وہ سب سے پہلے شہید ہوا۔ اس کی لاش روانہ کر دی گئی تو خیال آیا۔۔۔"

"اوہ۔۔۔" داؤد چکرا کر رہ گیا۔ "اب کیا کریں؟"

موجود اسلحے کا جائزہ لیا گیا تو ایک اور خوفناک انکشاف ہوا۔ ان کے پاس راکٹ لانچر بھی نہ تھا۔ کل ملا کر چار

کلاشنکوفیں، دو ریوالور، چالیس کے قریب راؤنڈ اور ایک دستی بم ان کے پاس بچا تھا۔

’’دستی بم دھماکہ تو کر سکتا ہے مگر ایک فرلانگ میں پھیلے اس ایمونیشن ڈپو کو مکمل طور پر تباہ نہیں کر سکتا۔‘‘ داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے بیتابی سے کہا۔

’’پھر اب کیا کیا جائے؟ ہم اس ڈپو کو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔‘‘ حسن نے زبان کھولی۔

’’ایسا تو سوچو بھی مت۔‘‘ حمزہ نے فوراً کہا۔ ’’ہم مٹ جائیں گے مگر مشن کو ادھورا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔‘‘

داؤد جواب میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کسی حل کی تلاش کر رہا تھا۔ اسی وقت ڈپو کا گیٹ پوری طرح کھل گیا اور باہر کھڑے کرنل رینک کے آفیسر نے ڈپٹ کر اپنے اردگرد جمع فوجیوں سے کہا۔

’’فوراً گاڑیاں نکالو اور ان کے تعاقب میں نکل جاؤ۔ یہاں سے بیس میل تک سڑک پر کوئی موڑ نہیں ہے۔ ابھی وہ اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکے ہوں گے۔ جلدی کرو۔‘‘

فوجی اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے اندر کو بھاگے۔ داؤد کسی زخمی شیر کی طرح غرایا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔

’’داؤد بھائی۔ میں کچھ کر سکتا ہوں۔‘‘ اچانک سرمد بولا تو وہ تینوں چونکے۔

’’کیا؟‘‘ بے اختیار داؤد نے پوچھا۔

’’آپ یہیں میرا انتظار کیجئے۔‘‘ کہتا ہوا سرمد ایک دم اٹھا اور گڑھے سے نکل گیا۔

’’سرمد۔۔۔‘‘ داؤد نے بڑی تیز سرگوشی کی۔ پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر آواز دبا لی۔ تب تک سرمد نیچا نیچا دوڑتا ہوا ایک مردہ بھارتی فوجی کے پاس رکا۔ اسے پرے دھکا دے کر اس کے نیچے سے راکٹ لانچر نکالا اور آہستہ سے ان کی طرف لڑھکا دیا۔ حمزہ نے ذرا سا اونچا ہو کر ہاتھ بڑھایا اور اسے گڑھے میں کھینچ لیا۔ اسی وقت سرمد زمین پر گرا اور سانپ کی طرح رینگتا ہوا پچیس تیس قدم دور ایک دوسرے فوجی کے پاس جا رکا۔ اس کے پاس پڑا ایمونیشن بیگ تھاما اور واپسی کے لئے رخ بدل لیا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو بیگ تھا اس میں پانچ راکٹ موجود تھے۔

’’شاباش سرمد۔ میرے شیر تم نے تو کمال کر دیا۔‘‘ داؤد نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ حمزہ اور حسن بھی اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

داؤد نے راکٹ، لانچر میں لاؤنچ کیا۔ تقریباً چھ انچ اوپر اٹھ کر لانچر کو گڑھے کے کنارے پر رکھ دیا اور نشانہ لینے لگا۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی جگہ کانوں پر ہاتھ رکھے ایمونیشن ڈپو کے گیٹ کو دیکھ رہے تھے۔

جونہی پہلی جیپ کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں اور روشنی کی لکیر نے گیٹ سے باہر قدم رکھا، داؤد نے راکٹ فائر کر

دیا۔

دوسرے پل ایک کان پھاڑ دھماکہ ہوا اور گیٹ اپنے ساتھ وہاں موجود فوجیوں کے پرخچے اڑاتا ہوا تباہی کے گھاٹ اتر گیا۔ پھر جب تک انہیں کسی بات کی سمجھ آتی' داؤد نے دوسرا راکٹ فائر کر دیا اور اب کے بار اس کا نشانہ ڈپو کا اندرونی حصہ تھا۔ بس اس کے بعد تیسرا راکٹ فائر کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایمونیشن نے آگ پکڑ لی اور زمین یوں لرزنے لگی جیسے ان کے نیچے کوئی آتش فشاں کروٹیں لے رہا ہو۔ دھماکوں' چیخوں اور اندھا دھند چاروں طرف فائرنگ کا ایک سلسلہ جو شروع ہوا تو بھارتیوں کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیسے خود کو اس قیامتِ صغریٰ سے محفوظ رکھیں۔

اس دوران ایک بات ایسی ہوئی جس کی طرف مورچے میں چھپے ان چاروں کا دھیان ہی نہ گیا۔ پہلے راکٹ نے ان کی سمت کی نشاندہی کر دی تھی' اس کا انہیں احساس ہی نہ ہوا۔ جنرل نائر گاڑیوں میں مجاہدین کا پیچھا کرنے کا حکم دے کر وہاں سے چل پڑا تھا۔ اسے دوسری جگہوں پر تباہی کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے خیال میں تمام مجاہدین تباہی پھیلا کر انہی کی جیپوں پر فرار ہو چکے تھے مگر جونہی پہلا راکٹ فائر ہوا' وہ چونک کر رک گیا۔ اس وقت وہ ایک سلگتی ہوئی جیپ کے پاس تھا اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے پچیس تیس سپاہی گنیں سنبھالے چل رہے تھے۔ ایک دم اس نے ان سب کو نیچے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی جھک کر بھویں سکوڑ کر اس طرف دیکھنے لگا جس طرف سے راکٹ فائر کیا گیا تھا۔ دس سیکنڈ کے وقفے سے جب دوسرا راکٹ فائر ہوا تو اسے داؤد اور اس کے ساتھیوں کی پناہ گاہ کا پتہ چل گیا۔ اسی وقت ایمونیشن ڈپو دھماکوں اور چیخوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ جنرل نائر اس وقت وہاں سے تقریباً ایک سو گز دور تھا۔ زمین اس کے پیروں تلے کانپ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسلحے کے نام پر اب ان کے پاس سوائے بربادی کے نشانات کے کچھ نہیں بچا۔

اس نے دانت اتنے زور سے بھینچے کہ جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ بیحد ہلکی آواز میں اس نے اپنے پاس موجود فوجیوں کو ہدایات دیں اور خود ان کی کمان کرتا ہوا اس مورچے کی پچھلی طرف چل پڑا جس میں داؤد اور اس کے ساتھی چھپے بیٹھے تھے۔ چند منٹ بعد مورچے کو عقب اور دائیں بائیں سے اس خاموشی کے ساتھ گھیرے میں لیا گیا کہ ان لوگوں کو علم ہی نہ ہو سکا کہ دشمن ان کے گرد اپنا جال مضبوط کر چکا ہے۔ پتہ تو اس وقت چلا جب جنرل نائر کی چیختی ہوئی آواز نے فضا کا سینہ چیر ڈالا۔

’’ہاتھ اٹھا لو۔ تم لوگ گھیر لئے گئے ہو۔‘‘

تڑپ کر وہ چاروں پلٹے اور یہ دیکھ کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کہ نیم دائرے میں تیرہ چودہ بھارتی فوجی اپنی گنوں کی زد پر لئے انہیں بھون ڈالنے کے لئے تیار کھڑے ہیں اور سب سے آگے جنرل نائر ان کی

طرف ریوالور تانے موجود ہے۔

ایک سیکنڈ کے وقفے میں ان سب کی نظروں نے ایک دوسرے سے سوال جواب کئے اور فیصلہ ہو گیا۔ سر پر باندھے کفن کا مول چکانے کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ ان سب کے لبوں پر ایک ہی جیسی بڑی جاندار مسکراہٹ ابھری۔

”اللہ اکبر۔“ ایک فلک شگاف نعرے نے سامنے کھڑے دشمن کا دل دہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گنوں کا رخ بھارتیوں کی جانب ہوا اور بابِ جہنم کھل گیا۔

سب سے پہلے حیرت زدہ جنرل نائر کا جسم چھلنی ہوا جس پر داؤد کی کلاشنکوف غرا رہی تھی۔ حسین، سرمد اور حمزہ نے باقی فوجیوں کو نشانے پر رکھ لیا مگر گرتے گرتے جنرل نائر کے ریوالور سے دو فائر ہوئے اور حمزہ کی پیشانی پر مہر شہادت ثبت ہو گئی۔ اسی وقت داؤد نے دشمنوں کی فائرنگ سے بچانے کے لئے حسین اور سرمد کو پرے دھکیل دیا اور خود اوپر اٹھ کر اللہ اکبر کے گرجدار نعرے کے ساتھ آگ برساتی کلاشنکوف کو نیم دائرے میں گھما دیا۔ سات آٹھ فوجیوں کو کھیت کرتا ہوا داؤد مسلسل ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کا اعلان کرتا ہوا مورچے سے نکلا اور چھلنی ہوتا چلا گیا۔ پہلے فوجیوں کے عقب میں موجود فوجیوں کی دوسری قطار نے اس وقت تک اس پر فائرنگ جاری رکھی جب تک اس کا جسم زمین پر گر کر بے حس و حرکت نہ ہو گیا۔ اور گرا وہ ایسے زاویے سے کہ اس کا چہرہ مورچے میں موجود حسین اور سرمد کی جانب ہو گیا۔ اس کے لبوں سے جو آخری الفاظ نکلے، وہ تھے۔

”لبیک اللھم لبیک۔“

داؤد نے انہیں دشمن کی گولیوں سے بچانے کے لئے جو ایک طرف دھکا دیا تھا اس کے باعث سرمد کا سر مورچے کی سیمنٹڈ دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا اور وہ کوشش کے باوجود اپنے ذہن میں چھاتی تاریکی سے بچ نہ سکا۔ اس کی بیہوشی سے بے خبر حسین نے اپنے لڑھکتے جسم کو سنبھالا اور کسی زخمی شیر کی طرح اچھل کر گرجتا ہوا دشمن کی طرف لپکا۔ مورچے سے باہر نکلتے نکلتے اس کی کلاشنکوف تقریبا چھ بھارتیوں کو چاٹ گئی مگر شدید زخمی جنرل نائر نے اس وقت بھی فوجی ہمت کا مظاہرہ کیا اور آخری تین گولیاں حسین کا سینہ ادھیڑتی ہوئی نکل گئیں۔

”اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کی سرگوشی حسین کے لبوں پر ایک ابدی مسکراہٹ بن کر منجمد ہوئی اور وہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گیا۔

ڈرے ہوئے، بزدل اور موت کے خوف سے لرزہ براندام فوجیوں کے برسٹ اس کے ساکت جسم کو چھلنی کرنے میں مصروف تھے جب زخموں سے چور جنرل نائر کو دو تین سپاہیوں نے اٹھنے میں مدد دی۔ اس کی نظر داؤد، حمزہ اور پھر حسین پر سے ہوتی ہوئی مورچے میں بے حس و حرکت پڑے سرمد پر آ ٹھہری۔ ایک دم اس نے اپنا بایاں ہاتھ فضا

میں بلند کیا۔

''بس۔۔۔'' وہ زور سے چیخا۔ ''بے وقوفو۔ وہ مر چکے ہیں۔ لاشوں پر گولیاں برسانا تمہاری عادت بنتی جا رہی ہے۔''

ایک دم فائرنگ کا سلسلہ رک گیا۔ خاموشی کی چادر تن گئی۔ خون میں نہایا ہوا جنرل نائر بڑی مشکل سے اٹھا اور دائیں بائیں دو فوجیوں کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو۔ یہ زندہ ہے یا۔۔۔''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کوئی فوجی آگے نہ بڑھا۔ سب ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔

''سنا نہیں تم نے۔'' کرنل ان پر برس پڑا۔ ''نامردو۔ حرامزادو۔ نیچے اتر کر دیکھو اسے۔'' اس نے ایک فوجی کی طرف آتشیں نگاہوں سے دیکھا۔ ''تم اسے کور کرو۔'' اس نے باقی فوجیوں سے کہا اور ان سب نے گنیں مورچے کی جانب سیدھی کر لیں۔

فوجی نے تھوک نگلا اور گن بے حس و حرکت سرمد کی جانب تانے کانپتے قدموں سے مورچے میں اترنے لگا۔ اس کی جھجک سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ساکت پڑے سرمد سے بھی خوفزدہ ہے۔ مبادا وہ اس پر جھپٹ نہ پڑے۔

مورچے میں اتر کر سب سے پہلے اس نے پاؤں زمین پر پڑی کلاشنکوف پر جمایا۔ پھر جلدی سے بیٹھ کر سرمد کے نتھنوں کے نیچے ہاتھ رکھا۔

''یہ زندہ ہے سر۔'' اس نے تیزی سے کہا اور کھڑے ہو کر بیہوش سرمد پر گن تان لی جس کا چہرہ سر کے زخم سے لہولہان ہو رہا تھا۔

فوراً ہی جنرل نائر کے اشارے پر تین اور فوجی مورچے میں اترے اور ہوش و حواس سے بیگانہ سرمد کو قابو کر لیا۔

''اسے میرے سیل میں لے جاؤ۔'' خون بہت بہہ جانے کے باعث غنودگی کا شکار ہوتے جنرل نائر نے کہا۔

''اسے ہر حال میں زندہ رہنا چاہئے۔ یہ ہمیں اپنے ساتھیوں تک لے جا سکتا ہے۔''

فوجیوں نے سرمد کو نہتا کیا اور مورچے سے باہر اچھال دیا۔ پھر خود باہر نکلے اور اسکے ہاتھ پیچھے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ جبکہ جنرل نائر دو فوجیوں کے سہارے طبی امداد کے لئے چھاؤنی کے مشرقی حصے کی جانب روانہ ہو گیا۔ آنکھوں میں چھاتی ہوئی بے خبری کے عالم میں اس نے آخری بار ایمونیشن ڈپو سے اٹھتے شعلوں کو دیکھا۔ ہلکے ہوتے ہوئے دھماکوں کی آوازیں سنیں اور اس کا سر سینے پر ڈھلک گیا۔ حواس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

* * *

طاہر ایک ایسی این جی او کی سربراہ کی دعوت پر دہلی پہنچا تھا' جو انٹرنیشنل ایمنسٹی سے ربط رکھتی تھی۔ اس نے طاہر کی سرمد کے بارے میں بات سن کر اسے انڈیا آنے کو کہا اور اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ انسانی حقوق کی حامی مس مانیا نے طاہر کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ طاہر اسے ایک بار پہلے ایک انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کانفرنس میں مل چکا تھا۔ وہ تبھی سے اس کی شیدائی تھی۔

اٹھائیس سالہ مانیا حسن کا شاہکار تھی۔ ابھی تک کنواری تھی اور بائیس تئیس سے زیادہ کی نظر نہ آتی تھی۔ اس کی نظروں میں طاہر کے لئے ایک خاص قسم کا والہانہ پن تھا۔

ہوٹل آگرہ ویو میں مانیا نے طاہر کے قیام کا انتظام و انصرام اپنی این جی او کی طرف سے کیا تھا۔ اپنے سوٹ میں پہنچ کر طاہر نے وقت ضائع کیے بغیر مانیا کے سامنے اپنا مسئلہ دوبارہ دہرایا۔ مانیا نے ساری بات سنی۔ چند لمحے غور کیا۔ پھر اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے طاہر کی جانب دیکھا۔

''مسٹر طاہر۔ اس کے بارے میں مکمل معلومات کے لئے مجھے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔'' وہ بولی تو جلترنگ سے بج اٹھے۔

''کتنا وقت؟'' طاہر نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''دو سے تین دن۔ کام اس سے بہت کم وقت میں بھی ہو سکتا ہے مسٹر طاہر۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر میں کم وقت کے ٹارگٹ کا رسک نہیں لینا چاہتی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ آپ کم سے کم وقت میں ریحا اور سرمد کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کر کے مجھے بتائیے۔'' طاہر نے نرمی سے کہا۔ ''میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''میں یہ کام آؤٹ آف دی وے جا کر کروں گی مسٹر طاہر اور صرف اس لئے کہ آپ مجھے اپنے خاص دوستوں کی فہرست میں شامل کر لیں۔'' اس نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ورنہ تو یہ کام انڈین ایجنسیوں کے لئے بڑی دلچسپی کا حامل ہے کہ وہ اسے اپنا ٹارگٹ بنا کر معاملے کو سیاسی اور فوجی رنگ دے دیں۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' طاہر نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ ''اور میں دوستی کے ناطے ہی آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں۔''

''تو پھر احسان مندی کیسی مسٹر طاہر۔'' وہ ہنسی۔ ''دوستی میں صرف حکم دیا اور مانا جاتا ہے۔ کیا نہیں؟'' اس نے طاہر کی نظروں میں جذب ہونے کی کوشش کی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مس مانیا۔ تو اس حکم کو مان کر آپ مجھے اپنی دوستی سے نوازیے۔ یہ تو ٹھیک ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''بالکل۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ کھل کر ہنسی۔ ''تو اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں ابھی سے یہ کام شروع کر رہی ہوں۔ ہاں۔'' وہ کھڑی ہو کر بولی۔ ''مسٹر سرمد کا کوئی فوٹو ہے آپ کے پاس تو مجھے دے دیں۔''

جواب میں طاہر نے اپنے پرس سے پاسپورٹ سائز کا سرمد کا ایک فوٹو نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا میں امید رکھوں کہ معاملات مکمل رازداری میں رہیں گے مس مانیا؟'' طاہر نے مانیا کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

''یہ کہنے کی نہیں آزمانے کی بات ہے مسٹر طاہر۔ اور مجھے آزمایا جانا اچھا لگتا ہے۔'' وہ فوٹو تھام کر مسکرائی۔ پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ''اپنا سیٹ آن رکھیے گا۔ ہمارا رابطہ صرف موبائل پر رہے گا۔'' وہ کہہ باہر نکل گئی۔

☆

کرنل رائے چھاؤنی نمبر سینتالیس کی تباہی کی رپورٹ پر یوں آگ بگولہ ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی پر بٹھا دیا ہو۔

گٹھے ہوئے بدن، قابل رشک صحت اور سرخ و سفید رنگت کا مالک ناٹے قد کا کرنل رائے یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ چھاؤنی جوان کے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتی تھی، یوں بربادی کے گھاٹ اترے گی کہ وہاں موجود بارہ ہزار میں سے صرف نو سو چھپن فوجی زندہ بچیں گے۔ ایمونیشن ڈپو کی تباہی اس پر مستزاد تھی۔ انکوائری کمیشن بٹھا دیا گیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کی رپورٹ بھی ٹائیں ٹائیں فش کا راگ الاپتی نظر آئے گی۔

وہ سگار دانتوں میں دبائے اپنے نجی آفس کا قالین روند رہا تھا۔ بار بار اس کی نظر میز پر پڑے ٹیلیفون سیٹ سے ٹکراتی اور مایوس ہو کر لوٹ آتی۔ اسے انتظار تھا ایک فون کا۔ بے چینی جب انتہائی حدوں کو چھونے لگی تو رک کر بجھے ہوئے سگار کو دوبارہ سلگایا۔ لائٹر جیب میں ڈال کر اس نے دو تین گہرے کش لئے اور پھر ٹہلنے لگا۔

اچانک فون کی بیل نے اسے چونکا دیا۔ لپک کر وہ میز کے قریب پہنچا اور تیزی سے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔ کرنل رائے اسپیکنگ۔“ کٹکھنے کتے کی طرح وہ غرایا۔

”سر۔ میں کیپٹن آدیش بول رہا ہوں۔ جنرل نائر کا بھیجا ہوا آتنک وادی سیل میں پہنچ گیا ہے سر؟“

”میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ کر اضطراب کے عالم میں کمرے سے نکل گیا۔

اس نے اپنی ہی کوٹھی کے تہہ خانے میں تفتیشی سیل بنا رکھا تھا۔ خطرناک مجرموں اور دہشت گردوں کی زبان کھلوانے کے لئے اس کا ٹارچر سیل پوری فوج میں مشہور تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس سیل کو فوجی سرپرستی حاصل ہے۔ یہاں ٹارچر کے ساتھ ساتھ علاج کے لئے بھی چار کمروں کا مختصر سا جدید ترین منی ہاسپٹل موجود تھا جہاں ان زخمیوں کی بہترین دیکھ ریکھ ہوتی تھی جنہیں مزید کچھ دیر زندہ رکھا جانا مقصود ہوتا تھا۔ یہاں قائم کسی ایک شعبے کا دوسرے سے براہ راست کوئی تعلق تھا۔ ہر کارکن کرنل رائے کے بعد کیپٹن آدیش کو جواب دہ تھا جو وہاں کا انچارج آفیسر تھا۔

اس سیل میں حسین ترجسمانی رشوت سے لے کر اذیت دینے کے جدید ترین طریقوں سے کھل کھلا کر کام لیا جاتا تھا اور کہیں نہ کہیں مجرم ضرور اپنا آپ ہار دیتا تھا لیکن یہ تجربہ بھی اسے ہو چکا تھا کہ کچھ دیوانے ایسے بھی ان کے ہاتھ لگتے تھے جو جان دے دیتے تھے مگر زبان کھولتے تھے نہ ہار مانتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ بالآخر ہاتھ پاؤں باندھ کر تیزاب کے ٹب میں ڈبو دینے پر مجبور ہو جاتا تھا مگر تب بھی ان کے لبوں سے اللہ اکبر کے نعروں اور کلمہ طیبہ کے سوا کچھ ادا نہ ہوتا تھا۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ اپنے سر پر موجود گنے چنے بال بھی نوچ ڈالے۔ اس کی بے بسی اس کے ماتحتوں کو منہ چھپا کر ہنسنے پر مجبور کر دیتی‘ جس کا غصہ وہ گالیاں بک کر نکالتا۔

اپنے دماغ میں خیالاتی کھچڑی پکاتا وہ کوٹھی کی انیکسی کے ساتھ تہہ خانے میں قائم سنٹرلی ساؤنڈ پروف ٹارچر سیل کے دروازے پر پہنچا۔ دیوار میں دائیں ہاتھ ایک خانے میں لگی چمکدار میٹل پلیٹ پر انگوٹھا رکھ کر دبایا۔ اس کے انگوٹھے کی لکیریں شناخت میں آتے ہی دروازہ بے آواز کھل گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا۔ اس کے پیچھے خودکار سسٹم کے تحت دروازہ بند ہو گیا۔ تین جگہ کھڑے گن مینوں نے اسے زوردار سیلوٹ کیا جنہیں نظر انداز کرتا ہوا وہ کاریڈور کا موڑ گھوم گیا۔ سامنے شیشے کی دیوار کے پار نیم اندھیرے کمرے کے عین درمیان کرسی کے بازوؤں اور پایوں کے ساتھ بندھا وہ آتنک وادی خون میں نہایا نظر آ رہا تھا جس کا سینے پر جھکا سر بتاتا تھا کہ وہ بیہوش ہے۔ اس کے عین اوپر چھت سے لٹکتا بے پناہ تیز روشنی دیتا مرکری بلب اپنے شیڈ سمیت ہولے ہولے آگے پیچھے ہل رہا تھا۔

”سر۔“ وہ کمرے میں داخل ہوا تو کیپٹن آدیش کے ساتھ موجود تین فوجی سپاہیوں کی ایڑیاں بھی بج اٹھیں۔ ان کے سیلوٹ کا جواب سر کی ہلکی سی جنبش سے دیتا ہوا وہ آتنک وادی کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔

’’اس نے کچھ بتایا؟‘‘ وہ نفرت سے چنگھاڑا۔

’’نو سر۔‘‘ کیپٹن آدیش نے کھٹ سے کہا۔ ’’ہم نے اسے اسی حالت میں وصول کیا ہے۔ جنرل نائر نے اس پر تشدد کی انتہا کر دی ہے مگر یہ تو جیسے گونگا ہے۔‘‘

’’یہاں گونگے بھی بول اٹھتے ہیں، تم جانتے ہو۔‘‘ نخوت سے کرنل رائے نے کہا۔ ’’اسے ہوش میں لاؤ۔‘‘

فوراً ہی ایک فوجی نے کونے میں رکھی میز سے جگ اٹھایا اور پانی آتنک وادی کے سر پر دور ہی سے اچھال دیا۔

لرز کر سرمد نے حرکت کی اور ورم آلود پپوٹوں کو زور لگا کر کھولنے کی کوشش کی۔ ایک کراہ اس کے پھٹے ہوئے خون آلود ہونٹوں سے خارج ہوئی اور سر اٹھتے اٹھتے پھر ڈھلک گیا۔ تاہم اب وہ ہوش میں تھا۔

اسی وقت کیپٹن آدیش نے آگے بڑھ کر اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکے سے چہرہ اوپر اٹھایا اور بلب کی برمے جیسی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں گھستی چلی گئی۔

’’کیا نام ہے تمہارا؟‘‘ کرنل رائے اس کے سامنے آ گیا۔

جواب میں سرمد نے کراہتے ہوئے سر کے بال چھڑانے کی ناکام کوشش کی مگر کیپٹن آدیش نے اسے سختی سے قابو کیے رکھا۔

’’جواب دو۔ کیا نام ہے تمہارا؟‘‘ جنرل کی آواز میں غراہٹ ابھری۔ ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ گھوم گیا۔ تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ سرمد کے خون آلود ہونٹوں کے زخم پوری طرح کھل گئے۔ ’’بولو۔‘‘ اب کے جنرل کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ پھر وہ مسلسل اس پر تھپڑ، گھونسے اور لاتیں برسانے لگا۔ بالکل پاگلوں کے انداز میں وہ اس پر پل پڑا تھا۔

’’یہ بیہوش ہو چکا ہے سر۔‘‘ منہ سے کتوں کی طرح کف چھوڑتے اور ہانپتے جنرل کو جب کیپٹن آدیش نے بتایا تو وہ ہوش میں آ گیا۔

’’جنرل نائر نے کچھ بتا بھیجا ہے اس کے بارے میں؟‘‘ ایک طرف ہٹ کر اپنے خون آلود ہاتھ ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

’’یہ فارم ساتھ آیا ہے سر۔‘‘ کیپٹن آدیش نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

جنرل نے اس کاغذ پر نظر دوڑائی۔ نام سے لے کر پتے تک کے آگے ’’نامعلوم‘‘ کا لفظ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ غصے سے اس نے کاغذ کے پرزے اڑا دیے۔ پھر کیپٹن کی طرف دیکھا۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔ خوب پیٹ بھر کر کھلاؤ اور سونے مت دو۔ سمجھے۔'' کرنل نے سرمد کے بیہوش سراپے پر نفرت آلود نگاہ ڈالی اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ ''میں اپنے آفس میں موجود ہوں۔ پل پل کی خبر دیتے رہنا۔''

''یس سر۔'' کیپٹن آدیش نے فوجی انداز میں کہا اور سیلوٹ کے لئے اس کے ساتھ باقی تینوں فوجیوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔

☆

دوسرے دن شام تک طاہر نے اپنے طور پر فون پر کچھ لوگوں سے رابطہ کر کے معلومات حاصل کرنا چاہیں مگر کوئی امید افزا بات سامنے نہ آئی۔ وہ ہوٹل کا فون قطعاً استعمال نہ کر رہا تھا۔ اس کی پوزیشن بڑی نازک تھی۔ بار بار سوچتا کہ ایک دم مانیا پر اعتماد کر لینے کا اقدام کہیں اسے کسی مشکل میں نہ ڈال دے مگر طاہر کے پاس رسک لینے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ تاہم اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ اس نے مانیا کے بارے میں جو اندازہ لگا کر اس پر اعتماد کیا ہے' وہ غلط نہیں ہے۔

اس وقت وہ ٹی وی پر ایک نیوز چینل دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس۔'' طاہر نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز بند کر دی اور دروازے کی جانب دیکھا' جو اندر سے لاک نہیں تھا۔ ''کم ان۔''

دروازہ کھلا اور ہنستی مسکراتی مانیا اندر داخل ہوئی۔

''گڈ ایوننگ مسٹر طاہر۔''

''گڈ ایوننگ مس مانیا۔'' طاہر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا اور بیڈ سے اٹھ گیا۔ اس نے طاہر کا ہاتھ جو تھاما تو خود طاہر ہی کو واپس کھینچنا پڑا۔ ''بیٹھئے۔'' طاہر اس کے ساتھ صوفے تک چلا آیا۔

''آپ نے تو رابطہ نہ کرنے کی قسم کھا لی شاید۔ میں انتظار کرتی رہی کہ آپ کنٹیکٹ کریں گے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اعتماد کرنا آتا ہے مجھے مس مانیا۔ آپ جب تک رابطہ نہ کرتیں میں اسی اعتبار کے سہارے ٹیک لگا کر وقت گزارتا رہتا کہ آپ میرے کام میں مصروف ہیں۔'' طاہر نے مانیا کو مکھن میں غوطہ دیا۔

''اوہ نو۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔ ''اتنی بلندی سے مت نوازیے مسٹر طاہر کہ میں نیچے دیکھنا ہی بھول جاؤں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں مس مانیا۔ بہر حال اب میں آپ کی طرف سے کسی اچھی خبر کے لئے بیتاب ہوں۔'' اس

نے انٹرکام پر لوازمات کا آرڈر دیا اور مانیا کے سامنے آ بیٹھا۔

”خبر نہیں۔ خبریں مسٹر طاہر۔ اب وہ اچھی ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ آپ کو خود کرنا ہوگا۔“ مانیا نے اپنے کندھے سے بڑا نازک سا شولڈر بیگ اتارا۔ کھولا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اپنے سامنے پڑی میز پر پھیلا لیا۔

”میں ترتیب سے بتاتی ہوں۔“

طاہر کے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ اضطراب آلود نگاہوں سے مانیا کو دیکھنے لگا جس نے سسپنس سے پرہیز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”بیس جنوری کو سرمد سعودی عرب سے دہلی پہنچا۔ اس نے اپنے قریبی پولیس سٹیشن میں اپنی آمد کا کوئی اندراج نہیں کرایا۔ وہ کہاں گیا؟ کہاں ٹھہرا؟ کس سے ملا؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ ہاں۔ اس کے حلیے کا ایک آدمی اکیس جنوری کو ٹاٹا بس سروس سے سرینگر کے لئے روانہ ہوا۔ سرینگر سے وہ کہاں گیا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔“

سانس لینے کے لئے مانیا رکی اور اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جو ہمہ تن گوش ہو کر اسے سن رہا تھا۔

”ریحا لندن سے واپس آئی۔ واپسی کے تقریباً تین ہفتے بعد وہ ایک دن کے لئے دوبارہ لندن گئی۔ سرمد کے فلیٹ سے اس کے ڈاکومنٹس لے کر پاکستان پارسل کئے اور اگلے دن انڈیا لوٹ آئی۔ اس کی لندن جانے کی ڈیٹ تئیس جنوری اور واپس لوٹنے کی چوبیس جنوری ہے۔ اس کے بعد سے اب تک وہ سرینگر میں اپنے گھر پر موجود ہے۔ اس نے باہر آنا جانا بہت کم کر دیا ہے۔ ہر وقت ہنسنے کھیلنے والی ریحا اب چپ چپ رہتی ہے۔ سہیلیوں سے بھی کم ملتی ہے۔ ینگسٹرز کلب کی رکن ہے مگر وہاں جانا بھی تقریباً چھوڑ چکی ہے۔ اس کے والدین اس کی اداسی سے پریشان ہیں مگر وہ اس کی کوئی وجہ نہیں بتاتی۔ ہاں۔ ایک معمول بنا لیا ہے اس نے کہ ہر شام سیتا مندر جا کر دیا جلاتی ہے جو اس کے گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔“

”حیرت انگیز۔“ طاہر نے تحسین آمیز نظروں سے مانیا کی طرف دیکھا تو وہ کھل اٹھی۔ ”اتنے کم وقت میں ایسی امید افزا معلومات حاصل کر لینا آپ ہی کا کام ہے مس مانیا۔“

”تھینکس مسٹر طاہر۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ اس کی نظروں میں جلتے دیپ طاہر کے چہرے پر لو دے رہے تھے۔

”لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان معلومات سے ہمارا مسئلہ تو حل نہیں ہوا۔“ طاہر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”بالکل درست۔“ مانیا نے اس کی جانب دیکھا۔ ”آپ غلط نہیں کہہ رہے مسٹر طاہر۔ تاہم میں ایک راستے کی نشاندہی کر سکتی ہوں جس پر چل کر ہم سرمد کے بارے میں مزید کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔“

”وہ کون سا راستہ ہے مس مانیا؟“ طاہر نے اس کی جانب بغور دیکھا۔

''ہمیں سرینگر جانا پڑے گا۔ ریحا سے ملنا ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔''

''ہاں۔ یہ خیال تو میرے ذہن میں بھی آ رہا تھا۔'' طاہر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''بس۔ تو وہاں چلتے ہیں۔ اگر میں واقعات اور صورتحال کے ڈانڈے ملانے بیٹھوں تو نجانے کیوں مجھے سرمد اور ریحا میں ایک انجانا سا تعلق محسوس ہوتا ہے۔ شاید ریحا سے مل کر ہمیں کوئی سرا ہاتھ آ جائے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مس مانیا۔'' طاہر نے اس کی تائید کی۔

''تو پھر طے رہا کہ کل صبح ہم سرینگر چل رہے ہیں۔'' مانیا نے جیسے فیصلہ سنایا۔ ''آپ اپنا پاسپورٹ مجھے دے دیں۔ تاکہ میں ضروری کاغذی کارروائی مکمل کرا لوں۔''

طاہر نے اپنا پاسپورٹ مانیا کے حوالے کر دیا جسے اس نے اپنے شولڈر بیگ میں ڈال لیا۔ اسی وقت دونوں کی نظریں ملیں۔ طاہر کی نگاہوں میں نجانے کیا تھا کہ مانیا کا دل یکبارگی زور سے دھڑک اٹھا۔ طاہر بڑی بے باکی سے اسے گھور رہا تھا اور ایک بار جب اس کی نظریں مانیا کی نرم و نازک گردن سے نیچے اتریں تو وہ خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

''مس مانیا۔'' طاہر نے جیسے ماحول کا تناؤ کم کرنا چاہا۔ ''ہمیں ریحا سے ملنے میں کس قسم کی دشواری ہو سکتی ہے؟ اس پر بھی غور کر لینا چاہئے۔''

''کوئی دشواری نہیں ہو گی مسٹر طاہر۔'' وہ بھی سنبھل گئی۔ ''ایک بات جس کا میں نے پہلے آپ سے ذکر نہیں کیا' یہ ہے کہ جب آپ نے مجھے ریحا کا ایڈریس دیا تھا میں تبھی ایک حد تک مطمئن ہو گئی تھی اور مجھے لگا تھا کہ ہمیں سرینگر جانا پڑے گا۔''

''وہ کیوں؟'' طاہر چونکا۔

''اس لئے کہ میں تھوڑا بہت ریحا کے باپ کو جانتی ہوں۔''

''شیام رائے کو؟'' طاہر حیران ہوا۔

''شیام رائے نہیں۔ کرنل شیام رائے کو۔ ریحا کرنل رائے کی اکلوتی بیٹی ہے۔''

''کیا؟'' طاہر اچھل پڑا۔ پھر اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس نے سنبھالا لیا۔ ''میرا مطلب ہے آپ کس طرح اسے جانتی ہیں؟'' اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔

''کرنل شیام رائے کے نجی سیل میں میرا ایک دور کا کزن ملازم ہے۔ اب تک کی معلومات میں اسی سے حاصل کر پائی ہوں۔'' مانیا نے بتایا۔

’’اوہ۔۔۔‘‘ طاہر بظاہر مطمئن سا ہو گیا۔

’’اور میں چاہوں گی کہ اس سے ملاقات ہم کرنل رائے کی لاعلمی میں کریں۔ یہی ہمارے لئے بہتر ہو گا۔ وہ فوجی آدمی ہے اور آپ مسلمان۔ شاید وہ اسے پسند نہ کرے۔ بات کوئی اور رنگ اختیار نہ کر جائے اس لئے ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔‘‘

’’مس مانیا۔ آپ میرے لئے خطرہ مول لے رہی ہیں۔‘‘ طاہر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

’’جی نہیں۔‘‘ اس نے طاہر کی جانب نظر اٹھائی۔ ’’میں صرف آپ کی دوستی جیتنے کی کوشش کر رہی ہوں۔‘‘

’’وہ تو آپ جیت چکیں مس مانیا۔‘‘ طاہر کی نظروں میں اس کے لئے کوئی پیغام تھا۔

’’تو میں اس کا ثبوت چاہوں گی مسٹر طاہر۔‘‘ اس نے نگاہوں کی کمند طاہر کی جانب اچھالے رکھی۔

’’ثبوت آپ کو سرینگر سے واپسی پر مل جائے گا مس مانیا۔‘‘

’’شرط ہے کیا؟‘‘ وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی۔

’’بالکل نہیں۔‘‘ طاہر نے دھیرے سے کہا۔ ’’ذہنی فراغت چاہتا ہوں اور بس۔‘‘

’’میں انتظار کروں گی اس پل کا مسٹر طاہر جب۔۔۔‘‘

اسی وقت ویٹر نے دروازے پر دستک دی اور مانیا کی بات ادھوری رہ گئی۔ مگر نہیں، اس کی ادھوری بات طاہر کی نظروں میں ابھرتی اس چمک نے پوری کر دی تھی جو ایک بار پھر اس کے نیم برہنہ گداز شانوں سے ٹکرا کر پیدا ہوئی تھی۔

اذیتوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

سرمد کو زبردستی حلق تک مرغن غذا کھلا کر بٹھا دیا جاتا۔ جونہی اسے غنودگی ہونے لگتی نیند کی زیادتی اس کی پلکوں پر بوجھ ڈالتی تو سر کے بال کھینچ کھینچ کر تھپڑوں اور گھونسوں سے اسے جاگنے پر مجبور کیا جاتا۔ کبھی اسے فاقے کی دلدل میں دھکیل دیا جاتا۔ مسلسل فاقہ اسے ضعف کے مارے ہلنے جلنے سے معذور کر دیتا مگر اسے کھانے کے نام پر ایک کھیل اور پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ نہ دیا جاتا۔ کئی بار کرنل رائے نے فضلے سے بھرا ڈبہ اس کی ناک کے عین نیچے لٹکا کر کئی کئی گھنٹے تک غیر انسانی حالت میں رکھا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں زخم نہ لگایا گیا ہو۔ ان زخموں میں نمک چھڑکا جاتا۔ مرچیں بھر دی جاتیں۔ زخموں پر بھوری چیونٹیاں چھوڑ دی جاتیں جو اس کا گوشت نوچتیں تو اس کی چیخیں ٹارچر سیل میں پورا پورا دن گونجتی رہتیں۔ کراہیں رات رات بھر اس کے لبوں سے خارج ہوتی رہتیں۔ سگریٹ سے اس کا سارا جسم داغ دیا گیا۔ پیروں کے ناخن کھینچ دیئے گئے۔ تپتے لوہے کی پلیٹوں پر پہروں کھڑا رکھا گیا۔ برف کی سلوں پر گھنٹوں لٹایا گیا۔ جسم کے نازک حصوں پر الیکٹرک شاک دیا گیا۔ اور ان سب اذیتوں سے چھٹکارے کا لالچ دے کر اس سے پوچھا جاتا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟“

”اپنے ساتھیوں کے نام اور پتے بتاؤ۔“

”اپنے گروپ کا نام بتاؤ۔“

کرنل رائے کے ہر سوال کے جواب میں سرمد کے لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھرتی اور وہ اپنے ورم آلود ہونٹوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے کہتا۔

”میرا نام غلام ہے۔ میں اپنے آقا ﷺ کا غلام ہوں۔ میرا ٹھکانہ میرے اللہ کی رضا اور محبت ہے۔ میرے ساتھی اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہیں۔ میرے گروپ کا نام عشق رسول ﷺ ہے۔“

یہ جواب کرنل رائے کے تن بدن میں آگ لگا دیتے۔ اب تک اس کا واسطہ بڑے بڑے سخت جان مجاہدین سے پڑا تھا مگر جس قسم کی باتیں سرمد کرتا تھا وہ اسے سرتاپا شعلہ بنا دیتیں۔ پھر وہ جتنا بھی ضبط کرنا چاہتا' سب بے سود ثابت ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ سرمد پر دن بدن اس کے ستم بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس سخت جان آتنک وادی کا کیا حال کرے کہ اس کی زبان مطلوبہ معلومات کے لئے کھل جائے۔

کوئی اور ہوتا تو اب تک جان سے گزر گیا ہوتا مگر سرمد تھا کہ جیسے اس کے جسم میں ہر روز ایک نئی طاقت عود کر آتی تھی۔ کیپٹن آدیش نے اکثر محسوس کیا تھا کہ ہوش میں ہو یا نہ ہو' سرمد کے نیم متحرک ہونٹوں سے کچھ پڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایک روز اس نے کان لگا کر سنا اور جو الفاظ اس کے کانوں میں اترے ان کے اثر سے اس کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی۔ اسے لگا جیسے وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکے گا۔ اس کے سارے جسم پر جو لرزا طاری ہوا تو حالت سنبھلتے سنبھلتے کئی منٹ لگ گئے۔ وہ لڑکھڑا کر پرے پڑی کرسی پر گر سا پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اب بھی اس کے کانوں میں سرمد کی مستی میں ڈوبی ہلکی ہلکی آواز خوشبو انڈیل رہی تھی۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

سرمد کے ہونٹ یہی دہرا رہے تھے۔

یہ کیسے الفاظ تھے؟ کیا یہ اس مسلمان کا کوئی مذہبی اشلوک تھا؟ کوئی منتر تھا؟ وہ کچھ بھی سمجھ نہ پایا مگر اس دن سے اس میں ایک تبدیلی آ گئی۔ اس دن کے بعد اس کا ہاتھ سرمد پر نہ اٹھا۔ اس کا جی ہی نہ چاہتا تھا کہ اسے اذیت دے۔ اسے تکلیف پہنچانے کا خیال ہی کیپٹن آدیش کو لرزہ براندام کر دیتا۔ اب اس کی کوشش ہوتی کہ سرمد پر دوسرے فوجیوں کے بجائے اسی کی ڈیوٹی لگی رہے تاکہ وہ اسے عقوبت سے بچائے رکھے۔ دن میں کئی بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سرمد کے لبوں سے وہی طلسمی الفاظ پھرتے جنہوں نے اس کی کایا کلپ کر دی تھی۔ ایسا وہ اس وقت کرتا جب سرمد بیہوش ہوتا اور اس کے آس پاس دوسرا کوئی نہ ہوتا۔ تب وہ چوری چوری اس کے لبوں سے کان لگا دیتا اور ان الفاظ کی مہک اپنی سماعت میں اتارنے لگتا۔ اس کا جی نہ بھرتا مگر اسے اپنے اردگرد والوں کا خوف زیادہ دیر یہ مزہ لینے نہ دیتا۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ یہ کوئی جادوئی الفاظ ہیں جنہوں نے اس کا دل سرمد کی طرف سے موم کر دیا ہے۔ مگر پھر اسے اپنی سوچ پر خود ہی یقین نہ آیا۔ اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو دور پھینک دیا۔ اگر یہ جادو ہوتا تو اب تک یہ آتنک وادی وہاں سے اڑنچھو ہو چکا ہوتا۔ اس کے ذہن میں اپنے دھرم کے حوالے سے جادو کا ایسا ہی تصور تھا۔

اس دن ٹارچر سیل کا فوٹو گرافر سرمد کی تصویریں ڈیویلپ کر کے لایا اور ایک لفافے میں بند کر کے کیپٹن آدیش

کے حوالے کر گیا۔ یہ تصویریں کرنل رائے کو پاس کرنا تھیں۔ پھر انہیں آرمی ہیڈ کوارٹر دہلی بھجوایا جاتا۔ تاکہ ان تصویروں کی خاص خاص مقامات پر تشہیر و ترسیل کے ذریعے سرمد کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتیں۔

کیپٹن آدیش نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں کل آٹھ تصاویر تھیں۔ چار میں تو اس ٹارچر سیل کی درندگی اور بربریت عروج پر تھی اور چار تصویریں ایسے اینگل سے لی گئی تھیں کہ سرمد کا چہرہ بڑھے ہوئے شیو کے باوجود پہچانا جاتا تھا۔ تشدد کے آثار ان میں کم سے کم نمایاں تھے۔

اس نے تصویریں لفافے میں ڈالیں اور فرش پر بیڑیوں میں جکڑے پڑے بیہوش سرمد کی جانب دیکھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بےخبر نجانے کس عالم میں سانس لے رہا تھا۔ ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے اور کیپٹن آدیش جانتا تھا کہ سرمد اب بھی انہی کیف آور الفاظ کا ورد کر رہا ہے جو اسے تبدیلی کی جانب کھینچے لئے جا رہے تھے۔

''پرسورام۔'' اس نے دروازے کے باہر کھڑے سگریٹ پیتے فوجی کو آواز دی۔

''یس سر۔'' وہ سگریٹ مسل کر باسکٹ میں پھینکتا ہوا اندر چلا آیا۔

''میں یہ تصویریں جنرل صاحب کو دینے جا رہا ہوں۔ ڈیوٹی آنکھیں کھول کر دینا۔'' کہہ کر وہ لفافہ ہاتھ میں لئے باہر چلا آیا۔

کرنل رائے کی کوٹھی کے رہائشی حصے کی جانب جاتے ہوئے اس کے من میں سرور لہریں لے رہا تھا۔ ریحا کو دیکھنے کا خیال ہی اس کے لئے مستی بھرا تھا۔ وہ جب سے ٹارچر سیل میں ڈیوٹی پر آیا تھا‘ تب سے ریحا کے عشق میں مبتلا تھا۔ چونکہ جانتا تھا کہ یہ انگور کھٹے ہیں اس لئے دل ہی دل میں ریحا کی پوجا کیا کرتا۔ اسے کسی کسی دن ایک نظر دیکھ لینا ہی اس کے لئے کافی تھا۔

اس وقت بھی جب وہ کرنل رائے کے آفس کی طرف جا رہا تھا‘ اس کی نظریں ریحا کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر وہ اسے دیکھ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ریحا باغیچے میں ایک درخت کے نیچے کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ سرخ میکسی پر نیلی شال اوڑھے وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی کہ روش سے گزرتے کیپٹن آدیش کے بھاری فوجی بوٹوں کی آہٹ سے بھی بےخبر رہی۔ وہ باغیچے کے باہر رک گیا۔ چند لمحے نظروں کی پیاس بجھاتا رہا۔ پھر بھی جب ریحا اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو مایوس ہو کر چل پڑا۔ اس کا ریحا کی طرف یوں مائل ہونا اگر کسی کے علم میں آ جاتا تو اس کے لئے مصیبت ہو جاتی۔ انکھیوں سے اپنے خیالوں میں گم ریحا کو دیکھتا اور یہ سوچتا ہوا وہ چلتا گیا کہ ریحا کس الجھن میں ہے جو اس کی مسکراہٹیں اور قہقہے کہیں گم ہو گئے۔ اس کے علم میں تھا کہ کچھ ہفتوں سے وہ ہر شام قریبی سیتا مندر دیا جلانے جاتی ہے اور باقی دلچسپیوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ خیالی گھوڑے دوڑاتا وہ کرنل رائے کے آفس تک پہنچ

گیا جہاں دروازے پر دائیں بائیں دو گن مین مستعد کھڑے تھے۔ اسے سیلوٹ کر کے انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

”کرنل صاحب آپ کے منتظر ہیں سر۔“ ایک گن مین نے کڑک دار آواز میں کہا‘ جبکہ دوسرا بت بنا کھڑا رہا۔ وہ سر ہلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

کرنل رائے نے تصویروں کا لفافہ لے کر اسے واپسی کی اجازت دے دی اور خود تصویریں نکال کر شیشے کی ٹاپ والی میز پر پھیلا کر انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ سگار اس وقت بھی اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ تصویریں چھ ضرب آٹھ کے سائز میں تھیں اور خاصی واضح تھیں۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھ کر انہیں دیکھتا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ کمرے کا وہ دروازہ کھلا جو اندرونی رہائشی حصے میں کھلتا تھا۔

”ارے ریحا بیٹی۔ آؤ آؤ۔“ ریحا کو اندر آتے دیکھ کر وہ مسکرا پڑا۔

”پاپا۔ میں مندر جا رہی ہوں۔“ ریحا نے کمرے میں قدم رکھا۔

”جلدی لوٹ آنا بیٹی۔ شام ہونے کو ہے۔ ویر سنگھ کو ساتھ لے جاؤ۔“ وہ سگار منہ سے نکال کر بولا۔

”نہیں پاپا۔ میں گاڑی میں جا رہی ہوں۔ کسی کو ساتھ لے جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ ریحا نے کہا۔ اس کی جانب دیکھا پھر مڑتے مڑتے اچانک اس کی نظر میز پر بکھری تصویروں پر پڑ گئی۔ ایک دم اس کے قدم تھم گئے۔ آہستہ سے گردن گھما کر اس نے دوبارہ تصویروں کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں میں خوف سا اترا اور دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ لپک کر میز کے قریب آ گئی۔

”کیا بات ہے بیٹی؟“ کرنل رائے نے چونک کر اس کی جانب دیکھا جو سرمد کی تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

”پاپا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کون ہے پاپا؟“ وہ بیتابی سے بولی۔

”ایک آتنک وادی ہے بیٹی۔“ کرنل رائے نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا اور اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ آتنک وادی۔۔۔ نہیں پاپا۔ آپ کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔“ ریحا کے لہجے میں چھپی بے قراری نے کرنل رائے کے کان کھڑے کر دیے۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو ریحا۔“ جنرل اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”کیا تم اسے جانتی ہو؟“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ ریحا ہکلا کر رہ گئی۔ پھر جیسے اس نے زبان کو گانٹھ دے لی۔ ”نہیں پاپا۔ میں اسے نہیں جانتی مگر اس کا چہرہ مہرہ آتنک وادیوں جیسا نہیں لگتا۔“

"نظریں نہ چراؤ ریحا۔" کرنل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آتنک وادیوں کے چہرے ہم تم جیسے ہی ہوتے ہیں' جن سے ہم فریب کھا جاتے ہیں مگر مجھے لگتا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

"میں۔۔۔ میں آپ سے کیا چھپاؤں گی پاپا۔" ریحا نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا' جن کا ہدف اب بھی سرمد کی ایک تصویر تھا۔ کرنل کا ہاتھ شانے سے ہٹانا چاہا۔ اس کا کانپتا ہوا لہجہ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا اور کرنل نے بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیے تھے جو اس کی بات پر یقین کر لیتا۔

"ریحا۔۔۔" کرنل نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر چہرہ اوپر اٹھایا اور جب اس نے کرنل سے نظر ملانے سے گریز کیا تو اسے اپنے شک پر یقین کے سائے لہراتے نظر آنے لگے۔ "مجھ سے نظر ملا کر بات کرو ریحا۔" کرنل کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"کیا بات کروں پاپا؟" ایک دم وہ سسک پڑی۔

"ریحا" بھک سے کرنل کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ آواز میں حیرت اور کپکپاہٹ ایک ساتھ ابھرے۔ پھر اس نے روتی ہوئی ریحا کو سینے سے لگا لیا۔ "کیا بات ہے میری جان۔ صاف صاف کہو۔ روؤ مت۔ تم جانتی ہو تمہارے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوں گے۔"

"پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔" ریحا بلک رہی تھی۔ "یہ وہی تو ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اسی کے لئے تو میں روز سیتا مندر میں دیا جلانے جاتی ہوں۔ پاپا۔ یہ آتنک وادی کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو کسی بچے کی طرح معصوم ہے پاپا۔"

ریحا کہتی رہی اور حیرت زدہ کرنل اس کی کمر پر ہاتھ رکھے سنتا رہا۔ اس کے دل و دماغ میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ اسے ریحا نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں ایم بی اے کے کورس کے دوران کسی لڑکے میں انٹرسٹڈ ہو گئی تھی اور جب تک اس کی طرف سے "ہاں نہ" کا صاف صاف اظہار نہ ہو جائے' اسے شادی کے فیصلے کے لئے وقت دیا جائے۔ تب کرنل اور اس کی پتنی سوجل نے اس معاملے کو مسئلہ نہ بنایا۔ بلکہ ریحا کو کچھ عرصے کے لئے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ وہ لڑکا کون ہے؟ یہ ریحا نے نہ بتایا۔ اور وہ کس مذہب سے ہے؟ اس بارے میں ان کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوا۔ ان کے وہم میں بھی نہ تھا کہ وہ لڑکا مسلمان ہوگا۔

کرنل کے سینے سے لگ کر ریحا نے کھل کر آنسو بہا لئے تو اس کا من ہلکا ہو گیا جبکہ کرنل رائے کے لئے سوچ اور الجھن کی کتنی ہی نئی راہیں کھل گئیں۔ بیٹی کے آنسو پونچھ کر اس نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے میز کے کونے پر ٹک گیا۔ پھر اسے سرمد کے بارے میں اب تک کی ساری معلومہ باتیں بتائیں۔ مگر ریحا کے چہرے پر اول تا

آخر بے اعتباری کے رنگ چھائے رہے۔

''اب تم بتاؤ بیٹی۔ میں تمہاری بات پر یقین کروں یا اس ساری صورتحال پر جس میں یہ لڑکا ہمارے ہاتھ لگا۔ ہاں۔۔۔ کیا نام بتایا تم نے اس کا؟'' اچانک کرنل رائے نے ریحا کی جانب انگلی اٹھائی۔

''ابھی تک تو میں نے اس کا نام نہیں بتایا۔'' ریحا جیسے باپ کی چال سمجھ گئی۔ ''اور معاف کیجئے گا پاپا۔ فی الحال میں آپ کو اس کا نام بتاؤں گی بھی نہیں۔''

''یہ کوئی مشکل نہیں ہے ریحا۔'' اچانک کرنل رائے کے اندر کا ہندو فوجی باہر آ گیا۔ ''میں چاہوں تو دس منٹ کے اندر اندر لندن یونیورسٹی سے اس لڑکے کے بارے میں مکمل معلومات منگوا سکتا ہوں مگر۔۔۔'' وہ رک گیا۔ ''میں چاہتا ہوں مجھے ایسا نہ کرنا پڑے۔''

ریحا کو ایک دم اپنی حماقت کا اب احساس ہوا کہ اس نے سرمد کے حوالے سے اپنے ہاتھ کاٹ کر باپ کے ہاتھ میں دے دیے ہیں۔

''تم نے میری پوزیشن بڑی نازک کر دی ہے ریحا۔'' جنرل اٹھا اور ہاتھ پشت پر باندھے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

''پاپا۔'' ریحا نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بھی ہو۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ آپ نے اپنے سیل میں اس کا جو حشر کیا ہے' میں اسے سہہ نہیں پا رہی ہوں۔''

''وہ اپنی جگہ ضروری تھا ریحا۔'' کرنل نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہمیں چھاؤنی نمبر سینتالیس پر اٹیک کے دوران ملا۔''

''ہو سکتا ہے آپ کی معلومات درست ہوں پاپا لیکن مجھے وہ چاہئے۔ زندہ سلامت اور بس۔۔۔'' ریحا کھڑی ہو گئی۔

''پاگل ہو گئی ہو تم۔'' کرنل رائے کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بھارت ماتا کا دشمن ہے اور۔۔۔''

''سب کچھ ہو سکتا ہے پاپا۔'' ریحا کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھری۔ ''کیا میں نہیں جانتی کہ آپ کے ٹارچر سیل میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ اگر کاکا ابراہیم کو پچیس لاکھ کے عوض جہادی تنظیم کے حوالے کیا جا سکتا ہے تو آپ کی بیٹی کی پسند اسے کیوں نہیں مل سکتی؟''

''آہستہ بولو۔۔۔ آہستہ۔'' کرنل رائے نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آواز میں

خوف سمٹا ہوا تھا۔ ”تم یہ سب جانتی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم شور مچا دینے کی دھمکی دے کر مجھے بلیک میل کرو۔“

”دھمکی۔۔۔“ ریحا نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”یہ دھمکی نہیں ہے پاپا۔ سودا ہے۔ میرے اور آپ کے بیچ۔ میں اپنی پسند حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ کسی حد تک بھی جا سکتی ہوں۔ اگر آپ ایک اچھے پاپا بنے رہے تو میں دنیا کی سب سے لاڈلی بیٹی ہوں اور اگر آپ کا سوتیلا پن جاگا تو میں اپنی ماما کی بیٹی بننے پر مجبور ہو جاؤں گی۔“

کرنل رائے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ بات جسے وہ وقت کی تہہ میں دفن کر چکا تھا' ریحا نے ایک ہی ٹھوکر سے اسے ماضی کی قبر سے باہر نکال لیا تھا۔ ریحا اس کی پتنی سوجل کے پہلے پتی راکیش سے تھی جس کے مرنے کے بعد کرنل رائے نے سوجل سے شادی کر لی تھی۔ سوجل کو آج بھی شبہ تھا کہ اس کے پتی راکیش کو کرنل رائے نے قتل کروایا تھا مگر ثبوت نہ ہونے کے باعث وہ خاموشی سے دن گزار رہی تھی۔ اگر اس سکینڈل کو اچھال دیا جاتا تو کرنل رائے کہاں ہوتا' اسی کی طرف اشارہ کر کے ریحا نے اسے خوف کی دلدل میں پھینک دیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ خالی خالی نظروں سے اس دروازے کو تکتا رہا جس سے نکل کر ریحا جا چکی تھی۔ پھر اس کی نظریں میز پر بکھری سرمد کی تصویروں پر جا پڑیں۔ اسے ہوش سا آ گیا۔ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے تصویریں سمیٹیں۔ لفافے میں ڈالیں اور لفافہ میز کے خفیہ خانے میں سرکا دیا۔

☆

”مس ریحا۔“ مندر میں پرارتھنا کر کے نکلی' سوچوں کے بھنور میں چکراتے دماغ کے ساتھ ریحا اپنی گاڑی کی طرف چلی کہ ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو مندر کے سامنے چھوٹے سے پارک کے گیٹ پر سرخ کار کے پاس کھڑی ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہ ریحا کے لئے بالکل اجنبی تھی' اس لئے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھنا ایک قدرتی امر تھا۔

”میں نے آپ ہی کو پکارا ہے مس ریحا۔“ وہ اس کی طرف چل پڑی۔

ریحا نے ادھر ادھر دیکھا۔ نزدیک یا دور کوئی ایسی سرگرمی نہ دکھائی دی جس سے وہ شبے میں مبتلا ہوتی' اس لئے وہ اپنی گاڑی کے پاس رکی رہی۔ لڑکی اس کے قریب پہنچی۔ وہ بڑی قیمتی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ کندھوں پر زرتار کشمیری شال اس کے سٹیٹس کا اعلان کر رہی تھی۔

”میرا نام مانیا ہے۔ مانیا سکسینہ۔ میں دہلی سے آئی ہوں آپ سے ملنے۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”مجھ سے ملنے؟“ ریحا اور حیران ہوئی تاہم اس نے مانیا کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

”جی ہاں۔ ایک مہمان بھی ہے میرے ساتھ۔“ اس نے پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا جس کے کھلے شیشوں سے لگتا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ایک لمحے کو اسے خطرے کا احساس ہوا۔

”گھبرایئے نہیں مس ریحا۔ اور کسی غلط سوچ کو بھی ذہن میں جگہ مت دیجئے۔“ مانیا نے اترتی شام کے سائے میں اس کے چہرے پر ابھرتے شکوک کو بھانپ لیا۔ ”اگر آپ چند منٹ ہمارے لئے نکال سکیں تو ہم دوستانہ ماحول میں بات کرنا چاہیں گے۔“

”آپ لوگ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتے ہیں؟“ ریحا کا ذہن ابھی اس کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔

”آیئے۔ پارک میں بیٹھتے ہیں۔“ مانیا نے اس کا ہاتھ بڑی نرمی سے کھینچا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔ پارک میں داخل ہوتے ہوئے ریحا نے دیکھا کہ گاڑی کے دروازے کھلے اور اس میں سے ایک بڑا وجیہہ مرد نکل کر ان کے پیچھے پارک کی طرف چل پڑا۔ اس کا جی چاہا فوراً پلٹ کر دوڑ لگا دے مگر مانیا نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا اور اسے لئے ہوئے پارک میں ایک درخت کے نیچے بچھے ایک ایسے لمبے بنچ پر جا بیٹھی جو پارک میں موجود دوسرے لوگوں سے کافی ہٹ کر تھا۔ ان کے بیٹھنے کے چند لمحوں بعد ہی وہ مرد بھی ان تک آن پہنچا۔

”گڈ ایوننگ ینگ لیڈی۔“ مرد نے بڑے تہذیب یافتہ لہجے میں کہا اور بنچ پر مانیا سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ پارک کی مدھم لائٹس میں ریحا کو ان دونوں کے چہروں اور حرکات کا جائزہ لینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور اس کے دل نے اسے یقین دلایا کہ وہ برے لوگ نہیں ہیں۔ ان کے نرم شرافت میں گندھے ہوئے چہرے کسی لحاظ سے اسے فریبی نہ لگے۔

”جی۔ کہئے۔ آپ لوگ مجھے کیسے جانتے ہیں اور مجھے کیوں روکا؟“ ریحا نے ان تینوں کے چہروں پر ایک بار پھر نظر دوڑائی۔

”ہم آپ کو کیسے جانتے ہیں‘ اسے فی الحال رہنے دیجئے مس ریحا۔“ مانیا نے نرمی سے کہا۔ ”آپ کے لئے اتنا جان لینا لازم ہے کہ میں دہلی سے اور مسٹر طاہر پاکستان سے ایک شخص کے سلسلے میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔ آج شام جب آپ اپنے گھر سے نکلیں تو ہم آپ کے پیچھے پیچھے سیتا مندر تک آئے۔ آپ پوجا کر کے باہر نکلیں تب میں نے آپ کو آواز دی۔“

ریحا کا دل سینے میں زور سے دھڑکا۔ اس نے مانیا کے خاموش ہوتے ہی طاہر کی جانب بیتابی سے دیکھا۔

”کس کے سلسلے میں ملنے آئے ہیں آپ مجھ سے؟“ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ چھلک رہی تھی۔

”مس ریحا۔“ طاہر نے ذرا آگے جھک کر اس کی نظروں کا احاطہ کر لیا۔ ”لندن یونیورسٹی میں ایک لڑکا آپ

کے ساتھ پڑھتا تھا۔ سرمد۔۔۔“

اور ریحا کا خوف چہرے پر ابل پڑا۔ وہی ہوا جو اس کے دل میں تھا۔ طاہر کے نام نے اسے وہ سب یاد دلا دیا جو سرمد نے اپنی داستان غم سناتے ہوئے اس پر ظاہر کیا تھا۔ ایک نام اور تھا صفیہ۔ اس کا جی چاہا کاش وہ بھی ان کے ساتھ ہوتی۔ وہ بھی اس بہار کا دیدار کر لیتی جس نے سرمد کو خزاں کر دیا تھا مگر اس کی جگہ امبر کا نام سن کر وہ مایوس سی ہو گئی۔ اس کی ایک دم دگرگوں ہوتی کیفیت نے ان دونوں کو ہوشیار کر دیا۔

”سرمد۔۔۔“ سرسراتے لہجے میں ریحا نے کہا اور ڈری ڈری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں مس ریحا۔“ طاہر نے پہلے جیسی نرمی ہی سے کہا۔ ”سرمد۔ جس کے ڈاکومنٹس آپ نے لندن سے اس کے پتے پر پاکستان پارسل کئے تھے۔ وہ عمرے کے بعد انڈیا آیا اور غائب ہو گیا۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ہم یہ سوچ کر آپ کے پاس آئے ہیں کہ یقیناً آپ اس کے بارے میں کچھ ایسا بتا سکیں گی جو ہمیں اس تک رسائی دلا سکے۔“

ریحا آنکھیں بند کئے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ ان سب کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ ریحا سرمد کے بارے میں جانتی تھی۔ انہیں بتا سکتی تھی مگر کیا؟ اس سوالیہ نشان کے پنجے ان کے دل و دماغ میں پوری شدت کے ساتھ اترتے جا رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی کے گھاٹ اتر گئے۔ امید و بیم نے انہیں جکڑے رکھا۔ آخر مانیا نے آہستگی سے ریحا کا ہاتھ تھام کر اسے خود فراموشی کی کیفیت سے باہر نکالا۔

”مس ریحا۔“ ہولے سے اس نے کہا تو ریحا نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔ خشک ہونٹوں کو زبان پھیر کر تر کیا۔

”کیا جاننا چاہتے ہیں آپ لوگ سرمد کے بارے میں؟“ اس کی آواز جیسے کسی کھائی سے ابھری۔

”سب کچھ۔۔۔ وہ سب کچھ جو آپ اس کے بارے میں جانتی ہیں۔“

”مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آپ لوگ سرمد کے دوست ہیں۔“ وہ انہیں نظروں میں تولتے ہوئے بولی۔

جواب میں مانیا نے طاہر کا پاسپورٹ اسے تھما دیا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ ایک حد تک اسے اطمینان ہو گیا۔ پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے مانیا کی طرف دیکھا۔ مانیا اس کا مطلب سمجھ گئی اور پرس سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیا۔ ریحا نے اس کا جائزہ لیا اور خاصی حد تک مطمئن نظر آنے لگی۔

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں آپ کے ساتھ سرمد کا کیا رشتہ ہے؟“ اس نے طاہر سے پوچھا جو خیالوں کے غبار

میں گھرا بڑی باریک بینی سے ریحا کی پوچھ گچھ کو جانچ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ سرمد کے بارے میں اس قدر محتاط کیوں ہو رہی ہے۔

''جی مس ریحا۔'' طاہر نے ناپ تول کر الفاظ کا انتخاب کیا۔ ''میں اس کا کزن ہوں۔''

''ہوں۔۔۔'' ریحا ایک بار پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ لگتا تھا وہ زبان کھولنے سے پہلے ان کی باتوں کا جائزہ لے رہی ہے۔ ان پر اعتماد کرنے یا نہ کرنے کی کیفیت سے دوچار ہے۔ آخر ان کا صبر رنگ لایا اور ریحا نے فیصلہ کر لیا۔

''میں جو کہنے جا رہی ہوں، اسے بڑے حوصلے اور دھیان سے سنئے گا۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور طاہر کی جانب دیکھا۔ ''آپ یہ تو جان ہی چکے ہیں کہ میں کرنل رائے کی اکلوتی بیٹی ہوں۔''

''جی جی۔'' طاہر اس کے رکنے پر بے چین سا ہو گیا۔ ''رکئے مت مس ریحا۔''

''لندن میں میری سرمد سے آخری ملاقات ہوئی تو میں نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جواب میں اس نے مجھے جو کہانی سنائی، اس نے اس کے دُکھ اور زندگی سے گریز کا پردہ فاش کیا۔'' آہستہ سے اس نے طاہر کی جانب نظر اٹھائی، جو اسے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے نے ریحا کے دل میں رشک سا جگا دیا۔ اس نے صفیہ کا نام لینے سے پرہیز کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کسی لڑکی کے عشق میں دنیا سے کٹ گیا تھا۔ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی تھی مگر اس نے میری حوصلہ افزائی کی نہ کوئی وعدہ کیا۔ میں نے اپنے طور پر اس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے اپنے اس عزم سے آگاہ کر کے انڈیا چلی آئی۔'' وہ رکی تو طاہر نے رومال سے ماتھا خشک کیا۔ اس کی نظروں میں ریحا کے لئے تشکر کے جذبات تھے۔ ریحا نے اس بات کو محسوس کیا اور پھر کہنا شروع کیا۔

''کچھ عرصے بعد اس نے سعودیہ سے مجھے کال کی کہ میں لندن جا کر اس کے ڈاکومنٹس پاکستان اس کے پاپا کے پتے پر ارسال کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور واپس آ کر اس کے انتظار کا جھولا جھولنے لگی۔ مجھے نجانے کیوں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میرے سرمد سے ملاقات ضرور ہو گی۔ سیتا ماں مجھے اور اسے ضرور ملا دے گی۔ میں روزانہ اس کے نام کا دیپ جلانے اس مندر میں آتی ہوں۔''

وہ خاموش ہو گئی۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے بعد آپ کو اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی؟'' مایوسی سے طاہر نے پوچھا۔

''یہ میں نے کب کہا؟'' وہ اضطراب سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

’’تو پھر۔۔۔؟‘‘ مانیا نے طاہر کے ہونٹوں کے الفاظ چھین لیے۔

’’آج شام۔۔۔ یہاں آنے سے پہلے۔۔۔ مجھے اس کے بارے میں خبر ملی۔‘‘ اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ رک رک کے الفاظ بھیگتے چلے گئے۔ ’’وہ۔۔۔وہ۔۔۔‘‘ اس نے بے چینی کے عالم میں اپنے ہاتھ رانوں تلے دبا لئے اور سر جھکا کر بلک پڑی۔ ’’وہ میرے پاپا کے ٹارچر سیل میں قید ہے۔‘‘

’’کیا۔۔۔؟‘‘ طاہر اور مانیا اگر اچھل نہ پڑتے تو حیرانی کو خود پر حیرت ہوتی۔ ’’یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ مس ریحا؟‘‘ طاہر بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

’میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مسٹر طاہر۔‘‘ وہ روئے جا رہی تھی۔ ’’میرا سرمد ایک آتنک وادی کے روپ میں میرے پاپا کے ہاتھ لگا اور اب وہ اسے ٹارچر کر رہے ہیں۔‘‘ آنسوؤں میں بھیگی آواز میں ریحا نے انہیں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس ساری بات سے آگاہ کیا جو کرنل رائے سے اس تک پہنچی تھی۔

’’یہ کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘ طاہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ’’وہ دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ایک بچے کی طرح معصوم ہے۔‘‘

’’مگر پاپا اسے نہیں مانتے۔‘‘ مانیا کی باہوں میں پڑی ریحا ہچکیاں لے رہی تھی۔

’’یہاں مجاہدوں کو دہشت گرد ہی کہا جاتا ہے۔‘‘ مانیا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’میں سمجھتا ہوں مس مانیا مگر سرمد کسی جہادی تحریک میں شامل ہوا تو کیسے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ تو اس راہ کا مسافر ہی نہیں تھا۔‘‘ طاہر بے بسی سے بولا۔

شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ مانیا نے ریحا کو بڑی مشکل سے نارمل کیا۔ وہ اس کی حالت سے خاصی متاثر لگ رہی تھی۔

’’مس ریحا۔‘‘ اچانک طاہر اس کے قریب آ کر رکا اور گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔ ’’یہ ٹارچر سیل کہاں ہے؟‘‘

’’ہماری رہائش گاہ میں انیکسی کے بالکل ساتھ بیسمنٹ میں۔‘‘ ریحا نے آہستہ سے جواب دیا۔

’’آپ سرمد کو وہاں سے نکالنے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہیں؟‘‘

’’جان دے سکتی ہوں۔‘‘ اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ ’’آج سے پہلے میں بھی نہیں جانتی تھی کہ میں سرمد کو اس شدت سے چاہنے لگی ہوں مگر اب لگتا ہے اس کے بغیر سانس لینا مشکل ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے ہمیں اس ملاقات کو یہیں روک دینا چاہئے۔ مسٹر طاہر اٹھ جایئے۔ لوگوں کی نظریں آپ پر

مرکوز ہیں۔‘‘

طاہر کو اپنی حالت کا احساس ہوا تو وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ ’’سوری مس مانیا۔‘‘ ہولے سے اس نے کہا۔

’’اٹس او کے۔ میں سمجھ رہی ہوں۔‘‘ مانیا نے اس کی جانب دیکھا۔ ’’میرا مشورہ یہ ہے کہ کل صبح مس ریحا سے میٹنگ رکھی جائے۔ اس وقت لائحہ عمل طے کیا جائے کہ ہم اس سلسلے میں کیا اور کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ وقت ایسی تفصیل کے لئے مناسب ہے نہ کافی۔‘‘

اس کی بات درست تھی۔ ریحا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مانیا کے دیے ہوئے ٹشو پیپر سے آنکھیں اور رخسار خشک کئے۔ پھر طاہر کی جانب دیکھا۔

’’آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟‘‘

’’ہوٹل کشمیر پوائنٹ میں۔ روم نمبر دو سو ایک اور دو سو دو۔‘‘ طاہر نے بتایا۔

’’میں کل صبح نو بجے آپ کے پاس ہوں گی۔ رات بھر میں مزید جو بھی معلوم ہو سکا' میں اس کے لئے پوری کوشش کروں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ طاہر نے اس سے اتفاق کیا۔ ’’وقت کا خیال رکھئے گا مس ریحا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ یہ رات ہم پر کیسی بھاری گزرے گی۔‘‘

’’بتانے کی ضرورت نہیں مسٹر طاہر۔‘‘ وہ اسے اداسی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’میں سانسوں میں کانٹوں کی چبھن سے آشنا ہو چکی ہوں۔‘‘

’’تو یہ طے رہا کہ کل صبح نو بجے ہوٹل میں مس ریحا ہم سے آن ملیں گی۔‘‘ مانیا جیسے اب وہاں سے رخصت ہو جانا چاہتی تھی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔

’’ہاں مس ریحا۔ جنرل صاحب کے سیل میں ایک شخص ہے کیپٹن آدیش۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ وہ چونکی۔ ’’آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟‘‘

’’وہ میرا کزن ہے۔ اسی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ آپ اسے میرا ایک میسج دے سکیں گی؟‘‘

’’ضرور۔ مگر کیا اس پر بھروسہ کرنا مناسب ہوگا مس مانیا؟‘‘ ریحا نے پوچھا۔

’’یہی تو مجھے جاننا ہے۔‘‘ مانیا نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ’’اور اس سے ملے بغیر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی۔ آپ اسے کہئے گا مجھے آج رات ہوٹل میں آ کر ملے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ میں اسے آپ کا میسج دے دوں گی۔‘‘ ریحا نے دھیرے سے کہا۔ ’’ویسے وہ آدمی اتنا برا نہیں

ہے۔ مجھ سے اس کا دو چار بار سابقہ پڑ چکا ہے۔"

"تو آپ اسے میرا پیغام ضرور دیجئے گا۔ باقی جو بھگوان کرے۔" مانیا نے کہا اور وہ سب پارک سے باہر جانے کے لئے چل پڑے۔

☆

کرنل رائے کسی زخمی درندے کی طرح فرش کی سینہ کوبی کر رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں آتش فشاں دہک رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے ریحا کی باتیں یاد آتیں اور وہ اس سوکھی لکڑی کی طرح چیخ اٹھتا جسے آگ کے الاؤ میں پھینک دیا جائے۔

اسے کوئی ایسا راستہ نہ سجھ آ رہا تھا کہ وہ ریحا کی بلیک میلنگ سے بچ سکے۔ اگر ایک بار وہ اس کی بات مان لیتا تو پھر بار بار اس کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے اسے کون بچاتا؟ وہ جب چاہتی اس کی شہ رگ پر انگوٹھا رکھ کر اپنی منوا لیتی اور یہ بات اسے کسی حال میں بھی منظور نہ تھی۔ ایک تو وہ اونچے عہدے کا فوجی تھا اوپر سے ہندو۔ منصب اور خباثت نے مل کر اس کی شخصیت میں جو حرامی پن انڈیل دیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ ریحا کو ایسا سبق سکھائے کہ آئندہ کے لئے وہ اس کے سامنے دم نہ مار سکے۔ اور اس کے لئے وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتا تھا کیونکہ ریحا کون سی اس کی سگی بیٹی تھی؟ بلکہ اب تو وہ اسے اپنے رقیب کی نشانی ہونے کے ناطے دشمن لگنے لگی تھی۔ اگر سوجل اور ریحا مل کر اس کے خلاف محاذ کھڑا کر لیتیں تو اس کی عزت بھی خاک میں مل جاتی اور کورٹ مارشل کی تلوار الگ سر پر لٹکنے لگتی۔ اس نے راکیش کا کیس اپنے اثر و رسوخ سے دبا دیا تھا' ورنہ اگر کوئی ذرا سی بھی کوشش کرتا تو اس کے لئے اس کیس کا مصیبت بن جانا کوئی مشکل نہ تھا۔

آٹھ بجے تو اس کے قدم رک گئے۔ ٹارچ سیل میں سٹاف کی تبدیلی کا یہی وقت تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انٹر کام کا بٹن دبایا۔

"یس سر۔" دوسری جانب سے کیپٹن آدیش الرٹ آواز میں بولا۔

"آدیش۔ ڈیوٹی آف کر کے مجھ سے مل کر جانا۔"

"یس سر۔" آدیش نے ادب سے جواب دیا۔

اس نے انٹر کام سے رابطہ ختم کر دیا۔ بجھے ہوئے سگار کو سلگایا اور پھر ٹہلنے لگا۔ اسی وقت ریحا نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ چونک کر رکا اور اس کی جانب بڑی سرد نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"لگتا ہے پاپا۔ آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔" وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”کیا خوش ہونا چاہئے مجھے؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔“ ریحا اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ ”میری صبح کی باتیں واقعی آپ کو خفا کرنے والی تھیں مگر پاپا۔ مجھے اب تک آپ نے جس انداز میں پالا ہے۔ میرے جتنے لاڈ دیکھے ہیں۔ کیا ان کا اثر یہ نہیں ہونا چاہئے کہ میں اپنی بات منوانے کے لئے بدتمیز ہو جاؤں؟“

”ریحا۔“ کرنل رائے نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا۔ ”میری بچی۔ تم نہیں جانتیں تم نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میرا آرام حرام ہوگیا ہے۔ نیند اڑ گئی ہے۔ چین کی بانسری بجانے والا کرنل رائے کیا اس وقت بیچارہ نہیں لگتا تمہیں؟“

”پاپا۔“ ریحا اس کے سینے سے لگے لگے بولی۔ ”ایسی فرمائش تو نہیں کر دی میں نے کہ آپ پوری نہ کر سکیں۔“

”یہ تو تم کہتی ہو ناں بیٹی۔“ اس نے ریحا کو الگ کیا اور میز کے کونے پر ٹک گیا۔ ”مگر میرے لئے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔“

”آسان نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے مشکل ہے، ناممکن نہیں۔ ہے ناں پاپا؟“ وہ اس کی جانب شوخی سے دیکھ کر بولی۔

”لفظوں سے کھیلنا آ گیا ہے تمہیں۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

”تو پھر میں کیا سمجھوں پاپا؟“ وہ مرضی کا جواب سننے کے لئے بیتاب تھی۔

”مجھے تھوڑا وقت دو ریحا۔“ جنرل نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”ایک تو وہ آتنک وادی ہے دوسرے مسلمان۔ تیسرے اسے جنرل نائر نے میری طرف ریفر کیا ہے جو بال کی کھال نکالنے میں مشہور ہے۔“

”کچھ بھی ہو پاپا۔ اب اسے ٹارچر نہیں کیا جانا چاہئے۔“ ریحا نے ضد سے کہا۔

”اس کے لئے تو میں منع کر چکا ہوں مگر مجھے اس الجھن کو سلجھانے کے لئے دم لینے کی فرصت تو دو بیٹی۔“

”ٹھیک ہے پاپا۔ مگر فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہئے۔“ وہ خوش ہوگئی۔

”اگر ایسا نہ کرنا ہوتا تو میں تم سے مہلت کیوں مانگتا پگلی۔ کوئی راستہ نکالنے کے لئے ہی تو وقت چاہتا ہوں۔“

”پاپا۔“ اچانک اس نے نظر جھکا کر کہا اور خاموش ہوگئی۔ کرنل رائے نے اس کی جانب دیکھا۔ جان لیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

”کہو ریحا۔ کیا کہنا چاہتی ہو بیٹی؟“ کرنل نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

”پاپا۔ کیا میں ۔ ۔ ۔ کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ کرنل رائے کے لہجے میں درشتی اتر آئی۔

”پاپا۔ میں اسے دور سے دیکھ۔ ۔ ۔“ تڑپ کر ریحا نے کہنا چاہا۔

”میں اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتا ریحا۔“ کرنل نے سختی اور بڑے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا سکینڈل کھڑا ہو جو میری ساکھ اور میرے خاندان کے لئے تباہی کا باعث بنے۔ یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں ہے۔ میں نے کہا ناں کہ میں جلد ہی کچھ کرتا ہوں۔ تب تک تم اپنے آپ پر قابو رکھو اور ایک بات ذہن میں بٹھا لو۔ تمہیں اس سے ملنے کی اجازت میں کسی صورت نہیں دے سکتا اس کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ تم اسے دیکھ کر خود پر کنٹرول نہ رکھ سکو گی اور بات جس کے علم میں نہیں ہے وہ بھی جان جائے گا۔ تب تم اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گی۔ ۔ ۔“

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور ایک آواز ابھری۔

”مے آئی کم ان سر؟“

”یس آدیش۔ کم ان۔“ جنرل نے جواب دیا اور ریحا کو جانے کا اشارہ کیا۔ ریحا نے بڑی اداس نظروں سے اسے دیکھا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ آدیش نے کمرے میں داخل ہو کر کرنل رائے کو سیلوٹ کیا۔

”بیٹھو کیپٹن۔“ جنرل نے اسے اپنے سامنے والی کرسی آفر کی اور دونوں بیٹھ گئے تو جنرل تھوڑا سا اس کی جانب جھکا۔ ”کیا حال ہے اس آتنک وادی کا؟ اس نے زبان کھولی یا نہیں؟“

”نو سر۔“ کیپٹن آدیش نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب تو اس کی حالت بہت خراب ہے۔“

”اسی لئے میں نے تمہیں اس پر مزید ٹارچر سے منع کر دیا تھا۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ اس کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کیا جائے۔“

کیپٹن آدیش نے اس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”اور ہاں۔ تم نے اسے نہلا دھلا کر کپڑے چینج کرائے یا نہیں؟“ بڑی نرمی سے کرنل رائے نے پوچھا۔

”یس سر۔ اس کی شیو کرا دی گئی ہے۔ کپڑے چینج کرا دیے گئے ہیں۔ البتہ نہلایا نہیں گیا۔“ آدیش نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ کرنل کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”زخموں پر پانی پڑنے سے خرابی کا اندیشہ ہے سر۔“

”اوہ۔“ مطمئن انداز میں کرنل نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب ایک خاص بات دھیان سے سن لو۔“

”وہ کیا سر؟“ آدیش الرٹ ہو گیا۔

”کل رات ٹارچر سیل میں صرف تمہاری ڈیوٹی ہو گی۔ باقی سب کو چھٹی دے دینا۔ میں اب یہ قصہ ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ لگتا ہے یہ لڑکا آتنک وادی نہیں ہے۔ جنرل نائر کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دھیان رہے کہ کل وہاں جو کچھ ہو گا وہ میرے اور تمہارے درمیان رہے گا اور تمہاری اس رازداری کی قدر کی جائے گی۔“

کیپٹن آدیش نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے۔ اسے کرنل رائے کے الفاظ پر حیرت ہوئی تھی مگر جب اس کی نظریں کرنل سے ملیں تو نجانے اسے وہاں کیا دکھائی دیا کہ وہ محض ”یس سر“ کہہ کر رہ گیا۔

”بس۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ کرنل نے کہا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”سر۔ میں دو گھنٹے کے لئے شہر جانا چاہتا ہوں۔“

”تو جاؤ بھئی۔ منع کس نے کیا ہے۔“ کرنل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ویسے تمہیں اب شادی کر لینی چاہئے۔ روز روز شہر جا کر بازاری دودھ پینے سے بہتر ہے گھر پر بھینس باندھ لو۔“

”سر۔۔۔“ کیپٹن آدیش جھینپ گیا۔

”اوکے اوکے۔ جاؤ۔ عیش کرو۔“ کرنل رائے نے ہنس کر کہا اور کیپٹن آدیش سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

کرنل رائے نے کنکھیوں سے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا، جس کے باہر بائیں طرف دیوار سے لگی کھڑی ریحان کی باتیں سن رہی تھی۔

☆

سرمد پر پچھلے کچھ گھنٹوں سے تشدد روک دیا گیا تھا۔

اسے حیرت ہوئی۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید وہ لوگ اسے کچھ وقت دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کا جسم دوبارہ ٹارچر برداشت کرنے کے قابل ہو جائے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ اس نے دل میں سوچا اور فرش پر پڑے پڑے گھسٹ کر دیوار کے قریب ہو گیا۔ پھر بڑی مشکل سے سیدھا ہو کر دیوار سے ٹیک لگائی اور نیم دراز ہونے کی کوشش میں ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ اس کا رواں رواں درد سے کانپ رہا تھا۔ اس نے سر دیوار سے ٹکا دیا اور سوچوں میں گم ہو گیا۔

اب تک اس نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور اس کا امکان بھی نہیں تھا کہ اس کے لبوں سے ''عشاق'' کے بارے میں کچھ نکل جاتا۔ حمزہ کی شہادت تو اسے یاد تھی۔ داؤد اور حسین کا کیا بنا؟ اس کا خیال آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی شہادت کا جام پی چکے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس کے ساتھ یہیں ہوتے۔ تاہم اس بات کا امکان بھی تھا کہ انہیں کسی اور جگہ رکھا گیا ہو۔

سوچ کا دھارا بہنا شروع ہوا تو کمانڈر کی شبیہ ذہن کے پردے پر ابھری۔ خانم کا چہرہ یاد آیا اور اپنے عہد کے الفاظ صدا بن کر کانوں میں گونجے:

''میں اپنے معبودِ واحد اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اپنے سارے جذبے آج سے اللہ اور اپنے آقا و مولا ﷺ کے نام کرتا ہوں۔ اب میرا جینا اللہ کے لئے اور مرنا اللہ کے لئے ہے۔

اب میری زندگی جہاد اور موت شہادت کی امانت ہے۔ میری سانسوں پر وحدانیت اور رسالت ﷺ کے سوا کسی کا حق نہیں۔

''عشاق'' کا نام میرے سینے میں دھڑکن کی طرح محفوظ رہے گا۔ میری زبان پر کبھی اس کے حوالے سے کوئی ایسا لفظ نہیں آئے گا جو دشمنوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔

اب میری ایک ہی شناخت اور زادِ راہ ہے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمد الرسول اللہ ﷺ۔''

سوچ کا سورج یہاں تک چمکا تو اجالے کی لپک سے اس کی آنکھوں میں نمی سی چھا گئی۔ اسے بے طرح اپنے

والد ڈاکٹر ہاشمی یاد آ گئے۔ وہ ان سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ بہت جلد پاکستان چلا آئے گا مگر۔۔۔ باپ کی محبت' والہانہ پن' پیار' سب کے سب خیال اس کے آنسوؤں میں ڈھلتے چلے گئے۔ وہ اسے تلاش کرنے کے لئے کہاں کہاں نہ پہنچے ہوں گے؟ کیا کیا جتن نہ کئے ہوں گے؟ اور یہ سب کس کے سبب ہوا؟ اس کے سارے جسم میں پھیلی درد کی اذیت' ایک لذت میں سمٹ گئی۔ ایک چہرہ۔ ایک خوبصورت چہرہ۔ جس پر کشش کی قوس قزح نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جو اس کے لئے آج بھی اتنا ہی محترم تھا جتنا پہلے دن۔ اسے لگا' ساری تکلیف' سارا دُکھ ایک مستی میں بدل گیا ہے۔ وہ ایک سرور کے دامن میں جا پڑا۔ ایک کیف کے سینے سے جا لگا۔ اس نے بے اختیار پلکیں موند لیں۔ وہ اس کیفیت کو دل میں اتار لینا چاہتا تھا۔ جذب کر لینا چاہتا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ کیا ہوا؟ اشکوں کے موتی رخساروں پر ٹوٹ بہے۔ پلکوں کا در بند ہوا اور سکون کا منبع سامنے آ گیا۔ شادابی نے اس پر سایہ کر دیا۔ اس کا اندر ایک دم سرسبز ہو گیا۔ اس کے آقا و مولا ﷺ کا مسکن۔ اس کے ربِ واحد و اکبر کی رحمتوں اور محبتوں کا محور و مرکز۔ گنبدِ خضریٰ۔۔۔ اس کی بصارت سے ہوتا ہوا بصیرت کی چوٹی پر جھلملانے لگا۔ عشق مجازی نے عشق حقیقی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ جو خود اپنے حبیب ﷺ پر ہر دم درود و سلام بھیجتا ہے' اس کا حکم ہے کہ اس کے بندے بھی اپنے آقا ﷺ پر درود و سلام بھیجیں۔ بے اختیار اس کے لبوں پر اپنے معبود کی سنت جاری ہو گئی:

"صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

ٹارچر سیل میں پھیلا اندھیرا دمک اٹھا۔ لو دے اٹھا۔ خوشبوؤں کے جھونکے یوں کمرے میں چکرانے لگے جیسے اس ورد کو پلکوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہوں۔ جیسے انہیں اس مقدس امانت کو سنبھال رکھنے کے لئے کوئی پاکیزہ تر جگہ نہ مل رہی ہو۔ پھر ان پر ادراک کا در کھلا اور خوشبو ہلکورے لیتی ہوئی سرمد کے رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔ اسے لوریاں دیتی مہک کے لئے سرمد کے دل سے زیادہ متبرک جگہ اور کون سی ہوتی جہاں وہ اس ورد کو چوم کر دھڑکنوں کے سپرد کر دیتی۔

کیپٹن آدیش ڈیوٹی ختم کر کے کرنل رائے کے بلاوے پر اس کے آفس میں جا رہا تھا کہ رک گیا۔ ایک عجیب سی مہک کے احساس سے اس کے قدم کاریڈور میں رک گئے۔ ذرا غور کرنے کے بعد وہ سرمد والے کمرے میں چلا آیا۔ اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ وہ خوشبو سے لبالب ہو گیا۔ حیرت زدہ نظروں سے وہ دیوار سے ٹیک لگائے' پلکیں موندے نیم دراز سرمد کی جانب تکے جا رہا تھا۔ پھر وہ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ جھکا اور کان سرمد کے ہونٹوں کے قریب کر دیا جس کے ہونٹوں پر وہی ورد تھا' جو کیپٹن آدیش کے جسم میں کرنٹ دوڑا دیتا تھا۔ مگر یہ خوشبو۔ یہ مہک۔ یہ نئی چیز تھی جس نے اس کے حواس پر نشہ سا طاری کر دیا۔ اس کے لئے سرمد کے آنسوؤں سے تر چہرے پر نگاہ جمانا مشکل ہو

گیا۔ اس کا دل سینے میں کسی زخمی پنچھی کی طرح پھڑکا تو گھبرا کر وہ الٹے پاؤں کمرے سے نکلا اور دروازہ بند کر دیا۔ شیشے کی دیوار کے پار سرمد اب بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ چند لمحے وہ اسے دیکھتا رہا پھر خاموشی سے چل پڑا۔ اس کا دل قابو میں نہ تھا۔ سارا جسم لرز رہا تھا اور پاؤں کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔

کاریڈور کے موڑ پر رک کر اس نے ایک بار پھر گردن گھما کر سرمد کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی اور خوشبو تھی کہ اب بھی کیپٹن آدیش کے سر پر چکرا رہی تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں سیل سے نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی سرشاری کی اس کیفیت نے دم سادھ لیا۔ خودکار دروازے کے بند ہونے پر وہ چند لمحے کھڑا رہ کر لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پھر کرنل رائے کے آفس کی جانب چل پڑا۔ اب اس کے ذہن میں تقریباً ایک گھنٹہ قبل ریحا کے فون پر کہے ہوئے الفاظ چکرا رہے تھے:

”کیپٹن۔ ہوٹل کشمیر پوائنٹ کے کمرہ نمبر دو سو ایک میں تمہاری کزن مس مانیا تم سے آج ہی رات ملنا چاہتی ہیں۔“

☆

”آدیش۔۔۔“ مانیا نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ دونوں گلے ملے۔ پھر وہ اسے لئے ہوئے صوفے پر آ بیٹھی۔ ”میرا پیغام مل گیا تھا؟“ کہتے ہوئے مانیا نے غیر محسوس انداز میں اپنے اور طاہر کے کمرے کے مشترکہ دروازے کی طرف دیکھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

”ہاں۔“ وہ پھیل گیا۔ ”مس ریحا نے بتایا تھا مگر۔۔۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ گدی پر ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

”وہ کیا؟ مگر پہلے یہ بتاؤ کیا چلے گا؟“

”ابھی کچھ نہیں۔ ذرا دیر بعد۔۔۔“ آدیش نے اسے روک دیا۔

”اوکے۔“ مانیا مسکرائی۔ ”ہاں اب پوچھو۔ کیا کہہ رہے تھے تم؟“

”یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ مس ریحا کے ساتھ کیا تعلق ہے تمہارا؟ چند دن پہلے تم نے فون پر اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا اور آج اس کے ہاتھ مجھے تمہارا پیغام ملا۔ آخر چکر کیا ہے یہ؟“

”میں جانتی تھی تم یہ سب جاننے کے لئے بے چین ہو گے۔“ مانیا نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہیں سب کچھ بتا سکتی ہوں آدیش۔ مگر پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم پر کس حد تک اعتماد کر سکتی

ہوں؟‘‘

’’میں سمجھا نہیں۔‘‘ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ ’’کس معاملے میں اور کیسا اعتماد چاہتی ہو تم؟‘‘

’’آدیش۔‘‘ مانیا کے لہجے میں سنجیدگی اتر آئی۔ ’’بات بہت نازک ہے اور ایسی بھی کہ جس کا اظہار شاید میرے لئے نقصان دہ ہو جائے۔‘‘

’’میں سیدھا سادہ فوجی ہوں۔ سسپنس میرے اعصاب پر بوجھ بن جاتا ہے۔ جو کہنا ہے کھل کر کہو۔‘‘

’’اچھا یہ بتاؤ آدیش۔ اگر تمہیں یہ پتہ چلے کہ میں کسی ایسے کام میں تمہاری مدد چاہتی ہوں جو تمہاری جاب کے حوالے سے تمہارے محکمے کے حوالے سے تمہیں مناسب نہ لگے تو۔۔۔‘‘

اور ایک دم آدیش سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے مانیا کو بڑی ناپ تول بھری نظروں سے دیکھا جیسے اس کی بات کی گہرائی میں جانا چاہتا ہو۔ پھر سرسرایا۔

’’غداری؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ مانیا نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ’’میں اسے غداری نہیں کہہ سکتی۔‘‘

’’اور میں بات سنے بغیر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ نہ تمہاری بات کے بارے میں نہ اپنے تعاون کے حوالے سے۔‘‘ اس نے صاف صاف کہا۔

’’مگر اس بات کی گارنٹی تو دے سکتے ہو کہ اگر تم مجھ سے متفق نہ ہوئے تو یہ بات اسی کمرے میں دفن ہو جائے گی۔ ہمیشہ کے لئے۔‘‘

’’اس پر بھی مجھے سوچنا پڑے گا۔‘‘

’’تب میں مجبور ہوں آدیش۔‘‘ مانیا نے حتمی لہجے میں کہا۔ ’’میں اپنے ہاتھ کاٹ کر تمہیں نہیں دے سکتی۔ ویری سوری کہ میں نے تمہارا وقت برباد کیا۔‘‘

’’مطلب یہ کہ میں جا سکتا ہوں؟‘‘ عجیب سے لہجے میں آدیش نے کہا۔

’’اب میں اس قدر بداخلاق بھی نہیں ہوں کہ تمہیں چائے کافی نہ پوچھوں۔‘‘ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انٹر کام تک جانے کے لئے اس نے اٹھنا چاہا۔

’’رہنے دو۔‘‘ آدیش ایک دم اٹھا اور اس کے قدموں میں جا بیٹھا۔ پھر رخ پھیرا۔ نیچے سرک کر اپنا سر مانیا کی گود میں رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگا جیسے ابھی وہ کہے گا۔ ’’ذرا میرے سر میں تیل کی مالش کر دو۔‘‘ مگر اس کے بجائے اس کے لبوں سے جو نکلا اس نے مانیا کو بےحد جذباتی کر دیا۔

”دیدی بنتی ہو۔ ہر سال راکھی باندھتی ہو میری کلائی پر اور حکم دینے کے بجائے مجھ سے گارنٹیاں مانگتی ہو۔ کہتی ہو آدیش۔ کیا میں تم پر اعتماد کر سکتی ہوں؟ یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ آدیش۔ کیا میں تمہارے سینے میں خنجر اتار سکتی ہوں؟“

”بکومت۔“ مانیا نے اس کا سر باہوں کے حلقے میں لے کر سینے میں چھپا لیا۔ ”تھپڑ مار دوں گی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”گولی مار دو تو زیادہ اچھا ہے۔“ آدیش نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آج اس جسم پر یہ وردی کس کی دین ہے؟ جانتی ہو ناں۔ میں سماج میں سر اٹھا کر چل سکتا ہوں تو کس کی وجہ سے؟ یہ بھی تمہیں علم ہے۔ مجھے اپنے باپ کے نام کا پتہ نہیں۔ ماں کون تھی یہ بھی نہیں جانتا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ اگر تم مجھے ریل کی پٹڑی سے کھینچ کر زندگی کی پگڈنڈی پر گامزن نہ کر دیتیں تو میں کبھی کا ٹکڑوں میں بٹ کر اس دنیا سے ناپید ہو چکا ہوتا۔ اپنے ماں باپ کا نام دے کر تم نے مجھے حرامی ہونے کے الزام سے بچا لیا۔ اور آج۔۔۔ آج تم جاننا چاہتی ہو کہ تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو یا نہیں؟“

”آدیش۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔“ مانیا نے اس کے بالوں پر پے در پے کتنے ہی بوسے دے ڈالے۔ اس کا سر اب بھی مانیا کی باہوں میں بھنچا ہوا تھا۔

”معاف کر دوں۔ کیوں معاف کر دوں؟“ وہ سسک کر بچوں کی سی ضد کے ساتھ بولا۔ ”جاؤ۔ نہ میں تمہیں معاف کروں گا نہ تم سے بات کروں گا۔“

”آدیش۔۔۔“ مانیا اس کے روٹھنے کے انداز پر قربان سی ہو گئی۔ ”اب بھی نہیں۔“

اس نے بازو کھولے اور اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

آدیش نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھامے۔ پاگلوں کی طرح بار بار انہیں چوما اور پھر وہ ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ لئے۔

”اب بس بھی کرو بے وقوف۔ کیا رلا رلا کر مار دو گے مجھے؟“

”ہاں۔“ آدیش نے اس کے بازو اپنے گرد حمائل کر لئے۔ ”دوبارہ ایسی بات کی ناں تو میں اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گا۔“ مانیا نے اس کے شانے پر ماتھا رکھ کر اپنی نم آنکھیں بند کر لیں۔ ”بس یہ یاد رکھنا دیدی۔ اس ملک اس دنیا اس دھرم سے بھی اونچا اگر کوئی ہے تو میرے لئے تم ہو۔ صرف تم۔“

”جانتی ہوں۔ غلطی ہو گئی بابا۔ اب ختم بھی کر دو۔“ مانیا نے پیار سے کہا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ پھر اپنی ساڑھی کے پلو سے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ خشک کیا۔

”اب ذرا سنبھل کر بیٹھو۔ چہرے پر جو بارہ بج رہے ہیں انہیں سوا نو کی مسکراہٹ میں بدلو۔ میں تم سے ایک

خاص شخص کو ملوانے جا رہی ہوں۔“

”کہاں ہے وہ؟“ آدیش نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”یہیں ہے۔“ مانیا نے پردے کی جانب رخ کر کے کہا۔ ”آ جائیے مسٹر طاہر۔“

دوسرے ہی لمحے پردہ ہٹا اور طاہر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ گزشتہ کافی گھنٹوں سے نہیں سویا مگر وہ یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اس کیفیت میں اس کے اور مانیا کے درمیان ہونے والی چند لمحے قبل کی گفتگو کا بھی بہت ہاتھ تھا جس کا اس نے ایک ایک لفظ سنا تھا۔

آدیش اور مانیا کھڑے ہو گئے۔

”مسٹر طاہر۔ یہ میرا بھائی ہے کیپٹن آدیش۔ اور آدیش یہ ہیں مسٹر طاہر۔“ مانیا نے تعارف کرایا۔

طاہر اور آدیش نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ سب لوگ بیٹھ گئے تو مانیا نے انٹر کام پر کافی اور دوسرے لوازمات کا آرڈر دینا چاہا۔ طاہر نے اسے روک دیا۔ ”ایسا نہ کیجئے۔ اس طرح کیپٹن آدیش کے ساتھ میرا آپ کے کمرے میں پایا جانا اچھا تاثر نہ دے گا۔“

بات سب کی سمجھ میں آ گئی اس لئے کھانے پینے کا پروگرام ترک کر دیا گیا۔ پھر مانیا نے آدیش کی جانب دیکھا۔

”آدیش۔ بات گھما پھرا کر بتانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتی۔ ذرا اس تصویر کو دیکھو۔“ اس نے پرس سے ایک پاسپورٹ سائز فوٹو نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

”یہ۔۔۔“ آدیش اچھل پڑا۔ ”یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔“ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”یہ تمہارے سیل میں ہے۔ اتنا تو میں جانتی ہوں۔ اب اس سے پہلے کی بات سن لو۔“ مانیا نے اسے ریلیکس ہونے کا اشارہ کیا اور سرمدا اور ریحا کا نام لئے بغیر طاہر کی فراہم کردہ معلومات اس کے گوش گزار کر دیں۔

”یہ شخص۔۔۔“ آدیش نے اس کی تصویر سامنے پڑی میز پر ڈال دی۔ ”جنرل نائر کی چھاؤنی پر اٹیک کے دوران اس کے ہاتھ لگا۔ اس کے سارے ساتھی مارے گئے۔ صرف یہ زندہ بچا۔ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی جاننے میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکے۔۔۔ لیکن۔۔۔“ ایک دم ذہن میں جنم لینے والے کسی سوال نے اسے چونکا دیا۔ اس نے طاہر کی جانب دیکھا۔ پھر اس کی نظر مانیا پر جم گئی۔ ”آپ لوگ کیسے جانتے ہیں کہ یہ کرنل رائے کے سیل میں ہے؟“

”سب سے پہلے پوچھا جانے والا سوال تم اب پوچھ رہے ہو۔“ مانیا نے کہا۔ ”بہر حال اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں ریحا نے بتایا ہے۔“

”مس ریحا نے؟“ آدیش اس بار اور بری طرح چونکا۔ ”اس کا اس شخص سے کیا تعلق؟“

”وہی۔۔۔ جو سانس کا جسم سے خوشبو کا صبا سے اور بہار کا گلاب سے ہوتا ہے آدیش۔“ مانیا نے شاعری کر ڈالی۔

”یعنی۔۔۔“ آدیش کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

”ہاں۔“ مانیا نے اس کی نظروں میں ابھرتی حیرت پڑھ لی۔ ”وہ سرمد کو اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہے۔“

اور آدیش کا سارا جسم سُن ہو گیا۔ دماغ سرد ہوتا چلا گیا۔ رگ وپے میں خون کی جگہ درد کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مانیا نے اس کی کیفیت کو اچانک انکشافات سے تعبیر کیا مگر طاہر۔۔۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ وہ ایسی وارداتوں سے ایک سے زیادہ بار دو چار ہو چکا تھا۔ اس نے زبان کو خاموش رکھا مگر سوچ کے لبوں سے پہرے ہٹا لئے۔ اس کا دماغ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے پر تولنے لگا۔

”کیا ہوا؟“ مانیا نے اسے فکر مند نظروں سے دیکھا۔

”کچھ نہیں دیدی۔“ آدیش نے سرخ ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ ”بس۔ حیرت سے یہ حال ہو گیا ہے۔“

”محبت کرنے والے جھوٹ بولیں تو فوراً پکڑے جاتے ہیں کیپٹن آدیش۔“ آہستہ سے طاہر نے کہا تو آدیش کے ایک دم اتر جانے والے چہرے پر زردی گہری ہو گئی۔

”کیا مطلب؟“ مانیا نے حیرت سے طاہر اور پھر آدیش کی جانب دیکھا۔

”کیپٹن آدیش۔۔۔“ طاہر نے نگاہوں کا محور مانیا کو بنایا۔ ”شاید نہیں، یقیناً مس ریحا سے محبت کرتے ہیں مس مانیا۔“

”کیا واقعی؟“ اس کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔ ”آدیش۔۔۔؟“ مانیا نے نظر اس کے چہرے پر جما دی۔

”پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن۔۔۔“ آدیش نے مصرع ادھورا چھوڑ دیا۔ ”مسٹر طاہر ٹھیک کہہ رہے ہیں دیدی۔ مجھ پر اس انکشاف سے جو اثر ہوا وہ قدرتی ہے مگر ظالم وقت نے مجھے بڑا حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ مس ریحا کا میرا ہو جانا ایک ایسا خواب ہے جسے دیکھنا بھی میرے لئے جرم ہے۔ اسی لئے میں انہیں دل ہی دل میں پوجتا رہا اور شاید زندگی کے آخری سانس تک پوجتا رہوں گا لیکن آج یہ جان کر کہ مس ریحا کسی اور کو چاہتی ہیں مجھے ایک عجیب سے دُکھ کی لذت نے گھیر لیا ہے۔ اب میں چاہتا ہی نہیں کہ مس ریحا میری ہو جائے۔ میں اسے حاصل کر

لوں۔ بلکہ ایک انوکھی سی کسک دل میں آنکھ کھولے میرے ہونٹوں سے یہ سننا چاہتی ہے کہ تم مجھے یہ بتاؤ میں مس ریحا اور سرمد کے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”کیپٹن آدلیش۔۔۔“ طاہر نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ حیرت سے منہ پھاڑے مانیا سب کچھ سن رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی۔ صورتحال ذرا نارمل ہوئی تو طاہر نے مانیا کی اجازت سے آدلیش سے بات چیت شروع کی۔

”کیپٹن آدلیش۔ سرمد اس وقت کس حال میں ہے؟“

”اچھے حال میں نہیں ہے۔“ آدلیش نے صاف گوئی سے کہا۔ ”سب جانتے ہیں کہ ٹارچ سیلز میں کسی بھی ملزم سے کیا سلوک ہوتا ہے۔ مگر وہ شخص عجیب مٹی سے بنا ہوا ہے۔ اس کی زبان سے آج تک اپنے یا اپنے گروپ کے بارے میں ایک لفظ ادا نہیں ہوا۔ ہاں۔ ایک خاص بات جو یہاں آنے سے پہلے مجھ سے کرنل رائے نے کی وہ سن لیں شاید وہ ہمیں کسی پلان کے لئے مدد دے سکے۔“ اس کے بعد کیپٹن آدلیش نے انہیں اپنی اور کرنل رائے کی تقریباً دو گھنٹے قبل کی گفتگو سے آگاہ کیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کل کی رات سرمد کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔“

”جی ہاں۔“ آدلیش نے طاہر کی بات کے جواب میں کہا۔ ”میں یہ تو اندازہ نہیں لگا سکا کہ کل رات کرنل رائے کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے کسی بھی اقدام کے بارے میں کوئی بھی پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم یہ بتا سکتا ہوں کہ کل سرمد کا قصہ آر یا پار۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہوں۔“ مانیا اس کی بات پر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ طاہر اور آدلیش کی نظر ملی اور جھک گئی۔ صورتحال ان کے لئے خاصی گھمبیر تھی۔ یہ بڑا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی گھڑی تھی۔

”اچھا مسٹر طاہر۔ ایک بات تو بتایئے۔“ اچانک آدلیش نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ پھر جیسے اس نے ارادہ بدل دیا۔ ”مگر نہیں۔ پہلے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ پھر آپ میرے بیان کی روشنی میں وضاحت کیجئے گا۔“

”جی جی۔“ طاہر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مانیا نے بھی ان دونوں کی طرف کان لگا دیے۔

”مسٹر طاہر۔“ آدلیش نے بڑے خوابناک انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”چند دن پہلے تک میں کرنل رائے کے ساتھ سرمد پر تشدد میں پوری طرح شامل تھا مگر ایک دن عجیب بات ہوئی۔ سرمد غشی کے عالم میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا کہ شاید اس کے بارے میں کسی ایسی بات کا علم ہو جائے جو ہم پر اس کا نام پتہ یا کسی آتنک وادی تنظیم سے تعلق آشکار کر دے مگر اس

کے لبوں سے نکلتے الفاظ نے میرے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑا دیا۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میری حالت ایسی ہوگئی جیسے کسی جادو نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ میرا دل پسلیاں توڑ کر سینے سے نکل جانے کو تھا۔ اور شاید ایسا ہی ہوتا اگر میں سرمد سے پرے نہ ہو جاتا۔ اس دن سے آج تک میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکا۔ میرا دل ہی نہیں چاہا کہ میں اسے اذیت دوں۔ بلکہ نجانے کس جذبے کے تحت میں نے اپنی ڈیوٹی مسلسل اس پر لگوائے رکھی تاکہ میری جگہ کوئی دوسرا آ کر اسے تشدد کا نشانہ نہ بنائے۔ اس دن کے بعد سے آج تک یہ میرا معمول ہے کہ جب وہ آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا ہو، روزانہ ایک دو بار میں اس کے ہونٹوں کے ساتھ کان لگا کر وہ خوبصورت الفاظ ضرور سنتا ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا میں اس کے زخموں پر مرہم لگاؤں۔ اسے آرام پہنچاؤں مگر میں ایسا کر نہ سکا۔ میں ایسا کرتا تو غدار کہلاتا اور عتاب کا شکار ہو جاتا۔ اس پر کئے ہوئے اپنے تشدد کے لمحات یاد آتے تو میں خود پر شرمندگی محسوس کرتا۔۔۔ اور آج۔۔۔“ اس نے بات روک دی۔ آنکھیں بند کر کے سر اوپر اٹھایا اور فضا میں کچھ سونگھنا چاہا۔ محسوس کرنا چاہا۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ تینوں یہ دیکھ کر چونک پڑے کہ اس کی آنکھوں میں نیند کی سی کیفیت انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اس کا لہجہ بھاری ہو گیا۔ یوں جیسے وہ بولنا چاہتا ہو اور بول نہ پا رہا ہو۔ اس کی آواز میں شبنم سی گرنے لگی۔ اس کے لہجے کو بھگونے لگی۔ غسل دینے لگی۔

”آج۔۔۔ آج وہ ہوا جس کے سبب میں ابھی تک ایک سرشاری کے سفر میں ہوں۔ میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے کرنل رائے کے آفس میں جا رہا تھا کہ مجھے رک جانا پڑا۔ سرمد کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے نیم دراز ہے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں میں تر ہے اور ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے ہیں۔ میں رکا تو محسوس ہوا کہ ایک عجیب سی مست کر دینے والی خوشبو وہاں چکرا رہی ہے۔ میں حیرت زدہ سا اندر داخل ہوا اور اس کے قریب چلا گیا۔ کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیے۔ وہ اپنا مخصوص ورد کر رہا تھا۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ خوشبو وہ مہک جس نے سرمد کے گرد حصار سا باندھ رکھا ہے مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ میرے حواس نشے میں ڈوبتے چلے گئے۔ دل کو بے قراری نے جکڑ لیا۔ جب میں اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکا تو خوشبو میں نہایا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ کسی مے نوش کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سیل سے باہر پہنچا۔ یخ بستہ فضا میں چند گہرے گہرے سانس لئے تو ہوش کا دامن ہاتھ آیا۔ یہاں آنے تک میری حالت دگرگوں ہی رہی۔ ڈیڈی اور آپ لوگوں سے ملا۔ گفتگو کی تو حالت سنبھلی مگر میرا دل سینے ہی میں ہے اس میں اب بھی مجھے کسی کسی لمحے شک ہوتا ہے۔ لگتا ہے میں اب بھی وہیں ہوں۔ سرمد کے پاس۔ وہ خوشبو اب بھی میری دھڑکنوں اور آتما میں چکرا رہی ہے۔ وہ الفاظ اب بھی مجھے لوریاں دے رہے ہیں۔ مجھے اپنی جانب کھینچ رہے ہیں۔ مجھے کچھ سمجھا رہے ہیں۔ مگر کیا؟ یہ میں نہیں جانتا“۔

کیپٹن آدیش خاموش ہو گیا اور سر جھکا لیا۔ وہ تینوں بُت بنے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے جس پر ایک عجیب سی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔

’’کیپٹن آدیش۔۔۔‘‘ آہستہ سے طاہر نے اسے پکارا تو وہ چونکا۔ مانیا نے جھرجھری لے کر اسے متوحش نظروں سے دیکھا۔

’’یس مسٹر طاہر۔‘‘ وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

’’کیا آپ کو۔۔۔ وہ الفاظ یاد ہیں۔۔۔ جو سرمد کا ورد ہیں؟‘‘ طاہر نے ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر جما جما کر الفاظ ادا کئے۔

’’وہ الفاظ۔۔۔‘‘ کیپٹن آدیش یوں مسکرایا جیسے طاہر نے اس سے کوئی بچگانہ بات پوچھ لی ہو۔ ’’وہ تو میری آتما پر ثبت ہو گئے ہیں مسٹر طاہر۔ میں چلتے پھرتے ان الفاظ کو اپنے لہو کے ساتھ جسم میں گردش کرتے محسوس کرتا ہوں۔‘‘

’’کیا آپ انہیں ہمارے سامنے دہرائیں گے کیپٹن آدیش؟ پلیز۔‘‘ طاہر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے لہجے میں التجا سی تھی۔

’’ضرور۔‘‘ آدیش نے کہا۔ پھر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ میز پر پڑا جگ اٹھایا۔ گلاس میں پانی ڈالا۔ گھونٹ بھرا اور اٹھ گیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس نے کلی کی اور رومال سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے لوٹ آیا۔ وہ تینوں اس کی حرکات کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

’’مسٹر طاہر۔ پتہ نہیں کیوں میرا جی نہیں چاہا کہ میں کلی کئے بغیر وہ الفاظ زبان سے نکالوں۔ ظاہر ہے اگر وہ الفاظ آپ کے مذہب سے متعلق ہیں تو آپ کے عقیدے کے مطابق پاکیزہ ہی ہوں گے مگر میرے دل میں ان کا احترام جس وجہ سے ہے، میں وہ بیان نہیں کر سکتا۔ بس میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان الفاظ کو اپنی زبان پاک کر کے ادا کروں۔‘‘

’’اب دیر نہ کیجئے کیپٹن آدیش۔‘‘ طاہر بیتاب ہو گیا۔ رہ گئی مانیا تو وہ سانس روکے کسی ایسے انکشاف کی منتظر تھی جو اسے حیرت کے کسی نئے جہان میں اتار دیتا۔

صوفے پر بیٹھ کر کیپٹن آدیش نے ایک نظر ان تینوں کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر اس کی نظر طاہر کے چہرے پر آ جمی۔

’’وہ الفاظ جو سرمد کا ہمہ وقت ورد ہیں مسٹر طاہر۔ وہ ہیں۔‘‘ دھیرے سے اس نے آنکھیں بند کیں اور کہا:

’’صلی اللہ علیہ وسلم۔‘‘

ایک دم جیسے کمرے میں ہوا ناچ اٹھی۔ فضا جھوم اٹھی۔ لمحات وجد میں آ گئے۔ گھڑیاں رقصاں ہو گئیں۔ خوشبو نے پر پھیلا دیے۔ مہک ان کے بوسے لینے لگی۔ ان کے دل دھڑکنا بھول گئے۔ پلکوں نے جھپکنا چھوڑ دیا۔ ہوش و حواس ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہلکورے لینے لگے۔

کیپٹن آدیش خاموش ہو چکا تھا مگر اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی بازگشت کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اجالوں سے گلے مل رہی تھی۔ اندھیروں کا نصیب بدل رہی تھی۔ مانیا بُت بنی بیٹھی تھی اور طاہر۔۔۔ وہ ایسی نظروں سے کیپٹن آدیش کو دیکھ رہا تھا' جن میں رشک تھا تو عروج پر۔ عقیدت تھی تو انتہا پر۔ اور پیار تھا تو اوج پر۔

کتنے ہی لمحے سکوت کے عالم میں دبے پاؤں گزر گئے۔ پھر مانیا نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا تو سب لوگ آہستگی سے چونکے۔ کیپٹن آدیش نے سر اٹھایا اور مانیا کے بعد طاہر کی جانب دیکھا' جو اسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

“کیا دیکھ رہے ہیں مسٹر طاہر؟” آدیش مسکرایا۔

“دیکھ نہیں سوچ رہا ہوں کیپٹن آدیش۔” طاہر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ “تم کتنے خوش قسمت ہو کہ سرمد کے اتنا قریب رہتے ہو۔”

“اب کیا آپ میری ایک بات کا جواب دینا پسند کریں گے؟”

“ضرور۔” طاہر نے بڑے خلوص سے کہا۔

“یہ الفاظ کیا ہیں جن کے اثر نے مجھے پتھر سے موم بنا دیا۔”

“یہ الفاظ۔۔۔” طاہر کے لہجے میں ادب در آیا۔ “کیپٹن آدیش۔ یہ ہمارے دین کی اساس ہیں۔ یہ درود شریف ہے۔ ہمارے اللہ' ہمارے معبودِ برحق کی آخری کتاب میں اس کا فرمان ہے کہ 'میں اور میرے فرشتے اللہ کے حبیب' رحمت للعالمین' ہمارے آقا و مولا' آخری نبی اور رسول جناب محمد مصطفیٰ ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو۔ تم بھی اپنے آقا ﷺ پر درود پڑھو اور سلام بھیجا کرو'۔۔۔ درود شریف پڑھنا اللہ کی سنت ہے اور سرمد اس سنت کی ادائیگی میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے' ایسا تم نے بتایا۔”

“اسی لئے۔۔۔ اسی لئے۔” آدیش کہہ اٹھا۔ “یہ الفاظ مجھ پر عجب جادو سا کر دیتے ہیں مسٹر طاہر۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔”

“اگر آپ کو اور مس مانیا کو برا نہ لگے تو میں کہوں گا کیپٹن آدیش۔۔۔ کہ آپ بہت جلد ہم سے آ ملیں گے۔ میں ایسے ہی آثار دیکھ رہا ہوں۔ آپ پر درود شریف کا یہ اثر کوئی معمولی بات نہیں ہے۔” طاہر نے بڑے محتاط

الفاظ استعمال کیے۔

"آپ کا مطلب ہے آدیش مسلمان ہو جائے گا؟" مانیا نے دھیرے سے کہا۔

"شاید۔" طاہر نے آہستگی سے جواب دیا۔ "لیکن اس میں کوئی زبردستی نہیں ہے مس مانیا۔ ہمارے دین میں جبر ہے نہ اکراہ۔ دائرہ اسلام میں آتا وہی ہے جس کے نصیب میں ہدایت لکھی ہے۔ جسے کائنات کا وہ مالک و خالق منتخب کر لے۔"

"چلیں۔" مانیا مسکرائی۔ "اس معاملے کو آنے والے وقت پر چھوڑ دیجئے۔ اس وقت ہم جس مسئلے کا شکار ہیں اس پر سوچئے۔"

"کیپٹن آدیش۔ کل رات سیل میں کون کون ہوگا؟" طاہر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' کل کے لئے کرنل رائے کا حکم ہے کہ صرف میں اور وہ وہاں سرمد کے پاس ہوں گے۔ باقی سب لوگوں کو چھٹی دے دی جائے گی۔" آدیش نے بتایا۔

"اور یہ کتنے بجے رات کا وقت ہوگا؟"

"سوا آٹھ بجے تک سیل خالی ہو جائے گا۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کل رات سرمد کو وہاں سے نکال لیا جائے؟"

"بہت مشکل ہے۔" آدیش سوچتے ہوئے بولا۔ "ایک تو کرنل رائے کی کوٹھی آبادی سے ہٹ کر ہے۔ دوسرے آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس کے گرد حفاظتی باڑھ ہے' جس کے چاروں طرف دن رات آٹھ فوجی پہرہ دیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ کوٹھی کے گیٹ پر باقاعدہ دو فوجیوں کا کیبن ہے جو اندر کوٹھی اور سیل تک پہنچنے والے کے لئے پہلے سخت چیکنگ کرتے ہیں۔ اس کے بعد سیل کے دروازے پر کمپیوٹرائزڈ سسٹم چوبیس گھنٹے آن رہتا ہے۔ اگر آپ پہلے سے وہاں آنے جانے والے ہیں یا وہاں سے متعلق فرد ہیں تو آپ کے فنگر پرنٹس آلریڈی کمپیوٹر میں فیڈ ہوں گے اور آپ کا سیل میں جانا ممکن ہوگا۔ اور اگر آپ پہلی بار وہاں آئے ہیں تو میں یا کرنل رائے آپ کو کلیر کریں گے' تب آپ وہاں داخل ہو پائیں گے۔"

"ہوں۔" طاہر نے آدیش کی ایک ایک بات غور سے سنی۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہا۔ "اگر ہم ذرا سی کوشش کریں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے کیپٹن آدیش۔"

"وہ کیسے؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔ مانیا صرف سن رہی تھی۔ اس نے ابھی تک کسی بات پر رائے زنی نہ کی تھی۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میرے فنگر پرنٹس کسی طرح کمپیوٹر سسٹم میں فیڈ کر دیں۔“

”جی نہیں۔“ کیپٹن آدیش نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔“

”دوسری صورت یہ ہے کہ آپ مجھے کسی قسم کا انٹری پاس بنا دیں۔۔۔“

”ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔“ ایک دم آدیش نے اس کی بات اچک لی۔ ”یہ آسان بھی ہے۔“

”بس تو آپ ایسا کر دیں۔“ طاہر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ کل کرنل رائے جب سیل میں سرمد کے پاس آئے تو میں وہاں موجود ہوں۔“

”یہ تو ہو جائے گا۔ سوچنے والی بات صرف یہ ہے کہ آپ کو کس خانے میں فٹ کیا جائے کہ کرنل رائے کو آپ کی آمد مشکوک لگے نہ ناگوار گزرے۔ اگر آپ پہلے سے وہاں موجود ہوئے تو یہ بات اسے ہضم نہیں ہو گی۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر خطرے کی کوئی بات ہو تو آپ مجھے فوراً مطلع کر سکیں؟“

”اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔“ آدیش نے جواب دیا۔ ”اور وہ یہ کہ ایسا کوئی بھی لمحہ آتے ہی میں موبائل پر آپ کو بیل کر دوں۔ تب آپ وقت ضائع کیے بغیر کوٹھی میں انٹر ہو جائیں۔“

”مگر میں سیل میں کیسے داخل ہو سکوں گا؟“

”وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں سیل کا خودکار سسٹم آف کر دوں گا۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہو گا کہ سیل کے دروازے پر پہنچ کر دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال لیں۔ وہ کھل جائے گا۔ اور اب آپ مجھ سے وہاں کا نقشہ سمجھ لیں۔“

آدیش نے مانیا کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ پیڈ اور قلم نکالا اور آدیش کی جانب بڑھا دیا۔ پیڈ آدیش نے میز پر رکھا۔ طاہر اور مانیا آگے کو جھک آئے۔ آدیش نے بڑی مہارت سے کوٹھی کی انٹرنس سے لے کر رہائشی حصے اور سیل تک کا نقشہ بنا کر یوں سمجھایا کہ طاہر کے ساتھ ساتھ مانیا کو بھی ازبر ہو گیا۔

”بس تو یہ طے ہو گیا کہ کل رات آٹھ بجے ہم کرنل رائے کی کوٹھی سے ایک فرلانگ دور سیتا مندر کے بالمقابل پارک میں موجود رہیں گے اور سگنل موصول ہوتے ہی آپ کی طرف چل پڑیں گے۔“ طاہر نے نقشے پر نظر دوڑاتے ہوئے تہہ کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔ ”مگر ہم اندر کیسے داخل ہوں گے کیپٹن آدیش؟“

”یہ لیجئے۔“ آدیش نے ایک پیڈ کے ایک کاغذ پر اپنے سائن کر کے مخصوص کوڈ میں کچھ لکھا اور طاہر کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ آپ دونوں کے لئے انٹری پاس کا کام دے گا۔ بیرونی گیٹ پر آپ کو روکا جائے گا۔ انہیں یہ پاس دکھا دیجئے گا۔ میں انہیں آپ کے بارے میں زبانی بھی انسٹرکشن دے دوں گا۔“

سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ طاہر کے رگ و پے میں سکون کی ایک لہر سی تیر گئی۔ اس نے ممنونیت سے آدیش کی

جانب دیکھا۔

”کچھ مت کہیے مسٹر طاہر۔ میں جس کے لئے یہ سب کر رہا ہوں' اس سے مجھے کسی شکریے کی طلب نہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ مس ریحا کے بارے میں میرے جذبات کبھی آپ میں سے کسی کے لبوں پر نہ آئیں۔ یہی میرا شکریہ ہے آپ کی طرف سے۔“ آدیش نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو طاہر کی نگاہ مانیا کی جانب اٹھ گئی جو بڑی محبت سے آدیش کو تک رہی تھی۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے مسٹر طاہر۔“ آخر وہ بولی۔ ”لیکن کیا سب محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں؟“ اس نے طاہر کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”کیا اب بھی پوچھنے کی ضرورت باقی ہے مس مانیا؟“ طاہر ہولے سے ہنسا۔ جواب میں مانیا خاموش ہو گئی۔

پھر آدیش جانے کے لئے اٹھ گیا۔ طاہر نے اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ مانیا نے اسے گلے لگایا اور ماتھا چوم لیا۔

”دھرم پر میرا وشواس کبھی بھی نہیں رہا آدیش۔ تم ضد کر کے مجھ سے ہر سال راکھی بندھواتے رہے۔ آج تم نے پانچ روپے کی اس راکھی کو انمول کر دیا۔“

”دیدی۔ تم خوش تو وہ خوش۔“ اس نے اوپر دیکھا۔ ”اس کے علاوہ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں۔“ وہ رخصت ہو گیا۔

دروازہ بند کر کے لوٹی تو مانیا کو طاہر کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا ملا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور مانیا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بیٹھئے مسٹر طاہر۔“ وہ صوفے پر ٹک گئی۔ طاہر بھی اس کے سامنے آ بیٹھا۔ ”آپ نے میری نظریں پڑھ لیں تھیں کیا؟“

”جی ہاں۔“ طاہر تناؤ کے شکار اعصاب پر قابو پاتے ہوئے مسکرایا۔ ”یہ فن بھی آ ہی گیا ہے۔ میں نے جانا کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔“

”جی ہاں۔ مگر کیا کہنا چاہتی ہوں' کیا یہ نہیں سمجھے آپ؟“

”آپ جب تک بتائیں گی نہیں میں کیسے جان پاؤں گا مس مانیا۔“ طاہر بیحد محتاط ہو رہا تھا۔

”اب آپ اتنے نادان بھی نہیں ہیں مسٹر طاہر کہ میری نظر کو تو پڑھ لیں اور بات کو نہ سمجھ سکیں۔“ وہ ہنسی۔ ”ہم جس صورتحال سے یہاں آ کر دوچار ہو گئے ہیں اس کے حوالے سے اگلا کوئی بھی لمحہ کچھ بھی گل کھلا سکتا ہے۔ آپ

خوب جانتے ہیں کہ میں صرف آپ کے لئے اپنے ملک سے غداری کر رہی ہوں اور آدلیش ایک طرف اپنی محبت سے مجبور ہو کر اور دوسری طرف میری وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ پھر انجان بننے کا فائدہ؟‘‘ مانیا نے جیسے کھیل کے پتے بانٹے۔

’’آپ کہنا کیا چاہتی ہیں مس مانیا؟ کھل جایئے۔‘‘ طاہر نے پتے اٹھا لئے۔

’’آپ کی دوستی کا ثبوت۔‘‘ مانیا نے شانے اچکائے اور ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔

’’کیسے پیش کروں؟‘‘ اس نے پہلا پتہ الٹ دیا۔ حکم کا نہلا تھا۔

’’کیا مجھے زبان سے کہنا ہوگا؟‘‘ ساڑھی کا پلو ڈھلک گیا۔ مانیا کے ہاتھ میں پان کی بیگم تھی۔

’’کوئی اور راستہ نہیں؟‘‘ دوسرا پتہ حکم کا غلام نکلا۔

’’ہے۔‘‘ اینٹ کی دکی سامنے آ گئی۔

’’مجھے دوسرا کوئی بھی راستہ منظور ہے۔‘‘ تیسرا پتہ جوکر تھا۔ اس نے پتے پھینک دیے۔

’’صرف ایک سوال کا جواب۔‘‘ اس نے طاہر کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ ’’یہ صفیہ وہی ہے ناں، جس کے طاہر آپ ہیں؟‘‘

ایک دم سے کیا جانے والا یہ سوال طاہر کے لئے حواس شکن ثابت ہوا۔ اس نے بری طرح چونک کر مانیا کی طرف دیکھا جو اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

’’جھوٹ نہیں مسٹر طاہر۔‘‘ اس نے شہادت کی انگلی کھڑی کی۔ ’’اب تک سارا معاملہ سچ ہی پر چلتا آ رہا ہے۔ اگر آپ سچ بولیں گے تو میں بھی اپنے جھوٹ کا پردہ فاش کر دوں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔‘‘

’’آپ کا جھوٹ؟‘‘ طاہر سرسرایا۔ اب وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

’’وہ بعد میں۔ پہلے میرے سوال کا جواب۔‘‘ وہ مسکرائی۔

’’ہوں۔‘‘ طاہر جیسے مجبور ہو گیا۔ اس نے ہاتھ دونوں گھٹنوں میں دبا لئے اور نظریں جھکا لیں۔ ’’آپ کا کہنا ٹھیک ہے مگر۔۔۔‘‘

’’بس۔۔۔‘‘ مانیا نے اسے کچھ بھی کہنے سے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ’’کچھ مت کہیے مسٹر طاہر۔ پہلے مجھے اس سچ کا مزہ لینے دیجئے۔‘‘ اس نے آنکھیں بند کر کے سسکاری لی۔ ’’ایسی لذت کہاں ہوگی کسی جھوٹ میں۔ جب سے ریحا گئی، میں آپ سے اسی ایک سوال کا جواب لینے کے لئے بیتاب تھی۔ شکر ہے کہ اس وقت آپ نے میری نگاہ کی چوری پکڑ لی۔ اب میں رات کو الجھے بغیر نیند لے سکوں گی۔‘‘

’’مگر میں یہ کہنا چاہتا تھا مس مانیا۔۔۔‘‘

’’کسی کو کبھی خبر نہ ہوگی مسٹر طاہر۔‘‘ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ’’یہ مہک تو دل میں چھپانے کی چیز ہے۔ دھڑکن کی طرح۔ آپ اس بارے میں بے فکر ہو جائیں۔ اور اب میری بات۔ ۔ ۔‘‘ وہ بڑے پُراسرار انداز میں مسکرائی۔ پھر اس نے ساڑھی شانے پر درست کر لی۔ ’’میں پہلی ملاقات سے آپ کی اسیر ہوں مسٹر طاہر۔ آج سے پیشتر تک میں اپنے جھوٹ میں خوش تھی۔ چاہتی تھی کہ آپ کو حاصل کر لوں‘ چاہے ایک رات ہی کے لئے۔ مگر سرمد اور صفیہ کے ساتھ جب آپ کا نام سنا تو چونکی۔ ہوش آیا۔ پھر آدیش نے اور بھی عجب کھیل رچا ڈالا۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ ایثار کس شے کا نام ہے؟ بغیر کسی غرض کے انسان کسی کیلئے جان دے دینے کی حد تک کیوں چلا جاتا ہے؟ جب آپ نے کوئی بھی دوسری شرط سنے بغیر مان لی تو میرا جھوٹ ہار گیا۔ آپ ایک پُر شباب جسم سے پہلے دن سے بھاگ رہے ہیں‘ یہ میں جانتی ہوں۔ میں آپکی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر بھی آپ کو پا لینا چاہتی تھی۔ ۔ ۔ مگر آج جب کچھ اَن چھوئی حقیقتیں مجھ پر آشکار ہوئیں تو میں فریب کے جال سے نکل آئی۔ میں آپکو اپنی شرط سے مُکت کرتی ہوں مسٹر طاہر۔ آپ آزاد ہیں۔ میں آپکی دوستی جیتنا چاہتی تھی مگر محسوس ہوا ہے کہ میں تو آپکی دوستی کے لائق ہی نہیں ہوں۔ ہوس اور دوستی کا کیسا ساتھ مسٹر طاہر۔‘‘ اسکی آواز بھرا گئی۔ نظر جھک گئی اور اضطراب کے عالم میں وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

’’بس یا کچھ اور کہنا ہے آپ کو؟‘‘ طاہر نے چند لمحے انتظار کے بعد بڑے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

’’اور کیا کہوں گی میں؟‘‘ وہ ہاتھوں سے آنکھیں مسلتی ہوئی بولی۔ شاید نمی میں پوشیدہ شرمندگی طاہر سے چھپانا چاہتی تھی۔ ’’سوائے اس کے کہ اب مجھ پر شک نہ کیجئے گا۔ میں آخر دم تک آپ کے ساتھ ہوں۔‘‘

’’اور دوستی کسے کہتے ہیں مس مانیا؟‘‘ طاہر نے مسکرا کر کہا۔ ’’دوستی کے جس معیار پر اس وقت آپ ہیں‘ اس کے لئے تو لوگ ترستے ترستے مر جاتے ہیں۔‘‘

’’یعنی۔ ۔ ۔؟‘‘ اس نے ہاتھ ہٹا کر اسے حیرت سے دیکھا۔

’’یہ شبنم بتاتی ہے کہ پھول کیسا پاکیزہ ہے۔‘‘ طاہر کا اشارہ اس کے آنسوؤں کی طرف تھا۔

’’جھوٹ۔ ۔ ۔ جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔‘‘ بے اعتباری سے اسنے طاہر کی جانب دیکھا اور ہنس پڑی۔ ساتھ ہی اسکے رکے ہوئے آنسو چھلک پڑے۔ دھوپ چھاؤں کا یہ امتزاج اسکے حسین چہرے پر عجب بہار دے رہا تھا۔

’’جھوٹ بول کر میں آپ کی توہین نہیں کرنا چاہتا مس مانیا۔‘‘ طاہر اب بھی مسکرا رہا تھا۔ ’’اپنے دل سے پوچھئے جس میں اس وقت اطمینان ہی اطمینان دھڑک رہا ہوگا۔‘‘

اور مانیا نے آہستہ سے پلکیں موند لیں۔ طاہر سچ کہہ رہا تھا۔

ریحا' سوجل کے سینے سے لگی سسک رہی تھی' جو کسی سوچ میں ڈوبی اس کی کمر پر بڑی محبت سے دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ماما۔ اور پاپا اس کے ساتھ آج رات کیا سلوک کرنے والے ہیں' اس کے بارے میں وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں۔'' ریحا روئے جا رہی تھی۔

''دھیرج میری بچی دھیرج۔'' سوجل نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر کہا اور اس کا چہرہ سامنے کر کے اس کے رخسار خشک کرنے لگی۔ ''میں ابھی زندہ ہوں۔ تم میرے راکیش کی نشانی ہو اور میں نے کبھی تم سے یہ نہیں چھپایا کہ میں نے رائے سے شادی کی ہی اس لئے تھی کہ مجھے آج بھی شک ہے کہ راکیش کا قتل اسی نے کرایا تھا۔ میں جس روز اس حقیقت سے آگاہ ہو گئی' وہ دن میرے اور اس کے تعلق کا آخری دن ہو گا۔ رہ گئیں تم۔۔۔ تو میری جان۔ تمہاری خوشی مجھے اپنے دھرم سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اس دھرم نے مجھے سوائے دُکھ اور جبر کے دیا کیا ہے کہ میں تمہارے اور تمہاری پسند کے درمیان دیوار بن جاؤں۔ ہو گا وہی جو تم چاہو گی۔ تم فکر مت کرو۔''

''مگر ماما۔ آپ کریں گی کیا؟ پاپا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔'' ریحا نے بھیگی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

''ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں ریحا۔ انہیں کاٹ دیا جائے تو انسان معذور ہو جاتا ہے۔'' سوجل نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ ریحا نے ماں کے سینے پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں۔ اسے نجانے کیوں یقین ہو گیا کہ سوجل جیسا کہہ رہی ہے' ویسا ہی ہو گا۔

''تم یہ بتاؤ کہ کیپٹن آدیش پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟'' کسی خیال کے تحت سوجل نے پوچھا تو ریحا سوچ میں پڑ گئی۔

''ماما۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے دو تین بار کی ملاقاتوں اور اس کے بعد اس کے آنے جانے کے دوران محسوس کیا ہے کہ وہ مجھے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس کی جھجک ہمارے اور اس کے درمیان سٹیٹس

کے فرق کی وجہ سے ہے۔‘‘

’’کیا تم اسے اپنی مدد پر آمادہ کرسکتی ہو؟‘‘ سوجل نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

’’کیسے ماما؟‘‘ ریحا نے حیرانی سے پوچھا۔

’’دیکھو بیٹی۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، یہ ایک یونیورسل ٹرتھ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اگر وقتی طور پر تمہیں آدلیش کو فریب دے کر بھی اپنا کام نکالنا پڑے تو سرمد کو بچا لو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔‘‘

’’مگر ماما۔۔۔‘‘

’’صرف ایک بات کا دھیان رکھنا بیٹی۔‘‘ سوجل نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’اور وہ یہ کہ تمہاری آبرو پر آنچ نہیں آنی چاہئے۔ باقی پیسہ ہو یا کوئی وعدہ۔ اس کی فکر نہ کرنا۔ میں اپنا آپ ہار کر بھی تمہارے الفاظ کی لاج رکھ لوں گی۔‘‘

ریحا نے ماں کے چہرے سے نظر ہٹا لی اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ ’’ماما۔‘‘ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ’’اس میں ففٹی ففٹی کے چانس ہیں۔ وہ ہماری مدد بھی کرسکتا ہے اور مخبری بھی۔‘‘

’’میں سمجھتی ہوں ریحا مگر یہ رسک ہمیں لینا ہی پڑے گا جان۔‘‘ سوجل نے اس کی جانب بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ ’’میری طرف دیکھو۔‘‘

ریحا نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا تو عجیب سے سحر میں گرفتار ہوگئی۔ سوجل کی آنکھیں ویسے ہی بڑی خوبصورت تھیں اور اس وقت ان میں کچھ ایسی چمک لہرا رہی تھی جس سے ایک پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔

’’تم میری بیٹی ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہئے مگر جذبے کیا ہوتے ہیں؟ انہیں نبھانے کے لئے کیا کچھ نچھاور کیا جاتا ہے؟ تمہیں سمجھانے کے لئے یہ گفتگو ضروری ہے۔ سنو ریحا۔ راکیش کے بعد، میں نے آج تک رائے کے بستر پر جتنے پل گزارے ہیں، اس ایک حقیقت کو جاننے کی قیمت کے طور پر گزارے ہیں، جو مجھے اس کے راکیش کا قاتل ہونے سے آگاہ کردے گی۔ یہ ففٹی ففٹی کا چانس نہیں ہے ریحا۔ یہ ایک اندھا داؤ ہے جو میں نے صرف اپنا شک دور کرنے کے لئے کھیلا ہے۔ اپنے اس عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر، جو مجھے راکیش، تمہارے باپ سے تھا، نہیں، آج بھی ہے۔ اگر آخر میں رائے بے قصور نکلا تو میری ساری زندگی کی تپسیا بیکار جائے گی مگر مجھے یہ پچھتاوا نہیں رہے گا کہ میں نے اپنی محبت کا حق ادا نہ کیا۔ میں نے اپنے راکیش کی جان لینے والے کا پتہ لگانے کی کوشش نہ کی۔۔۔ میری اس عقیدت کو سمجھو ریحا جس کا محور صرف اور صرف راکیش ہے۔ وہ راکیش جو اب صرف میری یادوں میں زندہ ہے۔ میری دھڑکنوں میں موجود ہے۔ جس کا وجود مٹ چکا ہے۔ اور سرمد۔۔۔ وہ تو ابھی سانس لے رہا ہے۔

تم اسے موت کے ہاتھوں سے چھین سکتی ہو۔ اس لئے ففٹی ففٹی کے چکر میں مت پڑو ریحا۔ اگر آدلیش نے ہم سے دھوکا کیا اور رائے سے جاملا تب بھی۔۔۔ تب بھی میری جان۔ تمہیں اپنی سی کر لینے کا جو موقع ہاتھ آ رہا ہے اسے گنواؤ مت۔ یاد رکھو۔ اگر تم جیت گئیں تو سرمد تمہارا ہو جانے کی امید تو ہے اور اگر آدلیش نے پیٹھ میں خنجر بھونک دیا تو اپنی محبت پر قربان ہو جانے کا تاج سر پر پہن کر اس کے ساتھ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو جانا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر۔ ساتھ ساتھ۔ جدائی اور تنہائی کا دُکھ بڑا جان لیوا ہوتا ہے ریحا۔ میری جان۔ اس دُکھ کو پالنے سے بہتر ہے انسان مر جائے۔ اس کے ساتھ ہی مر جائے جس کے بعد جینا موت سے بدتر ہو جاتا ہے۔“ سوجل نے اس کے بالوں میں منہ چھپا لیا اور سسک پڑی۔

”ماما۔“ ریحا اس سے لپٹ گئی۔ ”میں سمجھ گئی۔ میں سمجھ گئی ماما۔ اب کوئی خوف نہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔ میں سرمد کو بچا نہ سکی تو اس کے ساتھ مر تو سکتی ہوں ماما۔ یہی بہت ہے۔“

”کوئی ماں اپنی اولاد کے لئے ایسے شبد منہ سے نہیں نکالتی ریحا۔“ سوجل نے اس کا بالوں کو چوم کر کہا۔ ”مگر میں تمہیں دعا دیتی ہوں کہ تم اپنے پیار کو حاصل کر لو یا اس پر نثار ہو جاؤ۔“

”شکریہ ماما۔“ ریحا نے اس کے شانے پر بوسہ دیا۔ ”آپ کی دعا مجھے لگ گئی۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک سوجل کو کچھ یاد آ گیا۔ ”مانیا اور سرمد کا پاکستانی رشتہ دار کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”کشمیر پوائنٹ میں ماما۔“ ریحا نے کہا اور ایک دم ہڑبڑا کر اس سے الگ ہو گئی۔ ”ارے ساڑھے آٹھ ہو گئے۔ مجھے نو بجے ان کے پاس پہنچنا ہے۔“

”احتیاط سے جانا۔ رائے نے تمہارے پیچھے آدمی نہ لگا دیے ہوں؟“ سوجل نے تشویش سے کہا۔ ”اس سے کچھ بعید نہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں ماما۔ میں دھیان رکھوں گی۔“ وہ جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے بولی۔ ”پاپا ادھر کس وقت آئیں گے ناشتے کے لئے؟“

”ناشتہ تو وہ کر چکے بیٹی۔ اب تو گیارہ بجے کی چائے کے لئے آئیں گے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رائے کے لئے ادب کا صیغہ استعمال کرنا پڑا۔

”تب تک میں ویسے ہی لوٹ آؤں گی۔“ کہتے ہوئے اس نے پرس کندھے پر ڈالا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

''بھگوان تمہاری رکھشا کرے بیٹی۔'' سوجل نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا جہاں سے اپنی ٹوسیٹر کی طرف جاتی ریحا نظر آ رہی تھی۔

☆

نو بج کر تین منٹ پر ریحا' مانیا کے کمرے میں موجود تھی۔

سب سے پہلے اس نے انہیں سوجل سے ہونے والی اپنی گفتگو سے آگاہ کیا۔ آدیش کے ذکر پر وہ تینوں مسکرا دیے۔ اب وہ اسے کیا بتاتے کہ آدیش اس کے راستے کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے کا بیڑہ اٹھا چکا ہے۔ جب مانیا نے اسے گزشتہ رات کی آدیش سے ملاقات کے بارے میں مختصراً بتایا تو ریحا آنکھیں پھاڑے بے اعتباری سے سنتی رہی۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ قسمت نے اس کے لئے راہ یوں آسان کر دی ہے۔

''تو اس کا مطلب ہے آدیش ہماری پوری پوری سہایتا کرے گا؟'' اس نے مانیا کی جانب دیکھ کر سوال کیا۔

''بالکل۔'' مانیا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''پلان کے مطابق سرمد کے پاس سیل میں آدیش' پاپا' آپ اور مسٹر طاہر موجود ہوں گے؟'' ریحا نے مانیا سے پوچھا۔

''ہاں۔ رات ٹھیک سوا آٹھ بجے سیل کا خودکار سسٹم آف یا فیل کر دیا جائے گا۔ میں اور مسٹر طاہر آدیش کی طرف سے خطرے کا سگنل ملتے ہی کوٹھی میں داخل ہو جائیں گے اور سیدھے سیل میں پہنچ جائیں گے۔ آگے پھر جو ہو سو ہو۔''

''موجودہ پلان میں کامیابی کے نتیجے میں تین سوال پیدا ہوں گے مس مانیا۔'' طاہر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' مانیا اور ریحا اس کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

''نمبر ایک۔'' طاہر نے شہادت کی انگلی کھڑی کی۔ ''سرمد اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں ہے۔ ہم اسے لے کر کہاں جائیں گے؟''

''اس کے لئے ماما سے بات کی جا سکتی ہے۔'' ریحا نے جلدی سے کہا۔ ''وہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گی۔''

''اب دوسرا سوال۔ سرمد کو میں ہر صورت یہاں سے پاکستان لے جانا چاہتا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہو گا؟''

''اس پر بعد میں سوچیں گے مسٹر طاہر۔ پہلے سرمد کو وہاں سے نکال لیا جائے۔'' مانیا نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''اور تیسرا سوال یہ ہے کہ۔۔۔'' طاہر نے ریحا کی جانب دیکھا۔ ''آپ کا کیا ہو گا؟''

''مطلب؟'' ریحا نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ آپ اور آپ کی ماما پورے طور پر کرنل رائے کی دشمنی مول لے رہی ہیں۔ سرمد کے بعد آپ اور آپ کی ماما کا کیا بنے گا؟''

''پہلے سرمد صحیح سلامت سیل سے نکل آئے مسٹر طاہر۔ پھر ایک بار اس سے پوچھوں گی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا پسند کرے گا یا نہیں؟ اس کے جواب پر ہی میرے مستقبل کا دارومدار ہے۔'' ریحا نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

مانیا اور ریحا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ان تینوں نے اپنے اپنے موبائل کا وقت ملایا۔ ایک دوسرے کے نمبر فیڈ کیے۔ آدیش کا موبائل نمبر وہ رات ہی فیڈ کر چکے تھے۔ اب ریحا کو بھی وہ نمبر دے دیا گیا۔

تمام باتوں پر ایک بار پھر غور کیا گیا۔ کہیں جھول نظر نہ آیا تو ریحا ان سے رخصت ہو گئی۔ اس وقت دن کے دس بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔

☆

ہوٹل سے واپس آتے ہی ریحا نے سرمد کو وہاں سے لے جانے کے بارے میں سوجل سے بات کی تو اس نے اسے بے فکر ہو جانے کو کہا۔ راکیش کا ایک فلیٹ' جو اس نے اپنی زندگی میں سوجل کے نام خریدا تھا' اس کی چابی آج بھی سوجل کے پاس تھی اور اس بات کا کرنل رائے کو قطعاً علم نہیں تھا۔ ریحا نے اس فلیٹ کے بارے میں دن ہی میں مانیا کو فون کر کے بتا دیا تھا۔ دوسرے سوجل نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آج رات ہونے والے معرکے کے اختتام سے پہلے اپنے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ حالات اس وقت جو رخ اختیار کریں گے' اسے دیکھ کر ہی کوئی بھی قدم اٹھایا جائے گا۔

رات ٹھیک آٹھ بجے ریحا اور سوجل نے اپنے اپنے کمرے میں پہنچ کر بیڈ سنبھال لئے۔ یوں جیسے وہ سونے کی تیاری کر رہی ہوں۔ دونوں مرد ملازم کوارٹر میں جا چکے تھے اور ملازمہ آج ویسے ہی چھٹی پر تھی۔

ٹھیک اسی وقت طاہر اور مانیا سیتا مندر کے سامنے والے پارک کے گیٹ پر آ رکے۔ کار سے نکل کر وہ پارک میں گیٹ کے قریب ہی ایک بنچ پر آ بیٹھے۔ سردیوں کی وجہ سے پارک میں اکا دکا لوگ ہی رہ گئے تھے جو دور دور بیٹھے تھے۔

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر کرنل رائے کا ٹارچر سیل خالی ہو گیا۔ کسی شخص کے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہ ہوا کہ ان سب کو رخصت کیوں دی جا رہی ہے؟ وہ تو حکم کے غلام تھے۔ کرنل رائے نے جو کہہ دیا' اس پر عمل ان کی ڈیوٹی تھی۔ اس کے بارے میں ''کیوں'' کا لفظ ان کی ڈکشنری سے نکال دیا گیا تھا۔

آٹھ بج کر دس منٹ پر کیپٹن آدیش نے اپنے موبائل سیٹ کو ریڈی کر کے سامنے کی جیب میں ڈال لیا۔ اب اس کے صرف بٹن دبانے کی دیر تھی کہ مانیا کے سیٹ پر بیل ہو جاتی اور وہ اور طاہر خطرے سے آگاہ ہوتے ہی اس کی طرف چل پڑتے۔

آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر اس نے کرنل رائے کو لائن کلیر ہو جانے کی اطلاع دی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا اپنے آفس میں بیتابی سے ٹہل رہا تھا۔ کیپٹن آدیش کا پیغام سن کر اس نے ریسیور انٹرکام پر ڈالا۔ ہولسٹر میں ریوالور کو چیک کیا۔ سر پر کیپ جمائی اور دبے قدموں اپنی خوابگاہ کے دروازے پر پہنچا۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سوجل حسب عادت سونے کے لئے لیٹ چکی تھی۔ کمرے میں ہلکی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور سامنے کے کمرے کی کھڑکی پر پہنچا۔ جالی میں سے اندر جھانکا۔ یہ ریچا کا کمرہ تھا۔ وہ کمبل اوڑھے بیڈ پر سیدھی لیٹی کسی سوچ میں گم تھی۔ سینے پر ایک انگلش میگزین کھلا پڑا تھا۔ پُر اطمینان انداز میں سر ہلا کر کرنل رائے نے باہر کا راستہ لیا۔ دبے قدموں باہر آ کر اس نے برآمدے کی لائٹ بھی آف کر دی۔ چاروں اطراف تاروں کی باڑھ کے ساتھ برابر فاصلے پر آٹھ گارڈ مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ گیٹ پر اندر کی جانب آمنے سامنے کرسیوں پر گنیں سنبھالے دونوں فوجی خاموش بیٹھے تھے۔ سارے انتظام کا جائزہ لے کر وہ نیم اندھیرے میں کسی بدروح کی طرح ٹارچ سیل کی جانب روانہ ہو گیا۔

ادھر کرنل رائے نے ٹارچ سیل کے دروازے پر قدم روکا' ادھر سوجل اور ریچا نے کچن میں کھڑکی کے پاس کرسیاں ڈال لیں۔ اتنی ہی دیر میں ریچا نے کپڑے بدل لئے تھے۔ اب وہ کشمیری شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اندھیرے میں ڈوبے کچن کی کھڑکی سے ٹارچ سیل کا دروازہ کھلتا صاف نظر آ رہا تھا جس سے کرنل رائے داخل ہو رہا تھا۔

ادھر کرنل رائے نے سرمد والے کمرے میں قدم رکھا ادھر کیپٹن آدیش نے بڑی آہستگی سے مکینزم آف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سیل کے داخلی دروازے کا کمپیوٹرائزڈ سسٹم بیکار ہو گیا۔

کیپ سر سے اتار کر کرنل رائے نے میز پر پھینکی اور دیوار کے سہارے نیم دراز سرمد کی جانب بڑی سرد نظروں سے دیکھا۔ پھر کیپٹن آدیش کے سیلوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ سرمد نے نیم باز آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور اس کے ہونٹوں کی حرکت ہلکی سی مسکراہٹ میں بدل گئی۔

’’اس نے زبان کھولی یا نہیں؟‘‘ اچانک کرنل رائے دو تین قدم آگے بڑھ کر سرمد کے قریب چلا آیا۔

’’نو سر۔‘‘ کیپٹن آدیش اس کے پیچھے دو قدم کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔

’’ہوں۔‘‘ اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ’’بہت ڈھیٹ لگتا ہے۔‘‘

کیپٹن آدیش کا جسم تن گیا۔ اسے کرنل کے لہجے سے شر کی بو آ رہی تھی‘ جو کرسی پر پاؤں رکھے سرمد کی طرف جھک کر اسے بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

’’اسے کرسی پر بٹھاؤ کیپٹن۔‘‘ ایک دم کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

’’یس سر۔‘‘ کیپٹن آدیش نے جلدی سے کہا اور آگے بڑھ کر سرمد کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھانے لگا۔ بڑی آہستگی اور احتیاط سے اس نے سرمد کو کرسی پر بٹھایا‘ جو اپنے آپ حرکت کرنے سے بھی معذور تھا۔ اس کے زخم دوا سے محروم تھے۔ خون ہونٹوں‘ پیشانی اور جسم کے جوڑوں پر جم چکا تھا۔ جسم کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ہاتھوں اور پیروں کے زخم پھوڑوں کی طرح مواد سے بھرے لگ رہے تھے۔ حلقوں سے گھری آنکھوں کا ورم کسی حد تک کم ہو چکا تھا تاہم شیو ہو جانے کے باعث چہرہ اب صاف پہچان میں آ رہا تھا۔

اس کے گھٹنوں کے جوڑ کام نہیں کر رہے تھے۔ تشدد کے باعث وہ تقریباً بیکار ہو چکے تھے اس لئے وہ دونوں ٹانگیں سمیٹ نہ سکا اور آدیش نے اس کے چہرے پر پھیلتے کرب کے پیش نظر ٹانگوں کو کرسی کے دائیں بائیں پھیلا دیا۔ سرمد دونوں ہاتھوں سے سائڈز کو تھامے بڑی مشکل سے کرسی پر جما بیٹھا تھا۔ بخار سے پھنکتا ہوا جسم‘ درد سے کراہتا ہوا رواں رواں اور چکراتا ہوا دماغ۔ وہ تھوک نگل کر رہ گیا۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ کسی بھی لمحے کرسی سے گر جائے گا۔

’’تو تمہارا نام سرمد ہے؟‘‘ سگار کا دھواں اڑاتا کرنل رائے اس کی جانب پلٹا تو سرمد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ کیپٹن آدیش کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک ہی پل میں وہ سمجھ گیا کہ کرنل رائے سرمد کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا ہے۔

’’سرمد ہاشمی۔ باپ کا نام ڈاکٹر دلاور ہاشمی۔ لندن یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ اپنے خدا کے گھر گئے اور وہاں سے سیدھے ہماری گود میں آ رہے۔‘‘ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے کرنل رائے آہستہ آہستہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی سرد نظریں سرمد کی آنکھوں میں ایکسریز کی طرح اترتی جا رہی تھیں۔

’’ریحا کو کب سے جانتے ہو؟‘‘ اچانک اس نے پاؤں اٹھا کر سرمد کی ران پر رکھ دیا۔ وہ تکلیف سے کراہ کر رہ گیا۔

’’لندن سے۔‘‘ کرنل نے اس کی ران پر دباؤ بڑھا دیا۔ ’’ہے ناں؟‘‘ وہ پھر طنز سے بولا۔ ’’بہت چاہتی ہے وہ تمہیں؟ میری بیٹی ہو کر۔ ایک کٹر ہندو کی بیٹی ہو کر وہ ایک مسلمان آتنک وادی سے عشق کرتی ہے۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟‘‘ وہ چیخ پڑا۔

''آ۔۔۔۔۔ہ۔۔۔ آہ۔۔۔'' سرمد اس کا دباؤ اپنی ران پر مزید نہ سہہ سکا اور جل بن مچھلی کی طرح تڑپا۔ ایک دم کرنل رائے نے پاؤں اس کی ران سے اٹھایا اور کرسی کی سائڈ پر جمے سرمد کے بائیں ہاتھ پر ٹھوکر رسید کر دی۔ سرمد تڑپا اور مچل کر فرش پر گر پڑا۔ آدیش کانپ کر رہ گیا۔ اسے لگا کرنل نے یہ ٹھوکر سرمد کو نہیں' اسے ماری ہے۔

لوٹ پوٹ ہوتا سرمد کسی نہ کسی طرح سیدھا ہوا اور کراہتا ہوا کرسی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا چہرہ اور اب جسم بھی پسینہ میں بھیگنے لگا تھا۔ درد کے آثار اس کی کراہوں سے نمایاں تھے۔

''کیا تم بھی ریحا کو چاہتے ہو؟'' ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر کرنل رائے اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہندو ہے۔ کیا تم اس سے پیار کرتے ہو؟''

جواب میں سرمد نے اسے بڑی درد بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور لگتا تھا اس کا حلق پیاس کے مارے خشک ہو چکا ہے۔

''نہیں ناں؟'' کرنل رائے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا ہی ہونا چاہئے۔'' وہ جیسے اسے سمجھانے لگا۔ ''وہ ہندو ہے۔ تم ملیچھ مسلمان۔ اسے تم سے پیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم سے نفرت کرتی تو کوئی بات بھی تھی۔ اس نے جرم کیا ہے۔ تم سے محبت کا جرم۔ مگر سزا اسے نہیں' تمہیں ملے گی۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ تم مسلمان ہو۔ ملیچھ مسلمان۔'' نفرت سے کرنل کا چہرہ بگڑ گیا۔ ایک دم اس نے جلتا ہوا سگار سرمد کے سینے پر رکھ کر زور سے دبا دیا۔ کراہتے ہوئے سرمد کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ وہ معذوروں کی طرح اپنے کانپتے ہوئے زخمی ہاتھوں سے کرنل رائے کا سگار پرے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی چراند پھیل گئی۔ کیپٹن آدیش نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کیا کرے؟ اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ کیا مانیا اور طاہر کو بیل کر دے؟ ابھی وہ اسی ادھیڑبُن میں تھا کہ کرنل رائے کی بھیڑیے جیسی غراتی ہوئی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''تم سے نفرت ہر ہندو کا دھرم ہے۔ ہاں۔ ایک صورت ہے کہ تم سزا سے بچ جاؤ۔ سزا سے بچ بھی جاؤ اور انعام کے حقدار بھی ہو جاؤ۔ ریحا جیسی خوبصورت لڑکی' آزادی اور لاکھوں کروڑوں روپے کے انعام کے حقدار۔ بولو کیا یہ سب پانا چاہو گے؟'' اس نے سگار ہٹا لیا۔ سرمد کا سینہ بری طرح جل گیا تھا۔ زخم سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ وہ یوں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دور سے بھاگتا آیا ہو۔ اس کا جسم اب پوری طرح پسینے میں تر تھا اور چہرے پر تو جیسے کسی نے پانی کا جگ انڈیل دیا ہو۔

بُت بنا کیپٹن آدیش سب سن رہا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کرنل رائے کرنا کیا چاہتا ہے؟ کہنا کیا چاہتا ہے؟ اس کی ہر بات دوسری بات کی ضد تھی۔

''اپنا دھرم چھوڑ دو۔'' کرنل رائے نے کرسی کے سہارے بیٹھے سرمد کے سامنے تن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز تھی یا بجلی کا کڑاکا۔ ایک دم سرمد کا سانس رک گیا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ وہ کرنل کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

''ہندو ہو جاؤ۔'' کرنل نے یوں کہا جیسے اسے لالی پاپ دے رہا ہو۔ ''ریحا بھی مل جائے گی۔ آزادی بھی اور دولت بھی۔ بولو۔ کیا کہتے ہو؟''

سرمد چند لمحے کرنل رائے کو دیکھتا رہا۔ ساری تکلیف' ساری اذیت' سارا درد جیسے اس کے حواس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

''زیادہ مت سوچو۔ سوچو گے تو بہک جاؤ گے۔ ہاں کر دو۔ ہاں کہہ دو۔ تمہارا صرف ''ہاں'' کا ایک لفظ تمہاری ساری اذیتوں کا خاتمہ کر دے گا۔ اور ایک ''نہ'' کا لفظ تم پر نرک کے دروازے کھول دے گا' یہ مت بھولنا۔'' کرنل اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہے جا رہا تھا۔

''کیا کہا تم نے؟'' اچانک سرمد نے اس کی جانب کانپتی ہوئی انگلی اٹھائی۔

کرنل نے اس کے طرزِ تخاطب پر اسے چونک کر دیکھا۔ کیپٹن آدیش کا بھی یہی حال ہوا۔ جب سے وہ ان کے ہاتھ لگا تھا' تب سے آج وہ پہلی بار بولا تھا۔۔۔ اور یوں بولا تھا کہ کیپٹن آدیش حیرت زدہ رہ گیا اور کرنل رائے کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

''بہرے نہیں ہو تم۔ میں نے جو کہا تم نے اچھی طرح سنا ہے۔'' کرنل رائے نے اسے گھورتے ہوئے دانت بھینچ لئے۔

''ہاں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم بار بار یہ ناپاک الفاظ دہراؤ اور میں بار بار انکار کروں۔ تم اپنے باطل دھرم کا لالچ دو اور میں اپنے سچے اللہ کی وحدانیت بیان کرتے ہوئے' اس کے پسندیدہ دین کے اظہار کے لئے اپنی زبان پر وہ الفاظ بار بار سجاؤں جو اسے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ قل ھو اللہ احد. اللہ الصمد . لم یلد ولم یولد . ولم یکن لہ' کفواً احد۔''

الفاظ کیا تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کرنل رائے کے کانوں میں اترتا چلا گیا۔ آتش فشاں کا لاوا تھا جو اسے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ بھڑکتا ہوا الاؤ تھا جس میں اس کی ساری نرمی' سارا فریب' سارا بطلان جل کر خاک ہو گیا۔

''کیا کہا تم نے؟'' آگ بگولہ ہوتے کرنل رائے کے ہونٹوں سے پاگل کتے کی طرح کف جاری ہو گیا۔

''قل ھو اللہ احد۔'' سرمد نے اس طرح مسکرا کر جواب دیا' جیسے کسی بچے کی ضد پر اسے دوبارہ بتا رہا ہو۔ ''اس

نے اپنے حبیب کریم ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان کافروں اور مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اسے کسی نے جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ اور اس ''احد'' کا کوئی ہمسر نہیں۔''

''بکومت۔۔۔'' کرنل رائے غصے میں دیوانہ ہو کر سرمد پر پل پڑا۔ لاتیں، ٹھوکریں، گھونسے، مغلظات۔ ایک طوفان غیظ و غضب تھا سرمد جس کی لپیٹ میں آ گیا۔ کیپٹن آدلیش جو سرمد کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ کے سحر میں گرفتار تھا، ایک دم کرنل رائے کے چیخنے چلانے اور سرمد پر ٹوٹ پڑنے پر گھبرا کر ہوش میں آ گیا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا، ایک دم اس نے اوپری جیب میں پڑے موبائل کا بٹن دبا دیا۔

''اللہ ایک ہے۔'' سرمد مسکرائے جا رہا تھا۔ اس پر جیسے کرنل رائے ٹھوکریں، لاتیں اور گھونسے نہیں، پھول برسا رہا تھا۔ اذیت جیسے محسوس ہی نہ ہو رہی تھی۔ اس کی ہر چوٹ کے جواب میں سرمد ایک ہی بات کہتا:

''قل ھو اللہ احد۔ اللہ ایک ہے۔''

اس کے ہر بار کہے ہوئے یہ الفاظ کرنل رائے کے غصے اور دیوانگی میں مزید اضافہ کر دیتے۔ وہ اور بھی شدت سے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیتا۔ کیپٹن آدلیش بے بسی سے ادھر ادھر قدم پھینک رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ کسی طرح سرمد کو بچا لیتا مگر اس وقت تو کرنل پاگل کتے کی طرح قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کے راستے میں آنا خود کو عتاب کے حوالے کر دینے والی بات تھی۔

''سر۔۔۔'' اچانک اس نے آگے بڑھ کر کرنل رائے سے کہا۔ ''سر۔۔۔ یہ بیہوش ہو چکا ہے۔'' اور کرنل رائے کے ہاتھ پاؤں اور زبان ایک دم یوں رک گئی جیسے کسی نے اس کا بٹن آف کر دیا ہو۔

''مگر۔۔۔ اس کی زبان۔۔۔ اس کی زبان۔۔۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو۔۔۔ وہ تو چل رہی ہے۔''

کیپٹن آدلیش نے کرنل کے سرمد کی طرف دراز بازو کے ہدف کو تاکا۔ واقعی سرمد کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ سرگوشی کے انداز میں آواز ابھر رہی تھی۔

''قل ھو اللہ احد۔۔۔ قل ھو اللہ احد۔۔۔ قل ھو اللہ احد۔'' وہ ہولے ہولے پکار رہا تھا۔ بتا رہا تھا۔ سنا رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا۔

''یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے سر۔'' آدلیش نے دزدیدہ نگاہوں سے شیشے کے پار دیکھا۔ کاریڈور خالی تھا مگر کسی بھی لمحے طاہر اور مانیا وہاں نمودار ہو سکتے تھے۔ اس نے کنکھیوں سے کرنل کے ہولسٹر پر نظر ڈالی، جس کا بٹن کھلا ہوا تھا۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔'' کٹکھنے کتے کی طرح کرنل غرایا۔

''یس۔۔۔ یس سر۔'' آدلیش نے ہکلا کر کہا اور میز پر پڑے پانی کے جگ کی طرف بڑھ گیا۔

☆

”یہ کون لوگ ہیں؟“ نیم روشن میدان میں دو سایوں کو ٹارچ سیل کی جانب بڑھتے دیکھ کر سوجل چونکی۔ ریحا پہچان چکی تھی۔

”ماما۔ یہ مسٹر طاہر اور مس مانیا ہیں۔ اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ ماما۔“

”کیا ہوا ریحا؟ بات کیا ہے؟“ سوجل نے اسے بے چین دیکھ کر پوچھا۔

”ماما۔“ ریحا نے ہاتھ جھٹکے۔ ”میں نے بتایا تو تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ اگر اندر خطرہ ہوا تو کیپٹن آدیش مس سونیا کو الرٹ کرے گا اور وہ اس کا دیا ہوا انٹری پاس دکھا کر ٹارچ سیل میں داخل ہو جائیں گے۔ خطرہ ماما۔۔۔ خطرہ۔“

”تو چلو۔ جلدی کرو بیٹی۔“ سوجل نے اپنے پاس رکھا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔ ”آؤ۔ ہمیں بھی وہاں چلنا چاہیے۔“

”مگر ماما۔ گارڈز۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”آ جاؤ۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ گارڈز کی نظروں سے بچ کر ہمیں وہاں پہنچنا ہوگا۔“ سوجل کچن کے دروازے کی جانب لپکی۔ ریحا اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔

☆

”سر۔ اس میں پانی نہیں ہے۔“ کیپٹن آدیش نے خالی جگ اٹھا کر کرنل رائے کو دکھایا۔ ”میں پانی لے کر آتا ہوں۔“ وہ جلدی سے کمرے کے کونے میں بنے باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

”ڈیم فول۔“ کرنل اسے قہر سے گھورتا رہ گیا۔ پھر بجھا ہوا سگار دیوار پر کھینچ مارا۔

”قل ھو اللہ احد۔“ اچانک سرمد کی آواز بلند ہوگئی۔ وہ کراہتا ہوا ان الفاظ کا جیسے ورد کر رہا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں بار بار فرش پر گر پڑتے سرمد کے لہولہان جسم کو دیکھ کر کرنل رائے کا پارہ ایک بار پھر چڑھ گیا۔

”ملیچھ۔“ اس نے سرمد کے زخمی گھٹنے پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ جواب میں چیخ یا کراہ کے بجائے سرمد کے لبوں سے رک رک کر نکلا۔

”قل۔۔۔ ھو اللہ۔۔۔ احد۔۔۔ لا الٰہ۔۔۔ الا اللہ۔۔۔ محمد۔۔۔ رسول اللہ۔“ اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”تو تیری زبان بند نہیں ہوگی۔“ غصے میں کھولتے ہوئے کرنل رائے نے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ سیفٹی کیچ ہٹایا اور سرمد کے سینے کا نشانہ لیا۔

”قل۔۔۔ ھو اللہ۔۔۔ احد۔“ سرمد کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ابھری۔

”آخری بار کہہ رہا ہوں مُسلے۔“ کرنل رائے کے دل میں نجانے کیا آئی۔ ”ہماری طرف لوٹ آ۔ میں تیری سب سزائیں ختم کر دوں گا۔“ اس کی انگلی ٹریگر پر جم گئی۔

”قل ھو اللہ احد۔“ سرمد اب بھی مسکرا رہا تھا۔ ”اللہ الصمد۔“ اس کی آواز بلند ہوگئی۔

کرنل رائے کی انگلی ٹریگر پر دب گئی۔

دو بار۔

مگر دھماکے تین ہوئے۔

پہلے دو دھماکوں نے سرمد کا سینہ چھلنی کر دیا۔

تیسرے دھماکے نے کرنل رائے کا ہاتھ اڑا دیا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

ایک ہچکی لے کر سرمد کا جسم جھٹکے سے ساکت ہو گیا مگر اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے۔ ”قل ھو اللہ احد۔ قل۔۔۔ ھو اللہ۔۔۔ احد۔۔۔“

کرنل رائے کے ہونٹوں سے بڑی مکروہ چیخ خارج ہوئی اور وہ اپنا خون آلود ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبائے تڑپ کر پلٹا۔

”تم۔۔۔“ اس نے دروازے سے اندر داخل ہوتے طاہر اور مانیا کو دیکھا جو تیزی سے فرش پر بے سدھ پڑے سرمد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر اس کی نظر باتھ روم کے دروازے کے پاس کھڑے آدلیش پر جم گئی جو اس پر ریوالور تانے کھڑا بڑی سرد نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے مجھ پر گولی چلائی۔۔۔؟“ اسے کیپٹن آدلیش پر یقین نہ آ رہا تھا۔

جواب میں کیپٹن آدلیش نے پاؤں کی ٹھوکر سے اس کا ریوالور دور پھینک دیا۔ مگر نہیں۔ دور نہیں۔ ریوالور شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہوتی سوجل کے پاؤں سے ٹکرا کر رک گیا جسے اس نے اٹھا لیا۔

اسی وقت ریحا ماں کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی اندر آئی اور فرش پر پڑے سرمد کی طرف بھاگتی چلی گئی جس کا سر طاہر نے گود میں لے رکھا تھا اور مانیا جسے وحشت آلود نگاہوں سے تک رہی تھی۔

”سرمد۔۔۔“ ریحا گھٹنوں کے بل اس کے قریب جا بیٹھی اور اس کے زخم زخم جسم کو دیکھ کر بلکنے لگی۔ اس کے لبوں سے سوائے ”سرمد۔ سرمد“ کے کچھ نہ نکل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو دھاروں دھار بہہ رہے تھے۔

سوجل نے کرنل رائے کا ریوالور تھام لیا اور کیپٹن آدلیش اسے کور کیے ہوئے تھا۔ کرنل اس طرح کمرے میں پیدا ہو جانے والی صورتحال کو جانچ رہا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

☆

”سرمد۔۔۔“ طاہر نے اس کے خون آلود چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ سرمد کی یہ حالت اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔ سینے کا زخم اتنا گہرا تھا کہ خون مانیا کے روکے نہ رکا۔

”مسٹر طاہر۔“ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”لگتا ہے بارود نے سینہ چیر کر رکھ دیا ہے۔ خون رک ہی نہیں رہا۔“ مانیا نے اپنی شال پھاڑ کر زخم پر پٹی باندھتے ہوئے اسے بتایا۔

”سرمد۔۔۔“ ریحا سرمد کو والہانہ دیکھے جا رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ ”میرے سرمد۔ آنکھیں کھولو۔ آنکھیں کھولو سرمد۔“

پھر اسے محسوس ہوا جیسے سرمد کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی ہو۔ اس نے وحشت بھری نظروں سے طاہر اور مانیا کی جانب دیکھا۔ ”یہ۔۔۔ یہ کچھ کہہ رہا ہے مسٹر طاہر۔“ اور طاہر نے جلدی سے اس کے لبوں کے ساتھ اپنا کان لگا دیا۔

”قل۔۔۔ ھواللہ۔۔۔ احد۔۔۔ قل ھواللہ۔۔۔ احد۔“ سرمد کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

”سرمد۔۔۔“ طاہر نے اس کا خون آلود ماتھا چوم لیا اور اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ گرم گرم آنسو سرمد کے چہرے پر گرے تو ایک دو لمحوں کے بعد اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

”تم۔۔۔؟“ بمشکل دھندلائی ہوئی نظروں سے اس نے طاہر کو پہچانا تو اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ مسرت نمایاں ہوئی۔ ”یہاں۔۔۔ مگر کیسے؟“

”کچھ مت بولو سرمد۔“ طاہر نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر مانیا کی جانب دیکھا۔ ”مس مانیا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد۔۔۔“ اس کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے مانیا نے کرنل رائے پر ریوالور تانے کیپٹن آدیش کی طرف نظر اٹھائی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا‘ سرمد کی نگاہ روتی ہوئی ریحا پر پڑ گئی۔

”ارے تم۔۔۔ ریحا۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”چلو اچھا ہوا۔ سب اپنے اکٹھے ہو گئے۔“ اس کی آواز میں نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔

”یہاں سے انہیں اس حالت میں باہر لے جانا ممکن نہیں ہے دیدی۔“ کیپٹن آدیش نے بیچارگی سے کہا۔

”ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔“ اسی وقت کرنل رائے کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ ”یہاں سے تم لوگ زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔۔۔ اور کیپٹن آدیش۔۔۔ تمہیں تو میں کتے کی موت ماروں گا۔“ اس کی قہر آلود نظریں آدیش پر چنگاریاں برسانے لگیں‘ جس نے اسے ریوالور کے اشارے پر دیوار سے لگ کر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

جواب میں آدیش خاموش رہا تو اس نے نظروں کا ہدف سوجل کو بنا لیا۔ ”تم ریوالور ہاتھ میں لئے چپ چاپ کھڑی ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے تم بھی ان کے ساتھ ہو۔ ایک ہندو پتنی اپنے پتی کے دشمنوں سے مل کر اسے مارنے کے درپے ہے۔ بچ تم بھی نہیں سکو گی سوجل۔“ وہ دانت پیستے ہوئے خاموش ہو گیا۔ سوجل اسے سرد نظروں سے گھورتی رہ گئی۔

”سرمد۔۔۔“ طاہر بے چین ہوا جا رہا تھا۔ ”کچھ کرو مس مانیا۔ کیپٹن آدیش۔“

”ماما۔“ اچانک ریحا اٹھی اور ماں کی طرف بڑھی۔ ”ماما۔ اسے بچا لو ماما۔ اسے بچا لو۔ میرے سرمد کو بچا لو۔“

”مجھے کچھ سوچنے دو ریحا۔“ سوجل نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”گھبراؤ نہیں طاہر۔“ سرمد نے اس کے ہاتھوں میں دبا اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ اس کی بار بار بند ہوتی آنکھیں

اور چھل چھل بہتا خون طاہر کو اس کی لمحہ بہ لمحہ قریب آتی موت کی خبر دے رہے تھے۔ ''میں جانتا ہوں میرے جانے کا وقت آ چکا ہے۔'' وہ ہولے ہولے بولا۔ ''یہ تو پگلی ہے۔ میری تکلیف سے دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔ نہیں جانتی' میں نے کس مشکل سے اپنی منزل پائی ہے۔ اب تم لوگ مجھے دوبارہ کانٹوں میں مت گھسیٹو یار۔''

''سرمد۔۔۔'' طاہر سسک کر بولا۔ اسی وقت ریحا ان کے قریب لوٹ آئی۔ مانیا نے پرے ہو کر اسے جگہ دی تو وہ سرمد کا دوسرا ہاتھ تھام کر فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور اسے پاگلوں کے انداز میں تکنے لگی۔ بار بار وہ ہچکی لیتی اور معصوم بچوں کی طرح سسکی بھر کر رہ جاتی۔

''اچھا طاہر۔۔۔ میرے بھائی۔ میرے دوست۔۔۔ اب جانے کا لمحہ آن پہنچا۔ میرے پاپا کا خیال رکھنا۔ اگر ہو سکے تو مجھے پاکستان لے جانا۔ اور اگر ایسا ہو سکا تو میرے پاپا سے کہنا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ میں عمرے کے بعد لندن واپس نہیں گیا۔ پاکستان آیا ہوں۔ بس ذرا سفر طویل ہو گیا۔ میں نے انہیں دُکھ دیا ہے طاہر۔ بہت دُکھ دیا ہے۔ میری طرف سے ان سے معافی مانگ لینا۔'' وہ آنکھیں بند کر کے ہانپنے لگا۔

طاہر اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگائے خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی برستی آنکھیں اس کے جذبات کا آئینہ تھیں۔

''ریحا۔۔۔'' ذرا دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ ''میں تم سے کیا ہوا کوئی وعدہ نبھا نہیں سکا۔ برا نہ ماننا۔ وقت ہی نہیں ملا۔''

''سرمد۔۔۔'' ریحا پچھاڑ کھا کر رہ گئی۔ کیسی بے بسی تھی کہ وہ اسے بچانے کی اک ذرا سی بھی کوشش نہ کر سکتے تھے۔ بیچارگی نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ زخمی ہاتھ بغل میں دبائے کرنل رائے ان کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے اپنے انجام کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ سب اس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

''کچھ اور کہو سرمد۔'' اچانک طاہر نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کا لہجہ بیحد عجیب ہو رہا تھا۔ مانیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا کہوں طاہر۔ کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں۔'' نقاہت سے اس کی آواز ڈوب گئی۔ ''ہاں۔ ایک کام ہے اگر تم کر سکو۔''

''کہو سرمد۔ میری جان۔'' طاہر بیتاب ہو گیا۔

''یہ۔۔۔'' اس نے اپنی اوپری جیب کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس جیب میں میرے آقا ﷺ کے دیار کی خاک ہے۔ اسے میری قبر کی مٹی میں ملا دینا۔ جنت کی مہک میں سانس لیتا رہوں گا قیامت تک۔ کر سکو گے ایسا؟''

''کیوں نہیں سرمد۔'' طاہر نے اس کے سر کے بالوں کو چوم لیا۔ ''ایسا ہی ہو گا۔ مگر کچھ اور بھی ہے سرمد جو تم

بھول رہے ہو۔" طاہر نے اس کے گال پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایک ہستی اور ہے جس کے لئے تمہارا پیغام میں امانت کی طرح پلکوں پر سجا کر لے جا سکتا ہوں۔"

"شش۔۔۔" سرمد نے اس سے ہاتھ چھڑایا اور ہونٹوں پر رکھ دیا۔ "کبھی ایسا خیال دل میں بھی نہ لانا طاہر۔ میرے لئے وہ نام اتنا پرایا ہے کہ میں اسے زبان پر لاؤں گا تو اللہ کا مجرم ٹھہروں گا۔ اتنا محترم ہے کہ اس کے باعث اللہ نے مجھے اپنے حضور طلب فرما لیا۔ اور کیا چاہئے؟ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" پھر اس نے نظروں کا محور کرنل رائے کو بنا لیا۔ "شرک کے اس پتلے نے مجھے اپنے اللہ سے برگشتہ کرنے کے لئے ریحا سے لے کر آزادی اور دولت کا جو لالچ دیا' وہ کسی بھی سرمد کو بہکانے کے لئے کافی تھا مگر میں اس پکار کا کیا کروں طاہر جو میرے رگ و پے میں خون بن کر دوڑتی ہے۔ قل۔۔۔ ھو اللہ۔۔۔ احد۔" اچانک سرمد کی سانس اکھڑ گئی۔

"سرمد۔۔۔" طاہر اور ریحا اس پر جھک گئے۔ "بس طاہر۔ بس ریحا۔ الوداع۔۔۔" اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ جسم میں ایک دم تیز حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ "میرے اللہ گواہ رہنا۔ میں نے عشاق کا نام بدنام نہیں ہونے دیا۔۔۔ یہ تیری دی ہوئی توفیق ہے۔ تیرے حبیب پاک اور میرے آقا ﷺ کا صدقہ ہے۔ قل ھو اللہ احد۔" اس کی آنکھیں مند گئیں۔

"سرمد۔۔۔" طاہر نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"سرمد۔۔۔" ریحا اس کے چہرے پر جھک گئی۔

"قل ھو اللہ احد۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔" سرمد کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں وا ہوئے۔

"صلی اللہ علیہ وسلم۔" مسکراہٹ مہک اٹھی۔ ایک دم کمرے میں خوشبو کے جھونکوں داخل ہوئے۔ سرمد کی نظریں اپنے سامنے دیوار کی جانب یوں جم گئیں جیسے وہ کسی کو دیکھ رہا ہو۔ مگر کسے؟ کسے دیکھ رہا تھا وہ' جس کے دیدار نے اس کی آنکھوں میں مشعلیں روشن کر دی تھیں۔ چہرے پر عقیدت و احترام کی سرخیاں جھلملا دی تھیں۔ ایک گہرا سانس' اطمینان بھرا سانس اس کے ہونٹوں سے خارج ہوا۔ لرزتے ہوئے دونوں ہاتھ آپس میں کسی کو تعظیم دینے کے انداز میں جُڑے۔۔۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" لبوں پر مہکا اور سرمد کے مسکراتے ہونٹ ساکت ہو گئے۔

خوشبو ان کے گرد لہراتی رہی۔ سرمد کو لوریاں دیتی رہی۔ اور وہ سو گیا۔ کسی ایسے معصوم بچے کی طرح جسے اس کا من پسند کھلونا مل جائے اور وہ اسے باہوں میں لے کر نیند کی وادیوں میں اتر جائے۔

☆

کمرے میں عجیب سا سکوت طاری تھا۔

کرنل رائے اس انوکھی مہک کے آنے' کمرے میں پھیلنے اور پھر آہستہ آہستہ ناپید ہو جانے کا گواہ تھا مگر ذہنی کج روی اور فطری ہٹ دھرمی اسے اس کے اقرار سے روک رہی تھی۔

طاہر نے دھیرے سے سرمد کو باہوں میں اٹھایا اور میز پر لٹا دیا۔ کیپٹن آدیش اب بھی کرنل رائے کو کور کئے کھڑا تھا' مگر اس کے رخساروں پر آنسو کیوں بہہ رہے تھے۔ وہ خود نہ جانتا تھا۔ یا شاید جانتا تھا' بتا نہ سکتا تھا۔

دل گرفتہ مانیا نے ریحا کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ چھڑا کر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی اور میز سے نیچے لٹکتے سرمد کے پیروں سے جا لپٹی۔ خون آلود زخم زخم پیروں کو بوسے دیتی دیتی وہ میز کے ساتھ ماتھا ٹکا کر یوں بے سدھ ہو گئی کہ سرمد کے دونوں پاؤں اس کے سینے کے ساتھ بھینچے ہوئے تھے۔

سوجل ویران ویران آنکھوں سے ریحا اور سرمد کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نظر کرنل رائے پر آ کر جم گئی۔

”بہت دیر ہو گئی کرنل رائے۔“ اچانک اس نے بڑی سرد آواز میں کہا تو کرنل رائے اس کی جانب متوجہ ہوا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نجانے کیا ہوا کہ کرنل نے گھبرا کر نظریں پھیر لیں۔

”نظریں نہ چراؤ کرنل۔ میں صرف ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں۔ راکیش کا قتل تم نے کرایا تھا؟ ہاں یا نہیں۔“

کرنل رائے نے پھر چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”ہاں یا نہیں؟“ سوجل نے اس کا ریوالور اسی پر تان لیا۔

”تم پاگل ہو سوجل۔“ گھبرا کر کرنل رائے نے کہا۔

”ہاں یا نہیں کرنل۔“ سوجل نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

”میں اسے کیسے قتل کرا سکتا تھا سوجل۔ میری اس سے کیا دشمنی تھی؟“ اس کی آواز میں خوف ابھر آیا۔

”دشمنی کا نام سوجل ہے کرنل رائے۔ آج میں اس دشمنی ہی کو ختم کر دوں گی مگر اپنے راکیش کے پاس جانے

سے پہلے جاننا چاہتی ہوں کہ تم گناہ گار ہو یا بے گناہ؟“

”میں بے گناہ ہوں سوجل۔“ زخمی ہاتھ اٹھا کر حلف دینے کے انداز میں کرنل رائے نے جلدی سے کہا۔

”بہت بزدل ہو تم کرنل رائے۔“ سوجل کے ہونٹوں پر بڑی اجڑی مسکراہٹ ابھری۔ ”آخری وقت میں بھی جھوٹ بول رہے ہو۔“

”آخری وقت؟“ ہکلا کر کرنل رائے نے کہا۔

”ہاں۔“ ”تم راکیش کے قاتل ہو یہ بات تم مان لیتے تو شاید میں تمہیں زندہ چھوڑ دیتی مگر۔۔۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں اقرار کرتا ہوں سوجل کہ میں نے راکیش کا قتل کرایا تھا مگر صرف تمہاری محبت کے سبب۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا سوجل۔ اسی لئے میں نے راکیش کو راستے سے ہٹا دیا۔“

”شکر ہے بھگوان کا۔“ سوجل نے ایک پل کو آنکھیں بند کیں اور دھیرے سے کہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور کرنل رائے کی جانب بڑی سرد نگاہی سے دیکھا۔

”اب تو تم مجھے نہیں مارو گی سوجل؟“ اس نے لجاجت سے پوچھا۔

”تم نے میری پوری بات سنے بغیر ہی اپنے جرم کا اقرار کر لیا رائے۔“ سوجل بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں کہہ رہی تھی کہ شاید میں تمہیں زندہ چھوڑ دیتی مگر۔۔۔ تم نے میرے راکیش کی نشانی، میری بیٹی ریحا کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین کر اپنا قتل مجھ پر لازم کر لیا ہے۔“

پھر اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکتا، پے در پے چھ دھماکے ہوئے۔ کرنل رائے کا گول مٹول جسم اچھل اچھل کر گرتا رہا۔ چوتھے فائر پر اس نے دم توڑ دیا مگر سوجل نے ریوالور خالی ہونے پر ہی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر ختم کیا۔ حیرت زدہ ڈرے ہوئے، فرش پر آڑے ترچھے لہولہان پڑے کرنل رائے کی بے نور آنکھیں سوجل پر جمی ہوئی تھیں، جس کا ریوالور والا ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں لٹک گیا تھا۔ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی نہ اسے روکنا چاہا۔

دھماکوں کی بازگشت ختم ہوئی تو کیپٹن آدیش نے بھی غیر شعوری انداز میں ریوالور ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ لڑکھڑایا اور دیوار سے جا لگا۔

طاہر میز پر دونوں ہاتھ ٹیکے سر جھکائے سسک رہا تھا۔ پھر مانیا آئی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر رو دی۔ سوجل تھکے تھکے انداز میں آگے بڑھی اور ایک کرسی پر گر کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ کیپٹن آدیش کی سسکیاں طاہر اور مانیا کا ساتھ دے رہی تھیں اور ریحا سرمد کے پیروں سے لپٹی خاموش بیٹھی تھی۔

☆

کتنی دیر گزری' کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔

وہ سب چونکے تو اس وقت جب اچانک سیل کی سیڑھیاں بھاری اور تیز تر قدموں کی دھڑ دھڑاہٹوں سے گونج اٹھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے' کتنی ہی لوہے کی نالیاں انہیں اپنے نشانے پر لے چکی تھیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔

طاہر نے ان کی جانب دیکھا۔ وہ تعداد میں بیس سے کم نہ تھے۔ کچھ کمرے میں اور باقی کاریڈور میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر فوجی وردیاں اور سروں پر سفید رومال بندھے تھے۔ وہ یقیناً بھارتی فوجی نہیں تھے۔

سب سے اگلا شخص' جو ان کا لیڈر لگتا تھا' اس کی عقاب جیسی نگاہوں نے ایک ہی بار میں پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ مردہ کرنل رائے کو دیکھ کر وہ ایک پل کو حیران ہوا' پھر اس کی نگاہیں میز پر پڑی سرمد کی لاش پر آ کر جم گئیں۔ ایک پل کو اس کی نظروں میں اضطراب نے جنم لیا پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ سرمد کو بے حس و حرکت پا کر اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''ہمیں دیر ہو گئی۔'' آہستہ سے وہ بڑبڑایا۔ پھر اس کی نگاہوں میں آگ سی دہک اٹھی۔

''یہ۔۔۔'' اس نے سرمد کی جانب اشارہ کیا اور تھرتھراتی آواز میں کہا۔ ''کس نے جان لی اس کی؟'' اس کا سوال سب سے تھا۔

''سب کچھ بتایا جائے گا۔ پہلے تم بتاؤ۔ تم کون ہو؟'' طاہر نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''تم مجھے ان میں سے نہیں لگتے۔'' وہ طاہر کی طرف پلٹا۔

''تم بھی مجھے اپنوں میں سے لگتے ہو۔ میرا نام طاہر ہے۔ اب تم بتاؤ۔ کون ہو تم؟'' طاہر اس کے قریب چلا آیا۔

''یہ بتانے کا حکم نہیں ہے۔ تم کہو اس کے کیا لگتے ہو؟''

''یہ بھائی ہے میرا۔'' طاہر نے سرمد کی طرف بڑے درد بھرے انداز میں دیکھا۔ ''اسے ڈھونڈ تو لیا مگر بچا نہ سکا۔''

''غم نہ کرو۔'' اس نے طاہر کے شانے کو گرفت میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''وہ شہید ہوا ہے۔۔۔ شہید۔۔۔'' آنکھیں بند کر کے اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''کاش اس کی جگہ میں ہوتا۔'' اس کے لہجے میں حسرت در آئی۔

''یہ باقی سب کون ہیں اور اس کتے کو کس نے مارا؟'' اس نے نفرت سے فرش پر پڑے کرنل رائے کو دیکھا۔

''یہ سب اپنے ہیں۔'' طاہر نے کیپٹن آدلیش سمیت سب کی گواہی دی۔ ''اور اسے۔۔۔'' اس کی نظر کرنل رائے کی لاش تک پہنچی۔

''میں نے مارا ہے اسے۔'' اچانک سوجل بول اٹھی۔ ''اس کی بیوی ہوں میں۔''

''مگر تم تو کہہ رہے تھے یہاں سب اپنے ہیں۔'' وہ حیرت سے طاہر کی جانب مڑا۔

''ہاں۔ میں نے سچ کہا ہے۔'' طاہر نے پھر کہا۔ ''صرف ایک ہی بیگانہ تھا یہاں۔'' اس نے کرنل رائے کی جانب اشارہ کیا۔

''ہمارے پاس بحث کرنے کا وقت ہے نہ عورتوں پر ہاتھ اٹھانا ہمارا مسلک ہے۔ ہم سرمد کو لینے آئے تھے۔ لے کر جا رہے ہیں۔ تم میں سے جو ساتھ چلنا چاہے' چل سکتا ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''مگر کسی غیر مسلم کو ہم ساتھ نہیں لے جا سکیں گے۔''

''سرمد کا کوئی رشتہ دار غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔'' طاہر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''میں اس کا بھائی ہوں۔ یہ۔۔۔'' اس نے ریحا کی جانب اشارہ کیا جو سرمد کے پیروں سے لپٹی ویران ویران نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔ ''یہ اس کی منگیتر ہے۔۔۔ اور یہ۔۔۔'' اس نے کیپٹن آدلیش کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

''میں سرمد کا دوست ہوں۔ یہ وردی ان میں شامل ہونے کے لئے ضروری تھی۔'' اس نے سر سے کیپ اتاری اور دور پھینک دی۔ پھر شرٹ بھی اتار ڈالی۔ اب وہ سیاہ جرسی اور خاکی پینٹ میں تھا۔

بے اختیار طاہر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بازو دراز کیا۔ آدلیش لپک کر آیا اور اس کے پہلو میں سما گیا۔ وہ بچوں کی طرح سسک رہا تھا۔

''اور یہ میری دوست ہیں۔ مس مانیا۔ ان کی وجہ سے ہم یہاں تک پہنچ پائے۔'' طاہر نے کہا تو مانیا اس کے دوسرے بازو سے آ لگی۔

''رہی میں تو میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہی۔'' اسی وقت سوجل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''میں اپنے انجام سے بے خبر نہیں ہوں۔ تم لوگ سرمد کی منگیتر کو لے جاؤ۔''

آہستہ سے ریحا اٹھی اور ماں کے سینے سے لگ گئی۔

''ستی ہو جانا اگر ان کے مذہب میں جائز ہوتا ریحا تو میں خود تجھے اس کے لئے سجا سنوار کر تیار کرتی مگر یہ بڑا پیارا دین ہے۔ تجھے یہ لوگ زندہ بھی رکھیں گے تو اس طرح جیسے پلکوں میں نور سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ چلی جا۔ سرمد کی سمادھی پر روزانہ پھول چڑھاتے سمے مجھے یاد کر لیا کرنا۔ میں جس حال میں بھی ہوئی' تیرے لئے

پرارتھنا کرتی رہوں گی۔'' سوجل کی طویل سرگوشی نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ وہ ماں سے الگ ہوئی تو سوجل نے اس کے ماتھے اور گالوں کے پے در پے کتنے ہی بوسے لے ڈالے۔ پھر بھیگی آنکھوں سے طاہر کی طرف دیکھا۔ مانیا آگے بڑھی اور اسے باہوں میں لے لیا۔

''تو چلیں؟'' لیڈر نے طاہر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''او کے۔'' اس نے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔

دو جوانوں نے سرمد کی لاش کو بڑی احتیاط سے کندھوں پر ڈالا اور سب سے پہلے باہر نکلے۔ پھر باقی کے لوگ بھی تیزی سے چل پڑے۔ چند لمحوں کے بعد سیل کے کھلے دروازے سے سیٹی کی آواز سنائی دی۔ سب سے پہلے طاہر' مانیا' ریحا اور آدیش باہر نکلے۔ آخر میں لیڈر نے باہر قدم رکھنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ شیشے کے کمرے میں سر اٹھائے کھڑی سوجل اسے ایسی قابل احترام لگی کہ اس نے بے اختیار اسے ماتھا چھو کر سلام کیا۔ جواب میں سوجل کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری' اس میں صرف اور صرف آسودگی کروٹیں لے رہی تھی۔

☆

جس ٹرک میں سرمد کی لاش پوری احتیاط سے رکھی گئی وہ کوٹھی کے مین گیٹ سے کچھ ہٹ کر اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ٹرک انڈین آرمی کا تھا اس لئے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔

''او کے دیدی۔'' آدیش اس سے گلے ملا۔ ''زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

''راکھی باندھنے خود آیا کروں گی تجھے۔ میرا انتظار کیا کرنا۔'' وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔ آدیش جواب میں ہونٹ دانتوں میں داب کر رہ گیا۔

ریحا سے گلے مل کر اس نے سوائے اس کا ماتھا چومنے کے کچھ نہ کہا۔ آخر میں وہ طاہر کی طرف بڑھی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

''اپنا پاسپورٹ مجھے دے دیں مسٹر طاہر۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کسی بھی طرح قانون کی زد میں آئیں۔ میں آپ کے باضابطہ پاکستان روانہ ہونے کی کارروائی کے بعد اسے آپ تک پہنچا دوں گی۔''

کچھ کہے بغیر طاہر نے جیب سے اپنا پاسپورٹ نکالا اور اسے تھما دیا۔ پھر ہوٹل کے کمرے کی چابی بھی اس کے حوالے کر دی۔

''میں شکریہ ادا کر کے تمہاری توہین نہیں کرنا چاہتا مانیا۔'' وہ آپ اور مس' دونوں تکلفات سے دور ہو کر بولا۔ ''ہاں۔ میری کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو۔۔۔''

''میں کبھی جھجکوں گی نہیں طاہر۔'' وہ بھی مسکرائی۔ دیواریں گریں تو اپنائیت کا چہرہ صاف صاف دکھائی دینے لگا۔

''اوکے۔ گڈبائی۔'' طاہر نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھاما اور دبا کر چھوڑ دیا۔

''گڈبائی۔'' ان کے ٹرک میں سوار ہو جانے کے بعد وہ تب تک وہاں کھڑی رہی جب تک ان کا ٹرک نظر آتا رہا۔ پھر تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

☆

''میرا نام جاوداں صدیقی ہے۔'' اس نے ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے طاہر کو بتایا۔ ''کمانڈر کا حکم تھا کہ آج رات سرمد کو اس ٹارچر سیل سے بہرصورت نکال لیا جائے۔ دراصل ہمیں بڑی دیر میں پتہ چلا کہ سرمد یہاں ہے ورنہ۔۔۔'' وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ ''مگر شہادت اس کی قسمت میں تھی۔ خوش نصیب تھا وہ۔ کاش ہم بھی یہ مقام پا سکیں۔''

''آپ کچھ بتا رہے تھے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہا تو طاہر نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں۔'' وہ آہستہ سے چونکا۔ ''ہمیں گارڈز پر قابو پانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کل ملا کر دس ہونے تو تھے وہ۔ ہم نے ایک ہی حملے میں انہیں موت کی نیند سلا دیا۔ ٹارچر سیل کا دروازہ بھی توڑنا نہ پڑا۔ کھلا مل گیا مگر آپ لوگوں کو وہاں دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی۔''

''بس۔ یہ ایک طویل قصہ ہے۔'' طاہر نے بات گول کر دی۔ ''اب ہم جا کہاں رہے ہیں؟ کیا آپ بتانا پسند کریں گے؟''

''جہاں کمانڈر کا حکم ہو گا وہاں آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔'' جاوداں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''ابھی کچھ دیر میں اس کی کال آنے والی ہے۔''

جونہی ٹرک نے کشمیر روڈ کا ساتواں سنگ میل عبور کیا' جاوداں صدیقی کی جیب میں پڑے سیٹ پر بزر نے اشارہ دیا۔ اس نے فوراً سیٹ نکالا اور رابطہ قائم کیا۔

''یس۔ جاوداں بول رہا ہوں خانم۔''

''کیا رہا؟'' دوسری جانب سے بڑی شیریں مگر تحکم آمیز آواز سنائی دی۔

''سرمد شہید ہو گیا خانم۔'' جاوداں نے اداسی سے جواب دیا۔

''تو اداس کیوں ہو پگلے؟ کل ہمارے حصے میں بھی یہ اعزاز آئے گا۔'' خانم نے بڑے جذبے سے کہا۔

''انشاءاللہ خانم۔'' جاوداں نے جلدی سے کہا۔ پھر اس نے ٹارچر سیل کی ساری کارروائی خانم کو بتائی۔

’’اس کی لاش کہاں ہے؟‘‘

’’ہم ساتھ لا رہے ہیں خانم۔‘‘

’’کمانڈر کا حکم ہے کہ سرمد اور اس کے ساتھیوں کو مظفر آباد کے راستے پاکستان پہنچا دیا جائے مگر اس سے پہلے دریائے نیلم کے دوسرے گھاٹ پر سرمد کی لاش کو پورے اہتمام کے ساتھ تابوت کیا جائے۔‘‘

’’جی خانم۔ ایسا ہی ہوگا۔‘‘

’’او کے۔ تم خود رابطہ اس وقت کرو گے جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔‘‘

’’میں سمجھتا ہوں خانم۔‘‘

’’عشاق۔‘‘ دوسری جانب سے کہا گیا۔

’’عزت کی زندگی یا شہادت۔‘‘ جاوداں کے لبوں سے نکلا اور دوسری طرف سے بات ختم کر دی گئی۔ طاہر ہمہ تن گوش بنا سن رہا تھا کہ اسے آخری لفظ نے چونکا دیا۔ ’’عشاق‘‘ کا لفظ سرمد کے ہونٹوں سے بھی نکلا تھا۔

’’جاوداں۔ آپ پلیز بتائیں گے کہ یہ عشاق کیا ہے؟‘‘ اس نے جاوداں کی طرف دیکھا جو ونڈ سکرین سے باہر اندھیرے میں گھور رہا تھا۔

’’عشاق۔۔۔‘‘ وہ بڑبڑایا۔ ’’ہمیں کسی باہر کے فرد پر یہ راز کھولنے کی اجازت نہیں ہے مسٹر طاہر‘ لیکن آپ کے ساتھ سرمد شہید کا ایک ایسا رشتہ ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔‘‘ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر کہا۔ ’’عشاق۔۔۔ سرفروشوں کی ایک ایسی تحریک ہے جس کا کمانڈر خانم اور ہر رکن جذبہ شہادت سے سرشار ہے۔ ہم لوگ سر پر یہ سفید رومال کفن کی علامت کے طور پر پہن کر نکلتے ہیں۔ اس کا رکن بننے کے لئے لازم ہے کہ پہلے عمرہ کیا جائے۔ بس اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔‘‘

’’سرمد بھی تو عمرہ کرنے کے بعد ہی انڈیا آیا تھا۔ تو کیا۔۔۔؟‘‘ طاہر کے دماغ میں ایک سوال نے سر اٹھایا۔ پھر وہ جاوداں سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

’’میں اس بارے صرف یہ جانتا ہوں مسٹر طاہر کہ سرمد شہید نے عمرہ پہلے کیا اور تحریک کا رکن بننے کے بارے میں اس شرط کا اسے بعد میں پتہ چلا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اسے اللہ اور رسول ﷺ نے قبولیت کے بعد اس تحریک تک پہنچایا۔ تبھی تو وہ سالوں کا فاصلہ دنوں میں طے کر کے اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا۔‘‘ جاوداں نے اس کے پوچھنے پر کہا۔

طاہر کے لئے اب کوئی بھی دوسرا سوال کرنا بے معنی تھا۔ اسے سرمد کے آخری الفاظ یاد آئے اور بے اختیار اس

کا دل دھڑک اٹھا۔

''صلی اللہ علیہ وسلم۔''

ہاں۔ یہی الفاظ تو تھے اس کے لبوں پر۔ عجیب سی رقت طاری ہو گئی اس پر۔ سر سینے پر جھکتا چلا گیا۔ آنکھیں بند ہوئیں تو تصور میں گنبدِ خضریٰ مہک اٹھا۔ غیر اختیاری طور پر اس کے لبوں کو حرکت ہوئی اور ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ یوں جاری ہو گئے جیسے برسوں کا بھولا ہوا سبق اچانک یاد آ جائے۔

ٹرک رات کے اندھیرے میں پوری تیزی سے انجانے راستوں پر رواں تھا اور ایک انجانی خوشبو ٹرک کے ساتھ ساتھ محوِ سفر تھی۔ درود کی خوشبو۔ حضوری کی خوشبو۔ قبولیت کی خوشبو۔

☆

صبح ہونے سے پہلے دریائے نیلم کے دوسرے گھاٹ پر ٹرک چھوڑ دیا گیا۔ وہاں پہلے سے ایک بڑی کشتی میں ساگوان کی لکڑی کا تابوت لئے چار عشاق موجود ملے۔ سرمد کی لاش کو سبز کشمیری شال میں لپیٹ کر تابوت میں رکھا گیا۔ اکیس رائفلوں کی سلامی دی گئی۔ پھر جاوداں صدیقی اور اس کے ساتھی تو وہیں رہ گئے اور چار نئے ساتھیوں کے ساتھ وہ رات ہونے تک وہیں جنگل میں چھپے رہے۔

رات کے پہلے پہر اگلا سفر شروع ہوا۔ یہ سفر اسی کشتی میں تھا۔ ان چار عشاق کا کام ہی کشتی کھینا تھا۔ کشتی میں پھل اور خشک میوہ جات موجود تھے جن سے وہ جب چاہتے لذتِ کام و دہن کا کام لے سکتے تھے مگر بھوک کسے تھی جو ان کی طرف نظر اٹھاتا۔

ریحا تابوت پر سر رکھے آنکھیں بند کئے پڑی رہتی۔ چار دن میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ آدیش سر جھکائے نجانے کس سوچ میں ڈوبا رہتا۔ ہاں طاہر اس کے ہونٹ ملتے اکثر دیکھتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا پڑھتا رہتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی طرح آدیش بھی ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کا اسیر ہو چکا ہے۔

وہ رات کو سفر کرتے اور دن میں کشتی کنارے پر روک کر لمبی گھاس میں یا گھنے درختوں تلے چھپ کر پڑے رہتے۔ سات دن گزر گئے۔ آٹھویں دن صبح کاذب نمودار ہو رہی تھی جب کشتی کنارے پر لگا دی گئی۔ ایک ساتھی نصیر نے بتایا کہ یہاں سے آگے کا سفر انہیں پیدل کرنا ہو گا۔

تابوت کو دو دو ساتھیوں نے باری باری کندھوں پر لیا اور وہ سب ایک خشک برساتی نالہ عبور کر کے پاکستانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ طاہر اور آدیش نے تابوت اٹھانا چاہا تو ان چاروں نے منت بھرے لہجے میں کہا کہ ان سے یہ سعادت نہ چھینی جائے۔ مجبوراً طاہر نے تابوت ان چاروں کے حوالے کر دیا اور خود ریحا اور آدیش کے ساتھ ان کے

پیچھے ہولیا۔

''ہم اس وقت کہاں ہیں؟'' چلتے چلتے طاہر نے نصیر سے پوچھا۔

''مظفر آباد کے آخری حصے میں۔ یہاں سے ہم وسطی آبادی کی طرف جا رہے ہیں۔ شام تک پہنچیں گے۔ وہاں سے آپ کو سواری مل سکے گی۔''

''ذرا رکئے۔'' اس نے نصیر سے کہا۔ اس کے کہنے پر انہوں نے تابوت ایک ٹیلے پر رکھ دیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

طاہر نے اپنے دماغ میں جنم لینے والے خیال پر ایک بار پھر غور کیا۔ پھر نصیر سے پوچھا۔

''نصیر بھائی۔ یہ بتایئے یہاں سے نور پور کس طرف ہے؟''

''نور پور۔'' نصیر چونکا۔ ''یہ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟''

''اگر آپ کو علم ہے تو بتایئے۔ شاید ہمیں وسطی علاقے کی طرف جانا ہی نہ پڑے۔'' طاہر نے نرمی سے کہا۔

''سائیاں والا کا رہائشی ہے یہ خادم حسین۔ سائیاں والا سے تیسرا گاؤں ہے نور پور۔'' نصیر نے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس علاقے کے بارے میں یہ زیادہ بہتر بتا سکتا ہے۔''

طاہر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''نور پور کا گاؤں یہاں سے پیدل سات گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ آج کل وہاں سیلاب کی وجہ سے ایک قدرتی نہر بن گئی ہے اس لئے کشتیاں چلنے لگی ہیں۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اس عارضی پتن پر پہنچ جائیں گے جہاں سے سائیاں والا اور نور پور کے لئے کشتی مل جائے گی۔''

''بس۔۔۔'' اچانک طاہر کے لہجے میں جوش بھر گیا۔ ''تو سمجھ لیجئے کہ ہمیں نور پور جانا ہے۔ راستہ بدل لیجئے اور اس پتن کی طرف چل دیجئے۔''

راستہ بدل دیا گیا۔ ریحا اور آدلیش طاہر کے لہجے سے کسی خاص بات کا اندازہ تو لگا رہے تھے مگر وہ بات کیا تھی؟ یہ انہیں کیا معلوم۔

ان سے ذرا پیچھے رہ کر طاہر نے جیب سے موبائل نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کا نمبر ملایا۔ اتنے دنوں بعد وہ فون کر رہا تھا اور وہ بھی کیا بتانے کے لئے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے دعا کی کہ فون صفیہ نہ اٹھائے۔ اس کی اللہ نے شاید نزدیک ہو کر سنی۔ دوسری طرف سے بیگم صاحبہ نے فون اٹھایا۔

''ہیلو۔ امی۔ میں طاہر بول رہا ہوں۔'' اس نے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''طاہر۔'' بیگم صاحبہ ایک دم ہشاش بشاش ہو گئیں۔ ''کیسا ہے بیٹے۔ تو نے اتنے دن فون کیوں نہیں کیا؟

یہاں فکر کے مارے سب کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی۔ آپ میری بات دھیان سے سنئے۔" اس نے حلق تر کرتے ہوئے بمشکل کہا۔

"ٹھہر میں صفیہ کو بلاتی ہوں۔۔۔"

"نہیں امی۔ رکئے۔ اسے مت بلائیے۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنئے۔" طاہر نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اسی لئے موبائل پر فون نہیں کیا کہ مجھے صرف آپ سے بات کرنا ہے۔"

"خیر تو ہے ناں بیٹا؟" وہ تشویش سے بولیں۔ گھبراہٹ ان کے لہجے میں نمایاں تھی۔

"آپ ڈاکٹر ہاشمی اور صفیہ کو لے کر نور پور میں بابا شاہ مقیم کے مزار پر پہنچ جائیں۔ ابھی چل پڑیں تو شام تک پہنچیں گی۔ میں آپ سے وہیں ملوں گا۔"

"مگر طاہر۔ وہاں کیوں بیٹا؟ تو سیدھا گھر کیوں نہیں آ رہا؟" وہ بے طرح گھبرا گئیں۔

"میرے کندھوں پر بڑا بوجھ ہے امی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں یہ بوجھ لئے گھر تک نہ آ سکوں گا۔ آپ وہیں آ جائیے انکل اور صفیہ کو لے کر۔"

"بوجھ؟ کیسا بوجھ؟" وہ حیرت سے بولیں۔ "سرمد تو خیریت سے ہے؟ اور وہ تیرے ساتھ ہی ہے ناں؟"

"ہاں امی۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔ "اسی کو تو کندھوں پر اٹھائے لا رہا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟" بیگم صاحبہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

"ہاں امی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا گیا۔ "وہ بالکل چپ ہو گیا ہے۔ بولتا ہے نہ چلتا ہے۔ خاموش لیٹا ہے۔ تابوت میں۔" اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"طاہر۔۔۔" بیگم صاحبہ کے ہاتھ سے ریسیور گر پڑا۔

طاہر نے موبائل آف کیا اور بازو آنکھوں پر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگا۔ اس کا دل ایسا رقیق تو کبھی بھی نہ تھا۔ نجانے کیوں آج کل وہ بات بے بات رونے لگتا تھا۔

ایک گھنٹے کا راستہ چالیس منٹ میں طے ہوا۔ عصر اتر رہی تھی جب وہ اس عارضی پتن پر جا پہنچے۔ پتن پر اس وقت بھی خاصے مسافر تھے۔ کشتیاں ایک درجن سے زائد موجود تھیں۔ طاہر نے ایک کشتی والے سے خود بات کی۔

"بابا شاہ مقیم تک جانا ہے بھئی۔ چلو گے؟"

"کتنے جی ہیں؟" ملاح نے تابوت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ "اور اس میں کیا ہے جی؟"

"پانچ جی ہیں اس تابوت سمیت۔ اور اس میں۔۔۔" طاہر کا حلق درد کرا اٹھا۔ "اس میں ایک شہید ہے۔"

”سو بسم اللہ جی۔ کیوں نہیں چلیں گے۔ آ جائیں جی آ جائیں۔“ ملاح نے عقیدت سے کہا اور آگے بڑھ کر نصیر اور خادم حسین کے ساتھ مل کر تابوت کشتی میں رکھوانے لگا۔

چاروں عشاق ان دونوں سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ طاہر اور آدیش اگلے حصے میں جبکہ ریحا تابوت کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ملاح نے جھک کر تابوت کو بوسہ دیا اور پتن پر کھڑے اپنے ساتھیوں کی طرف منہ کر کے بولا۔

”اوئے شیدو۔ گھر پر بتا دینا میں رات دیر سے لوٹوں گا۔“

”ارے فیقے۔ تو کہاں چل دیا۔ میں ادھر تیری دیہاڑی لگوانے کی بات کر رہا ہوں۔“ شیدو دو قدم اس کی طرف چلا۔

”میرا دیہاڑا لگ گیا ہے رے۔“ فیقا ہنسا۔ ”ایسا دیہاڑا جس میں نفع ہی نفع ہے۔ نقصان ہے ہی نہیں جانی۔ اللہ راکھا۔“ اس نے کشتی پانی میں دھکیل دی۔ پھر اچھل کر کشتی میں سوار ہوا اور چپو سنبھال لئے۔ سیلاب کا پانی خاصا کم ہو چکا تھا مگر اب بھی کشتی چلنے کے لئے کافی تھا۔

ریحا نے تابوت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ آدیش پہلو کے بل نیم دراز ہو گیا اور طاہر نے چھل چھل کرتے پانی پر نگاہیں جما دیں۔ وہ اپنے اس فیصلے پر غور کر رہا تھا جس کے تحت اس نے اچانک بابا شاہ مقیم کے مزار پر درویش کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے اب تک یہ پتہ نہ چل سکا تھا کہ وہ کون سا احساس تھا جو اس فیصلے کے روپ میں ایک دم اس پر حاوی ہو گیا تھا اور اس نے سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کر ڈالا۔ وہ کونسی طاقت تھی، جس نے اس کا راستہ بدل دیا تھا۔

اسی وقت ملاح نے تان لگائی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ملاح کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ اس کے دل و دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔

آیا ماہی میرے ویہڑے
دُکھ دساں میں کیہڑے کیہڑے
بولے نہ بولے واری جاواں
بس رکھے قدماں دے نیڑے
آیا ماہی میرے ویہڑے

شام ڈھل چکی تھی نیم اندھیرے جب نور پور کا وہ تھہ طاہر کو دور سے دکھائی دے گیا جہاں حافظ عبداللہ روزانہ آ

کر منزل کیا کرتا تھا۔ اور ایک عجیب بات اور نظر آئی کہ بابا شاہ مقیم کا مزار روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بجلی آ گئی تھی وہاں۔ اس نے ملاح کو ٹبے کی طرف جانے کو کہا۔ پھر ٹبے کو غور سے دیکھا تو اسے وہاں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ اس کا دل سینے میں زور سے دھڑکا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔ مگر کون؟ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہاں جو کوئی بھی ہے' اس کے لئے اجنبی نہیں ہے۔

کشتی جونہی ٹبے کے قریب پہنچی' اس پر سب روشن ہو گیا۔ وہ درویش ہی تو تھا جو ٹبے سے اتر کر پانی کے کنارے کھڑا باہیں پسارے اسے پکار رہا تھا۔

”پگلے۔ آ گیا تو۔۔۔ لے آیا میرے دولہے کو۔ ارے دلہن بھی ہے ساتھ میں۔“ وہ جیسے حیرت سے بولا۔

آدیش اور ریحا اس کی باتوں پر حیران ہو رہے تھے۔ طاہر سر جھکائے' دانت بھینچے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اس کا جی چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر روئے۔ یوں روئے کہ جیسے اسے چپ کرانے والا کوئی نہیں رہا۔

ملاح نے کشتی ٹبے کے پاس روکی۔ پانی میں اترا۔ رسہ کھینچ کر کشتی کنارے پر لگائی۔ طاہر نے کنارے پر قدم رکھا تو درویش نے اسے باہوں میں بھر لیا۔ اس کا ماتھا چوم لیا۔

”نہ رے۔ روتا کیوں ہے۔ پگلے کا پگلا ہی رہا۔“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بولا۔ ”ارے زندوں کے لئے رونا گناہ ہے۔ جانتا نہیں کیا؟“

طاہر نے اثبات میں سر ہلایا اور ہچکیاں لے کر رو دیا۔ اس کا دل بس میں تھا ہی کب جو وہ درویش کی بات سمجھ پاتا۔

”بس بس۔ آ' اسے کشتی سے اتاریں۔ وہ انتظار کر رہا ہے ہمارا۔“ درویش نے اس کا بازو تھاما اور ملاح کے پاس پہنچا' جوان کا منتظر کھڑا تھا۔

”لا بھئی نصیباں والیا۔ ہماری امانت اتار دے۔“ درویش نے کہا تو ملاح نے ”بسم اللہ“ کہہ کر طاہر اور درویش کے ساتھ مل کر تابوت کشتی سے اتار کر ٹبے پر رکھ دیا۔ ریحا کو بازو سے لگائے کھڑا آدیش خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔

طاہر نے خود کو سنبھالا۔ جیب سے پرس نکالا کہ ملاح نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سوہنیو۔ ساری کمائی خود ہی کر لو گے۔ کچھ ہمیں بھی کما لینے دو۔“

طاہر نے ملاح کو حیرت سے دیکھا۔

’’ٹھیک کہتا ہے یہ پگلے۔‘‘ درویش نے ملاح کا شانہ تھپکا۔ ’’جا بھئی جا۔ تیری منظوری ہو گئی۔ جا شاواشے۔ موجاں مان۔ دیہاڑا لگایا ہے تو نے دیہاڑا۔ جا بال بچے میں جا۔‘‘

ملاح انہیں دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔ تب ایک دم طاہر کو احساس ہوا کہ ریحا اور آدیش بالکل چپ کھڑے ہیں۔

’’بابا۔ یہ۔ ۔ ۔‘‘ طاہر نے ان کے بارے میں بتانا چاہا۔

’’کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آ جا۔ ادھر کتنے ہی لوگ کب سے تم سب کا انتظار کر رہے ہیں۔ آ جا۔‘‘ درویش نے کہا۔ پھر ریحا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ’’سسرال آ گئی ہے دھی رانی۔‘‘

اور نجانے کیا ہوا کہ چیخیں مار کر روتی ہوئی ریحا درویش کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی ہچکیاں بتاتی تھیں کہ کتنے آنسو تھے جو اس نے سینے میں روک رکھے تھے۔ آج بند ٹوٹا تو سب کچھ بہا لے گئے۔ صبر، قرار، چین۔ سب کچھ۔

’’بس بس۔ میری دھی بس۔ سارے آنسو ابھی بہا دے گی کیا؟ انہیں سنبھال کے رکھ۔ ساری زندگی پڑی ہے۔ کہیں کم نہ پڑ جائیں۔‘‘ وہ اس کا سر تھپکتا رہا۔ آخر ریحا کو سکون آیا۔ تب درویش نے اسے الگ کیا اور آدیش کی طرف دیکھا۔

’’تو بڑا قسمت والا ہے اللہ والیا۔ چل۔ آ جا۔ لے چل میرے دولہا کو پنڈال میں۔ آ جا۔‘‘

نم دیدہ آدیش نے طاہر کے ساتھ مل کر سرمد کا تابوت اٹھایا اور بابا شاہ مقیم کے مزار کی طرف چل پڑے۔ درویش سب سے آگے اور ریحا ان سب کے پیچھے سر جھکائے چل رہی تھی۔

مزار کے پاس پہنچے تو طاہر کے قدم من من کے ہو گئے۔ اس سے چلنا مشکل ہو گیا۔ آنکھیں ایک بار پھر دھندلا گئیں۔ ہونٹ دانتوں میں دبانے پر بھی پھڑکتے رہے۔ اس کا حلق آنسوؤں سے لبالب ہو گیا۔ درد کی لہر خار بن کر سینہ چیرنے لگی۔

مزار کے باہر وہ سب کھڑے تھے۔ بے حس و حرکت۔ مجسموں کی طرح ایستادہ۔ ایک دوسرے کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے۔ مگر یہ بتانے کی ضرورت کسے تھی کہ وہ ایک لٹے ہوئے قافلے کے مسافر تھے۔

☆

سرمد کا تابوت مزار کے سامنے برگد کے درخت تلے رکھ دیا گیا۔ وہاں تک مزار کے دروازے پر لگا بلب روشنی دے رہا تھا۔ اردگرد کی ہر شے صاف دکھائی رہی تھی۔ طاہر تابوت رکھ کر سیدھا ہوا تو ڈاکٹر ہاشمی لرزتے کانپتے اس کے شانے سے آ لگے۔

”لے آئے میرے سرمد کو۔“ ان کے لبوں سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی۔ طاہر نے تڑپ کر انہیں اپنے سینے میں چھپا لیا۔ قابلِ رشک صحت کے مالک ڈاکٹر ہاشمی کا جسم ایک بیمار بچے کا سا ہو رہا تھا۔ ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ اگر ڈاکٹر ہاشمی تھا تو طاہر کے لئے اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔

”انکل۔۔۔“ وہ ضبط کھو بیٹھا۔

”رو لو۔ خوب رو لو۔“ درویش نے ان کے قریب آ کر کہا۔ ”یہ آنسو محبت کے ہیں۔ دُکھ کے ہیں تو خوب رو لو لیکن اگر پچھتاوے کے ہیں تو ان کو روک لو۔ گناہ بن جائے گا تمہارا یہ رونا۔ میرے دولہے کے لئے بوجھ نہ بنانا ان آنسوؤں کو۔“

”نہیں بابا۔“ ڈاکٹر ہاشمی طاہر کے سینے سے الگ ہو گئے۔ ”پچھتاوا کیسا؟ پھر بھی اولاد تو ہے ناں۔“

”ہاں۔ اولاد تو ہے۔“ درویش نے ڈاکٹر ہاشمی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”مگر کیسی اولاد ہے بابا! جس نے تیرا سر دونوں جہانوں میں فخر سے اونچا کر دیا۔ ارے کیسا نصیبوں والا ہے تو۔ کچھ پتہ ہے تجھے؟ آنسو بہا مگر اس خوشی پر بہا کہ اللہ نے اس کے حبیب ﷺ نے تیری اولاد کو اپنے لیے چن لیا۔“

ڈاکٹر ہاشمی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آنکھیں خشک کرنے لگے۔ اتنے ہی دنوں میں ان کی کمر جھک گئی تھی۔ وہ ایک دم بوڑھے ہو گئے تھے۔

اب اس کے سامنے بیگم صاحبہ اور صفیہ کھڑی تھیں۔ بیگم صاحبہ سفید لباس اور سفید چادر میں کوئی پاکیزہ روح لگ رہی تھیں۔ اسے سینے سے لگا کر دل کی پیاس بجھائی۔ ماتھا چوما اور آنسو اپنے پونچھنے لگیں۔

”صفو۔“ اس نے روتی ہوئی صفیہ کی جانب دیکھا۔ وہ بلک کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

یہ آنسو کیا کچھ نہ کہہ رہے تھے؟ دونوں سن رہے تھے۔ سمجھ رہے تھے۔

’’طاہر صاحب۔‘‘ ایک آواز سن کر اس نے صفیہ کو خود سے الگ کیا اور گردن گھمائی۔ حافظ عبداللہ‘ سکینہ کے ساتھ اس کے بائیں طرف کھڑا تھا۔ طاہر نے اسے بھی گلے لگایا۔ سکینہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑی رہی۔ حافظ عبداللہ نے اپنا ننھا ہاتھ بڑھایا تو طاہر نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چوم لیا اور آنسو بہاتی سکینہ نجانے کیوں مسکرا پڑی۔

درویش نے سرمد کا تابوت‘ حافظ عبداللہ کے ساتھ مل کر اٹھایا اور آگے لا کر مزار کے پاس پوری طرح روشنی میں رکھ دیا۔ طاہر کے وضو کر کے لوٹ آنے پر درویش نے تابوت کے سرہانے کھڑے ہو کر اس کی جانب دیکھا جو اس سے کچھ دور رک گیا تھا۔

’’پگلے۔ تو نے مجھ سے عشق کے قاف کے بارے میں پوچھا تھا۔ یاد ہے ناں؟‘‘

’’ہاں بابا۔‘‘ طاہر نے اس کی جانب دیکھا۔

’’تو لے۔ آج عشق کے قاف سے بھی آشنا ہو جا۔‘‘ درویش نے آنکھیں بند کر لیں۔ ’’عشق کا قاف۔ ۔ ۔ تجھے یاد ہے پگلے۔ سرمد کے آخری الفاظ کیا تھے؟‘‘

’’ہاں بابا۔‘‘ طاہر نے آنکھیں بند کر کے جیسے کچھ یاد کرنا چاہا۔

’’تو دہرا ذرا ان کو۔‘‘ درویش کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ حافظ عبداللہ‘ آدیش اور ڈاکٹر ہاشمی خاموشی بھری حیرت مگر پورے دھیان سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ سکینہ‘ صفیہ اور ریحا کا بھی یہی حال تھا۔

’’اس نے کہا تھا۔ قل هو الله احد۔ ۔ ۔‘‘

’’تو عشق کا قاف سمجھ میں نہیں آیا اس وقت تجھے؟‘‘ ایک دم درویش نے آنکھیں کھول دیں۔

’’بابا۔ ۔ ۔‘‘ طاہر کا اندر باہر جیسے روشن ہو گیا۔ اس نے ایسی نظروں سے درویش کو دیکھا جن میں حیرت کے ساتھ ساتھ ادراک کی لپک بھی تھی۔

’’ہاں رے۔‘‘ درویش کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ ’’عشق مجازی جب انسان کا ہاتھ عشق حقیقی کے ہاتھ میں دیتا ہے تو شہادت مانگتا ہے اس کے ایک ہونے کی۔ اس کے احد ہونے کی۔ اس کے لاشریک ہونے کی۔ جانتا ہے کیوں پگلے؟‘‘ درویش نے اس کی جانب مستی بھری نگاہوں سے دیکھا۔

’’کیوں بابا؟‘‘ طاہر نے یوں پوچھا جیسے کسی سحر میں گرفتار ہو۔ اس کی آواز میں عجیب سا کیف چھلک رہا تھا۔

’’اس لئے کہ عشق کی انتہا ہے عشق کا قاف۔ وہ جو عشق کا سب سے پہلا مبتلا ہے‘ اس نے جب چاہا کہ خود کو

دیکھے تو اس نے اپنے نور سے ایک مٹھی بھری اور کہا۔ ''محمدؐ ہو جا۔'' اور جب اس کا اپنا نور مجسم ہو کر اس کے سامنے آیا تو وہ خود اپنے نور پر عاشق ہو گیا۔ اس نے اپنے نور کو اپنا حبیبؐ بنا لیا۔ کہا۔ ''میرا حبیبؐ ہو جا۔'' پھر دوئی کا تصور تک مٹانے کے لئے، اس نے اپنے حبیب ﷺ سے اپنے ہونے کی، اپنے احد ہونے کی، اپنے واحد ہونے کی شہادت چاہی اور کہا۔ ''قل (کہہ دے)۔''

حبیبؐ نے پوچھا۔ ''کیا کہہ دوں؟''

محبّ نے فرمایا۔ ''قل ھو اللہ احد۔۔۔ کہہ دے، شہادت دے کہ اللہ ایک ہے۔''

حبیبؐ نے شہادت دی اس کی وحدانیت کی۔ اس کے لاشریک ہونے کی۔ اس کے احد ہونے کی۔ اس کے خالق ہونے کی۔ اس کے معبود ہونے کی۔ اس کی وحدانیت کی گواہی دینا اس کے حبیب ﷺ کی سب سے پہلی سنت ہے۔

پھر جب اس نے آدم کو بنایا تو اس میں عشق کا یہ جذبہ سب سے پہلے ودیعت کیا۔ عشق۔۔۔ اسی خالق واحد کی سنت ہے جسے جو اختیار کرتا ہے، اسے پہلے عشق مجازی کی سیڑھی چڑھنا پڑتی ہے۔ عشق کے عین یعنی عبادت، عجز اور عبودیت کے بعد عشق کے شین یعنی شک کی باری آتی ہے۔ تب بندے کو سمجھایا جاتا ہے کہ اپنے خلوص میں، اپنے جذب میں، اپنے عشق کی انتہا کے بارے میں ہر وقت اس شک میں مبتلا رہے کہ ابھی اس میں کچھ کمی ہے۔ اس شک سے اپنے عشق کو مہمیز کرتا رہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جس سے عشق کیا جاتا ہے اس کی توجہ پانے کے لئے اس کی نظر میں جگہ پانے کے لئے اس کی عزیز ترین شے، جس سے وہ خود بے پناہ پیار کرتا ہو، کو اپنا حبیب بنا لیا جائے۔ پگلے۔ یہ وہ پڑاؤ ہے جس کے بعد منزل ہی منزل ہے۔ اللہ کا حبیبؐ جس کے لئے اس نے کائنات یہ کہہ کر بنائی کہ ''اے حبیبؐ۔ اگر ہم نے آپ کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو کچھ بھی نہ بناتے''۔ بندہ اس پڑاؤ پر اپنے معبود کے محبوبؐ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے عشق، اپنے جذبے، اپنے خلوص میں کمی کا شک انسان کو اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں انسان اپنے اللہ کے حبیبؐ کے عشق میں یوں بے خود ہو جاتا ہے کہ سمیعہؓ جان ہار کر اسلام کی پہلی شہید ہونے کا اعزاز پاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جان دینا قبول کر لیتی ہیں مگر اپنے حبیب ﷺ کے بارے میں ناگوار کلمہ زبان پر لانا پسند نہیں کرتیں۔ تب اپنے بندے کو اپنے حبیبؐ کے عشق میں مجذوب دیکھ کر محبوب برحق اس کے لئے عشق کا تیسرا پردہ بھی اٹھا دیتا ہے اور ۔۔۔ اس مقام پر عشق کا قاف نمودار ہوتا ہے۔ تب بلالؓ ''احد احد'' پکارتا ہے۔ اسے تپتی ریت پر لٹایا جاتا ہے۔ دہکتے انگاروں پر ڈالا جاتا ہے۔ ناک میں نکیل دے کر بازاروں میں گھمایا جاتا ہے۔ کانٹوں پر گھسیٹا جاتا ہے۔ کوڑوں سے کھال ادھیڑی جاتی ہے مگر۔۔۔ اس کے لبوں سے احد احد کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔۔۔ قل ھو اللہ احد۔۔۔ عشق کا

قاف نمودار ہوتا ہے تو حسینؓ کے گلے پر خنجر چلتا ہے مگر احد احد کی پکار ہر قطرہ خون سے بلند ہوتی ہے۔ تن سے جدا ہو جاتا ہے مگر سر نیزے پر آویزاں ہو کر بھی قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ تلاوت وہ پیار بھری' محبت بھری گفتگو ہے جس کا عنوان عشق کا قاف ہے۔ عشق کا قاف جس پر نازل ہو جاتا ہے ناں۔ اسے کسی دُکھ' کسی تکلیف کا احساس نہیں رہتا۔ اسے ہر درد میں لذت اور ہر چوٹ میں سرور ملتا ہے۔ عشق کے قاف کی مستی ہی ایسی ہے کہ جسے اپنی باہوں میں لے لے اسے اپنے معبود کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اور جسے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا وہ اس کے حضور مقبول ہونے کے لئے کیا کرے۔ اپنی جان نہ دے دے تو کیا کرے؟" درویش کے لبوں سے چیخ کی صورت ایک نعرہ مستانہ نکلا اور اس نے اپنا گریبان تار تار کر ڈالا۔

"بابا۔" طاہر نے بمشکل پلکیں وا کیں۔ اسے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں پر مستی کا' سرور کا' کیف کا بے اندازہ بوجھ ہے جو اس سے اٹھائے نہیں اٹھ رہا۔

"ہاں۔" وہ پھر چیخا۔ "وہ اس پر اپنی جان نہ دے دے تو کیا کرے۔ اس سے بڑھ کر اس کے پاس ہے کیا جو وہ اس کی نذر کرے۔" وہ روتا ہوا گھٹنوں کے بل گر پڑا۔

"قل ھو اللہ احد۔۔۔ عشق کا قاف۔۔۔ اس کے واحد' محبوبِ اول اور عزیز ترین ہونے کی شہادت۔ اور شہادت لکھی کس سے جائے گی پگلے۔ خون سے۔ اپنے خون سے۔ زبانی کہہ دینا کیا کافی ہوتا ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ شہادت دی ہے تو اسے لکھا بھی جائے گا اور عشق' اپنے عاشق کو اپنی دلہن تب مانتا ہے جب سرخ جوڑا پہن کر شہادت دی جائے۔ اپنے خون میں ڈبویا ہوا سرخ جوڑا۔ عشق کا قاف۔۔۔ قل ھو اللہ احد۔۔۔ اس کی وحدانیت کی گواہی۔ اس کے لاشریک ہونے کی گواہی۔ اس کے محبوب ترین ہونے کی گواہی۔۔۔ عشق کا قاف۔۔۔ عشق کا قاف۔۔۔" درویش کہتا ہوا زمین پر سر بسجود ہو گیا۔ ایک لمحے بعد طاہر بھی لہراتا ہوا اس کے قریب ڈھیر ہو گیا۔

سب لوگ گونگے بہرے بنے چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ سن رہے تھے۔ کسی کے جسم و جان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر ان میں سے کسی ایک کو بھی اٹھاتا۔

پھر حافظ عبداللہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب آیا اور جھکتے جھکتے درویش کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر گھبرا کر ایک دم اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے لگا جیسے اس نے جلتا ہوا انگارہ چھو لیا ہو۔

اسی وقت درویش کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور اشکوں میں تر اس کا چہرہ دیکھ کر ان کے دل موم کی طرح پگھل گئے۔ ان کا جی چاہا' اس نرم و گداز چہرے کو دیکھتے رہیں۔ تکتے رہیں۔

درویش نے پاس پڑے طاہر کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ پیار امڈ آیا۔ اس نے طاہر کے

شانے پر ہاتھ رکھا۔

’’پگلے۔‘‘ دھیرے سے اس نے پکارا۔ ’’ابھی بات باقی ہے رے۔ اٹھ جا۔‘‘

اور طاہر زمین سے اٹھ گیا۔ اس کا چہرہ۔۔۔ اس کا اپنا چہرہ لگتا ہی نہ تھا۔ عجیب سا نور چھایا ہوا تھا اس پر۔ آنکھیں بڑی مشکل سے کھول کر اس نے درویش کی جانب دیکھا۔

’’اٹھ جا رے۔‘‘ درویش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ’’آ۔ اب آخری بات سمجھا بھی دوں تجھے اور دکھا بھی دوں۔‘‘ وہ اس کا ہاتھ تھامے تابوت کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔

’’تم سب لوگ بھی آ جاؤ۔ کیا اپنے شہید کا‘ عشق کے قاف کے گواہ کا دیدار نہ کرو گے؟‘‘

درویش نے کہا تو سب لوگ یوں دبے پاؤں چلتے ہوئے تابوت کے پاس آ گئے‘ جیسے ان کی ذرا سی آہٹ سرمد کے آرام میں خلل ڈال دے گی۔ حافظ عبداللہ‘ آدلیش اور ڈاکٹر ہاشمی درویش کے بالکل سامنے اور سکینہ‘ زیحا‘ بیگم صاحبہ اور صفیہ تابوت کے پیروں کی جانب تھیں۔

’’وہ جو عشق کا خالق ہے۔ جب اس کا بندہ اس کے عشق کے قاف‘ اس کی وحدانیت کی گواہی اپنے خون سے دیتا ہے ناں تو وہ اس کے لئے پہلا انعام تو یہ رکھتا ہے کہ وہ اس سے راضی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے حضور اذن باریابی دے دیتا ہے۔‘‘ درویش نے ایک انگلی اٹھائی۔

’’دوسرا انعام یہ دیتا ہے کہ اس کی شہادت‘ اس کی گواہی دینے پر اس کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اس کی شہادت‘ اس کی قربانی قبول فرما لیتا ہے۔‘‘ اس نے دوسری انگلی اٹھائی۔

’’اور تیسرا انعام یہ دیتا ہے کہ اپنے شہید کو عمر جاوداں‘ ابدی زندگی‘ لازوال حیات عطا کر دیتا ہے۔ وہ بظاہر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسے قبر میں بھی اتار دیا جاتا ہے مگر وہ فرماتا ہے کہ ’’جو اس کی راہ میں شہید کئے جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ انہیں اس کے ہاں سے رزق دیا جاتا ہے مگر ہم لوگوں کو ان کی زندگیوں کا شعور نہیں۔‘‘ درویش نے تیسری انگلی اٹھائی۔

سب لوگ حیرت سے بُت بنے درویش کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اس کی باتیں ان کے دلوں میں اتر رہی تھیں۔ کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا وہ کہتا رہے اور یہ سنتے رہیں۔ عمر تمام ہو جائے مگر اس کی بات نہ رکے۔

’’وہ جو کہتا ہے اس کا دوسرا کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔‘‘ درویش نے ان کے خوابیدہ چہروں پر نگاہ ڈالی۔ ’’اگر اس نے کہا کہ شہید زندہ ہے تو وہ زندہ ہے۔ یہ دیکھو۔‘‘

درویش نے تابوت سے تختہ اٹھا دیا۔

وقت رک گیا۔ لمحے ساکت ہو گئے۔ ہر شے کو قرار آ گیا۔ صرف ایک انجانی خوشبو تھی جو ان کے سروں پر تھپکیاں دے رہی تھی۔ انہیں اندر باہر سے جل تھل کر رہی تھی۔ ان کے چاروں طرف‘ اوپر نیچے‘ ہر طرف اسی ایک مہک کا راج تھا۔

ان کی نظروں کے سامنے سرمد کا چہرہ کیا آیا‘ دل دھڑکنا بھول گئے۔ پلکوں نے حرکت کرنا چھوڑ دیا۔ دماغوں سے شعور کی گرفت ختم ہو گئی۔ ان کے جسم تنکوں سے ہلکے ہو کر جیسے ہوا میں اڑنے لگے۔ وہ حیرت اور عقیدت کے سمندر میں غوطے کھا رہے تھے۔

گلاب جیسے تر و تازہ سرمد کے لبوں پر ایک ابدی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر زخم سے خون رس رہا تھا۔ رس رس کر تابوت کی تہہ میں جم رہا تھا۔ اس کے دل کے زخم پر مانیا نے شال کا جو ٹکڑا باندھا تھا‘ وہ اب بھی زخم سے نکلنے والے خون میں تر ہو رہا تھا۔ ایک لازوال سکون کے ہالے میں دمکتے سرمد کے چہرے سے یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی آنکھیں کھول دے گا۔ ابھی بول اٹھے گا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے حافظ عبداللہ کا ہاتھ تھام کر اپنے امڈ آنے والے آنسوؤں کو راستہ دے دیا۔ بیگم صاحبہ کی نم آنکھیں‘ سکینہ کی آنکھوں میں چھاتی ہوئی دھند اور۔۔۔ صفیہ کا لرزتا کانپتا جثہ‘ اس بات کا شاہد تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی سرمد کی موت کا یقین نہیں آ رہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اچانک آدیش کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ اس نے کہا اور ریحا کی طرف دیکھا‘ جو اسی کی طرح نظروں میں بے اعتباری لئے سرمد کے چہرے اور زخموں کو حیرت سے تک رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اسی وقت درویش نے آدیش کی جانب نگاہ کی۔

”کیا نہیں ہو سکتا رے؟ کچھ ہمیں بھی تو بتا۔“ اس کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ اس نے آہستہ سے ساتھ کھڑے طاہر کا ہاتھ تھام کر ہولے سے تھپتھپایا جس کے چہرے پر حیرت کے بجائے ایک فخر‘ ایک ناز دمک رہا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“ آدیش نے دایاں ہاتھ سرمد کے چہرے کی طرف دراز کر دیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کھل کر بول ناں۔“ درویش نے اسے ڈانٹا۔ ”کیوں سب کو خلجان میں مبتلا کر رہا ہے۔ کیا نہیں ہو سکتا؟ بول۔“

آدیش کا ہاتھ پہلو میں بے جان ہو کر گر پڑا۔ اس نے ایک نظر پاگلوں کی طرح سرمد کے چہرے کو تکتی ریحا کو دیکھا پھر سرمد کے چہرے پر نگاہ جما دی۔

”جس رات سرمد کو قتل کیا گیا اس دن صبح میں نے اپنے سامنے اس کی شیو کرائی۔ خود اس کے ناخن تراشے تھے۔ اس بات کو آج آٹھ سے دس دن ہو چکے ہیں مگر۔۔۔“ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

”مگر۔۔۔“ درویش نے طاہر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”مگر آج اس کے ناخن بھی بڑھے ہوئے ہیں اور داڑھی بھی۔ کیوں؟ یہی بات ہے ناں؟“ اس نے آدیش کی جانب بچوں جیسی خوشی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔“ آدیش کے لبوں سے سرگوشی سی نکلی۔

”یہی سیدھی سی بات تو میں سمجھا رہا ہوں تمہیں۔“ درویش نے مست آواز میں کہا۔ ”میرے اللہ نے کہا کہ شہید وہ ہے جو اس کی راہ میں جان دے اور یہ کہ شہید زندہ ہے۔ اسے رزق دیا جاتا ہے۔ عشق کے قاف کا نکتہ سمجھانے کے لئے یہ شہید کہاں سے چل کر یہاں آیا ہے؟ کیا کسی مردے کے ناخن اور بال بڑھتے ہیں؟ نہیں ناں۔ تو اور شہید کیسے بتائے کہ وہ زندہ ہے۔ کہو تو ابھی زبان سے اس کی وحدانیت کی گواہی دے دے۔ مگر سوچ لو کیا تم اسے برداشت کر سکو گے؟ کچھ اور ثبوت درکار ہے تمہیں؟“

”نہیں بابا نہیں۔“ آدیش نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب کسی گواہی' کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ روشن ہو گیا۔ سب کچھ عیاں ہو گیا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے کوئی ماورائی طاقت اس سے کہلوا رہی ہے۔ ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔“ اس کے لبوں سے نکلا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ گرتے گرتے اس کے ہاتھ تابوت کی دیوار پر آ ٹکے۔ اس نے ماتھا ہاتھوں کے درمیان تابوت کی دیوار پر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ اب بھی متحرک تھے۔

”سرمد۔۔۔“ اچانک ریحا کی بھیگی ہوئی سرگوشی نے ان سب کے حواس پر تھپکی دی۔ وہ تابوت میں لیٹے سرمد کے چہرے کو والہانہ دیکھے جا رہی تھی۔ ”میں جان گئی تم زندہ ہو سرمد۔ میں تمہارے سامنے تمہارے سچے معبود کا کلمہ پڑھتی ہوں۔ وہ جس کا فرمان اتنا سچا ہے وہ خود کیسا سچا ہو گا؟ گواہ رہنا سرمد۔ میں نے تمہارے سامنے اس کی سچائی کا دامن تھاما ہے۔“ ایک پل کو رک کر اس نے سسکی لی۔ پھر کہا۔ ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ۔“

”جب بھی اس کے حبیب کا نام لو ریحا۔ اس پر درود ضرور بھیجو۔ سرمد کا آخری ورد یہی تھا۔“ آدیش نے سر اٹھایا اور ریحا کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”کہو۔ محمد رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔“

”محمد رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔“ ریحا نے بے اختیار کہا اور سرمد کے پیروں کی طرف زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

’’واہ۔ ۔ ۔ واہ میرے رب۔ ‘‘ درویش جھوم اٹھا۔ ’’کس کے نصیب میں کیا ہے اور اسے کہاں جا کر ملے گا صرف تو جانتا ہے۔ صرف تو۔ ‘‘ پھر اس نے حافظ عبداللہ کی جانب دیکھا۔ ’’حافظ۔ جا۔ ان کو وضو کرا لا۔ رات بہت جا چکی ہے۔ اب شہید سے اجازت لے لیں۔ ‘‘

حافظ عبداللہ آدیش اور ریحا کو لے کر ہینڈ پمپ کی طرف چل دیا۔

’’کیوں بابا۔ ‘‘ درویش نے جھکی کمر کے ساتھ کھڑے ڈاکٹر ہاشمی کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ ’’کچھ قرار آیا۔ کچھ چین ملا۔ کچھ سکون ہوا؟ ‘‘

’’ہاں بابا۔ ‘‘ ڈاکٹر ہاشمی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ ’’اب کوئی دکھ نہیں۔ کوئی غم نہیں۔ اولاد کے چلے جانے کی پھانس تو آخری دم تک دل میں کسک بن کر چبھتی رہے گی مگر۔ ۔ ۔ ‘‘ انہوں نے سرمد کے پُرسکون چہرے کو یوں دیکھا جیسے اس کی شبیہ دل میں اتار لینا چاہتے ہوں۔ ’’اب بے قراری نہیں رہی۔ چین آ گیا ہے۔ سرمد نے مجھے ایک شہید کا باپ ہونے کا جو اعزاز دلایا ہے‘ اس کے بعد اب کوئی بے چینی‘ کوئی بے سکونی نہیں رہی۔ میرے اللہ۔ ‘‘ انہوں نے آسمان کی جانب دیکھا۔ ’’تیرا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ پھر بھی اپنے اس ناقص بندے کا شکر قبول فرما۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ۔ ‘‘ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی ان پر ٹکا دی اور سر جھکا لیا۔

درویش جو انہیں مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا‘ ایک دم چونک پڑا۔ اس نے ٹبے کی طرف سے آنے والے راستے پر نگاہ جمائی۔ پھر بڑبڑایا۔ ’’وقت ہو گیا بابا۔ ‘‘ پھر اس نے حافظ عبداللہ کے ساتھ وضو کر کے لوٹتے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ پاس آ گئے تو درویش نے اپنے کندھے سے رومال اتارا اور ریحا کے سر پر دوپٹے کی طرح ڈال دیا۔ اس کا چہرہ یوں چھپ گیا جیسے اس نے گھونگھٹ نکال لیا ہو۔

’’سب لوگ شہید کا آخری دیدار کر لو۔ رخصتی کا وقت ہو گیا ہے۔ ‘‘ درویش نے ذرا اضطراب سے کہا اور خود تابوت سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک دائرے کی شکل میں سرمد کے گرد آن کھڑے ہوئے۔ ان کا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ مگر کب تک۔ آخر کتنی ہی دیر بعد نہ چاہتے ہوئے بھی سسکیوں اور آہوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے جھک کر سرمد کے ماتھے پر بوسہ دیا اور طاہر انہیں پرے لے گیا۔ بیگم صاحبہ نے سرمد کے گال کو چھو کر اپنی انگلیاں چوم لیں۔ سکینہ نے اسے سر جھکا کر سلام کیا اور صفیہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی الٹے پاؤں لوٹ گئی۔

آدیش نے سرمد کو سیلوٹ کیا۔ جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور ایک طرف تن کر کھڑا ہو گیا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔

طاہر لوٹا۔ چند لمحے سرمد کے چہرے کو والہانہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ریحا کی جانب دیکھا جو سرمد کے پیروں کی جانب آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہاتھ باندھے یوں خاموش کھڑی تھی جیسے کوئی من ہی من میں اپنے دیوتا کی پوجا کر رہا ہو۔ طاہر نے سرمد کی اوپری جیب سے خون میں بھیگا ہوا رومال نکالا جس میں مدینہ شریف کی مٹی بندھی تھی اور درویش کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے اسے کھولا۔ ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا۔ مٹی سرمد کے خون سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے اسے بوسہ دیا اور حافظ عبداللہ کی طرف بڑھا دی۔

"اسے شہید کی قبر کی مٹی میں ملا دو حافظ۔"

حافظ عبداللہ نے چپ چاپ مٹی والا رومال لیا اور مزار کے صحن میں کھدی قبر کی طرف بڑھ گیا۔ مدینہ شریف کی مٹی۔ اللہ کے حبیب ﷺ کے دیار کی مٹی۔ ایک عاشق کی قبر کی مٹی میں ملا دی گئی۔ نصیب ایسے بھی تو اوج پر آتے ہیں۔

اس وقت اچانک درویش ریحا کے قریب آیا۔ سرمد کے دل کے زخم سے رستے لہو میں شہادت کی انگلی ڈبوئی اور وہ لہو ریحا کی مانگ میں بھر دیا۔

"سدا سہاگن رہو۔ سہاگ کا یہ جھومر سدا تمہارے ماتھے پر جگمگاتا رہے میری بچی۔" درویش نے کہا اور ایک دم ریحا کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے چہرے پر سرخی بکھر گئی۔ اشک برساتی آنکھوں میں مسکراہٹ کے دیپ جل اٹھے۔ اس نے آخری بار سرمد کے چہرے کو جی بھر کے دیکھا پھر آنکھیں موند کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اس کے چہرے کو ہمیشہ کے لئے اپنے قصر تصور میں سجا لینا چاہتی تھی۔

تب طاہر نے جھک کر سرمد کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لیا۔ اسے پیار کیا اور دل پر جبر کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ درویش آگے بڑھا اور تابوت کا تختہ گرا دیا۔ پھر اس نے طاہر کے ساتھ مل کر تابوت کو ایک طرف یوں رکھا کہ اس کے پیچھے صف باندھ کر کھڑا ہونے کی جگہ کشادہ ہو گئی۔

"آؤ بھئی۔ نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے مردوں کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر ہاشمی' آدلیش' طاہر اور حافظ عبداللہ اس کے پاس چلے آئے۔ عورتیں ان سے آٹھ دس فٹ دور برگد تلے خاموش کھڑی تھیں۔

"امامت آپ کرائیں بابا۔" حافظ عبداللہ نے درویش کی جانب دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔" درویش نے اندھیرے میں ایک طرف نظریں گاڑ دیں۔ "امام وہ آ رہا ہے۔" اس نے اشارہ کیا۔

ان چاروں نے حیران ہو کر اس طرف دیکھا۔ مزار کی پچھلی طرف سے آنے والے راستے پر کوئی چلا آ رہا تھا۔ سفید براق لباس میں اس کے سر پر سفید عمامہ اور اس پر سفید ہی رومال اس طرح پڑا تھا کہ اس کا چہرہ نظر آنا ممکن نہیں

تھا۔ درویش نے ڈاکٹر ہاشمی اور آدیش اپنے کو بائیں اور طاہر اور حافظ عبداللہ کو دائیں کھڑا کر لیا۔

بڑے نپے تلے قدم اٹھاتا وہ شخص آیا اور ''السلام علیکم ورحمت اللہ'' کہتا ہوا سید ھا سرمد کے تابوت کے سامنے امام کی جگہ جا کھڑا ہوا۔ چاروں عورتیں حیرت اور اچنبھے سے آنے والے کو دیکھ رہی تھیں۔ اور حیرت میں تو حافظ عبداللہ بھی گم تھا۔ اس نے یہ آواز پہلے بھی سنی تھی۔ مگر کہاں؟ اس کا دماغ الجھ گیا۔

اسی وقت امام نے تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔

''اللہ اکبر۔'' اس کے لبوں سے بڑی گھمبیر سی آواز نکلی۔

''اللہ اکبر۔'' مقتدیوں کے لبوں سے ادا ہوا۔ ۔ ۔ اور مقتدیوں میں حافظ عبداللہ بھی تو تھا' جس کا دماغ یاد داشت کے ورق الٹ رہا تھا۔

''السلام علیکم ورحمت اللہ۔'' امام نے باری باری دائیں بائیں سلام پھیرا۔ سب نے اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ امام نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور رومال میں چھپے چہرے کو اور بھی سینے پر جھکا لیا۔ پھر جب اس نے ''آمین'' کہتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرے تو ان سب نے بھی آمین کہہ کر دعا ختم کر دی۔ حافظ عبداللہ نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اس پراسرار ہستی کو جا لے مگر جب تک وہ اپنے جوتے پہنتا' آنے والا ''السلام علیکم ورحمت اللہ'' کہہ کر رخصت ہو گیا۔ ان سب نے چاہا کہ اس کا رستہ روکیں۔ اس سے آگے بڑھ کر ملیں۔ مگر ان کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ پھر جب تک وہ لوگ ہوش میں آتے' جانے والا مزار کی دیوار کے ساتھ مڑ کر اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔

اور اس وقت اچانک حافظ عبداللہ کو یاد آ گیا کہ اس نے یہ آواز کہاں سنی تھی؟ اس کے ہوش و حواس میں طوفان برپا ہو گیا۔ یہ وہی آواز تو تھی جو اس نے اس وقت سنی تھی جب وہ سکینہ کو سیلاب کے پانی سے نکال کر لایا تھا۔ درویش کے کمرے کے باہر رکا تو اندر سے امام کی اسی آواز میں مغرب کی نماز میں قرات کی جا رہی تھی۔ وہ اس آواز کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

''یہ۔ ۔ ۔ یہ کون تھے بابا؟'' حافظ عبداللہ نے درویش کو بے قراری سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی نظریں خالی رستے پر بار بار بھٹک رہی تھیں۔

''یہ۔ ۔ ۔'' درویش ہنسا۔ ''اولیاء اللہ زندہ ہوتے ہیں حافظ۔ وہ خود زندہ ہے تو اس کے دوست بھی تو زندہ ہی ہوں گے ناں۔ مُردوں سے تو اس کی دوستی ہونے سے رہی۔ زندہ کی نماز زندہ ہی پڑھائے گا ناں۔ مسافر ہوتا تو کسر پڑھتا۔ مقیم تھا۔ پوری پڑھا کر گیا۔''

حافظ عبداللہ کو تو پتہ نہیں اس بات کی سمجھ آئی یا نہیں' مگر طاہر کا اندر باہر روشن ہو گیا۔ اس نے بابا شاہ مقیم کے

مزار کی جانب دیکھا جو روشنیوں میں بقعۂ نور بنا اسے مسکرا مسکرا کر تک رہا تھا۔ پلٹ کر اس نے درویش کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر بڑی دلآویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر اس کی دلوں کو چھو لینے والی آواز ابھری۔

”چلو بھئی۔ کندھا دو۔ شہید کو اس کے مسکن تک چھوڑ آئیں۔“

طاہر جلدی سے آگے بڑھا۔ ان پانچوں نے تابوت کندھوں پر اٹھایا اور مزار کی طرف چل پڑے۔ جس کے صحن میں سرمد کا مسکن اس کا منتظر تھا۔ سرمد۔ ۔ ۔ جس پر عشق کا قاف نازل ہو گیا تھا۔ وہ سرمد جو عشق کے قاف کی گواہی دینے کے لئے بڑی دور سے آیا تھا، تھک گیا تھا۔ اب اسے آرام کرنا تھا۔

درویش سب سے آگے تھا۔ اس نے قدم اٹھایا اور بلند آواز میں صدا دی:

”کلمہ شہادت۔“

”اشھد ان لا الٰہ الا اللہ۔ وحدہٗ لا شریک لہٗ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔“ جواب میں ان کے ہونٹوں پر بے اختیار وردِ اکبر جاری ہو گیا۔

چہار جانب احدیت اور رسالت کے نور نے پر پھیلا دیے۔ ہر دل کی دھڑکن میں یہی الفاظ سانس لے رہے تھے۔

دور آسمانوں میں فرشتے عشق کے قاف کے کشتہ کے استقبال کے لئے نغمہ سرا تھے:

”قل ھو اللہ احد۔“

فرش سے عرش تک حور و غلماں زمزمہ پیرا تھے:

”صلی اللہ علیہ وسلم۔“

دور برگد تلے صفیہ کے کندھے سے لگی کھڑی ریحا کا دل پھڑکا۔ اس کا سرمد پانچ کندھوں پر سوار اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک شفاف لہر اٹھی اور آنکھوں میں پھیلتی چلی گئی۔ منظر دھندلا گیا۔ تب اس نے محسوس کیا، کوئی اس کے کانوں کے قریب سرگوشیاں کر رہا ہے۔ اس نے آنکھوں میں امڈتے ہوئے چمکدار بھیگے بھیگے غبار کو پلکیں جھپک کر رخساروں پر پھیلا دیا۔ کان لگا کر سنا۔ ۔ ۔ ارے۔ یہ تو اس کے سرمد کی آواز تھی۔ اس کے دل سے آ رہی تھی۔ دھیرے سے اسی مانوس مہک، ان چھوئی خوشبو نے اسے اپنے ہالے میں لے لیا، جو اس صدا کا خاصا تھی اور غیر اختیاری طور پر اس صدا کا ساتھ دینے کے لئے ریحا کے ہونٹ بھی متحرک ہو گئے:

”صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔“

☆☆☆